الرِّقُّ فی الاِسلام

یعنی

اِسلام میں غلامی کی حقیقت

حِصّۂ اوّل

جس میں غلامی کی حقیقت، اُس کے نفسیاتی، اخلاقی اور اقتصادی پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ غلامی کا آغاز کب سے ہوا، اِسلام سے پہلے کِن کِن قوموں میں یہ رواج پایا جاتا تھا، اور اُس کی صورتیں کیا تھیں۔ اِس کی مکمل تاریخ، پھر اسلام نے اس رواج کو اُس وقت کِن مجبور کُن حالات کی وجہ سے باقی رکھا، اور اُس میں کیا کیا اصلاحات کیں، اور ان سب سے اسلام کا اصل منشا کیا ہے۔ اس کے بعد مشہور مصنفینِ یورپ کے بیانات اور یورپ کی اجتماعی غلامی پر مفصل اور محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔

تالیف

سعید احمد ایم اے

باہتمام منیجر ندوۃ المصنفین قرول باغ نئی دہلی
جید برقی پریس دہلی میں طبع ہوئی

الرِّقُّ فِی الاِسلام

یعنی

اسلام میں غلامی کی حقیقت

حصۂ اوّل

تالیف

مولانا سعید احمد ام۔ اے
فاضل دیوبند

باہتمام منیجر ندوۃ المصنفین دہلی
جید برقی پریس دہلی میں طبع ہوئی

الرق فی الاسلام حصّہ اول

فہرستِ مضامین

ختم شد

تصحیح

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴	۳	غلامی تعلیم	غلامی کی تعلیم
۱۸	۵	ذریعہ اور معاشرتی	ذریعہ معاشرتی
۳۰	۳	سزا	سزا
۳۷	۶	اور نہ	وہ نہ
۳۷	۸	کسی طرف	کسی کی طرف
۴۲	۵	بلکہ وہاں	لیکن وہاں
۵۱	۶	حاصل نہ ہونے	حاصل ہونے
۵۹	۷	ہیں کسی	ہیں کہ کسی
۸۰	۹	بہ قول	بقول
۸۱	۲	شراب نو	شراب نوشی
۸۱	۱۳	ذیل	ذیل
۱۰۷	۶	پھر مسجد	یہ مسجد
۱۱۰	۸	کہ عہد	کے عہد
۱۱۷	۹	سے تھا	سے تھے
۱۲۰	۹	کیا۔ رہیں حضرت ماریہ	کیا۔ مگر بعد میں وہ خود راضی ہو گئیں اور آپ نے اُن سے نکاح کر لیا۔ رہیں حضرت ماریہ
۱۲۶	۴	کے بعد میں	کے بعد ہی
۱۲۸	۸	کہتے ہیں کہ ایک	کہتے ہیں "ایک
۱۳۰	۱۳	تواب	نوآب
۱۸۰	صفحہ کا ہندسہ	۱۹۰	۱۸۰
۱۸۴	۱۱	لیں	لوں
۱۸۶	۱	یومُ القیامۃِ احدًا	یومَ القیامۃِ احدًا
۱۸۷	۸	اِسی	اس
۱۸۷	۱۳	غلام ایک	غلام نے ایک
۱۹۱	۱۰	استفضاء	استقصاء
۱۹۳	۱۲	آزادی دی	آزادی تھی
۲۰۰	۲	قبائل	قبائلی
۲۲۴	۳	آقا کے قاضی	آقا کو قاضی کے سامنے
۲۲۶	۱۵	حدود سے باہر	حدود کے اندر
۲۴۲	۱۶	استبعاد	استعباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"ندوۃ المصنفین" کے مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ ہے کہ اسلامی عقائد و مسائل اور تعلیمات کے بعض گوشوں کے متعلق جو غلط فہمیاں یورپ اور یورپ کے تسلط و اثر سے ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں پھیلی ہوئی ہیں اُن کے ازالہ کے لیے کوئی مفید، سنجیدہ اور مؤثر قدم اُٹھایا جائے پیشِ نظر کتاب اس سلسلہ کی پہلی کوشش ہے۔

کتاب کو دو حصوں میں شائع کیا جا رہا ہے پہلے حصہ میں غلامی کی حقیقت اس کے اخلاقی، نفسیاتی اور اقتصادی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ دنیا میں غلامی کا رواج کب اور کس طرح ہوا اور دعوت اسلام کے ظہور سے پہلے کن کن قوموں میں یہ رواج پایا جاتا تھا۔ اس تشریح کے بعد مسئلہ کا جو اصل مرکز ہے اس پر توجہ کی گئی ہے یعنی یہ کہ اس باب میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے، اُس نے رواج غلامی کو مٹانے کے لیے کیسا پُرحکمت طریقِ عمل اختیار کیا اور اس رواج کی جو خفیف و ضعیف نوعیت اسلام میں باقی رہی ہے اس کی کیا وجہ ہے۔

ان حقائق کی وضاحت کے لیے ایک مخصوص اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک مطالبِ کتاب کی وسعت اور اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کا تعلق ہے، اس موضوع پر آج تک کوئی کتاب کسی زبان میں اس مرتبہ کی شائع نہیں ہوئی

دوسرا حصہ "غلامانِ اسلام" کے سوانح حیات، اُن کی تاریخی عظمت، اسلامی سوسائٹی میں اُن کے مقام کی رفعت اور اُن کے اخلاقی، مذہبی، علمی کارناموں پر مشتمل ہے، یہ حصہ بھی طبع ہو کر عنقریب شائع ہونے والا ہے، کتاب کے پایۂ اعتبار و تحقیق کے متعلق یہ کہہ دینا کافی ہے کہ مؤلف کتاب نہ صرف یہ کہ وقت کے جدید تقاضوں سے پوری طرح باخبر اور انشاء جدید کے مسلم الثبوت ادیب ہیں بلکہ آپ ہندوستان کی سب سے بڑی مذہبی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز ترین فاضل ہیں۔

کسی مذہبی اور علمی کتاب کے قبول و عدم قبول کا مدار قوم کے ذوق صحیح اور مذہبی احساس پر ہے اور اس جنس کی کمیابی معلوم!

دعا ہے حق تعالیٰ کارکنانِ ادارہ کی اس سعی کو مشکور فرمائے اور قوم میں اپنی علمی اور مذہبی ضرورتوں کا حقیقی احساس پیدا ہو جائے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

ناظم ندوۃ المصنفین دہلی

۱۴۔ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا

اسلام کا ظہور اوّل اوّل عرب کی خشک اور بے آب و گیاہ سرزمین میں ہوا، اور چند سال کی مدت میں ہی اُس نے ریگستانِ عرب سے نکل کر روم و ایران کی طاقتور سلطنتوں کو زیروزبر کرکے رکھ دیا۔ وہ ایک سیلابِ عظیم تھا جو عرب کی ایک "وادی غیر ذی زرع" سے اُبلا اور موجیں مارتا ہوا دنیا کے اکثر حصوں میں پھیل گیا۔ اُس کی موجیں ایک طرف افریقہ کے صحراؤں میں لہراتی ہوئی دیکھی گئیں، تو دوسری طرف لوگوں نے چین کے میدانوں میں اُس کی گنگناہٹ سُنی۔ ایک طرف مغرب کے شہروں میں اسلام کا پرچمِ عظمت لہرا رہا تھا، تو دوسری جانب مشرقِ اقصٰی کے علاقوں میں توحید کے نعرے گونج رہے تھے۔ یا یوں کہو اسلام ایک ابرِ کرم تھا جو عرب کے ایک گوشۂ گمنام سے اُٹھا اور مشرق کے دور دراز علاقوں پر فیض و عطا کی بارش برساتا، تہذیب و تمدن کے جواہر لٹاتا اور علم و حکمت کے پھول کھلاتا چلا گیا۔ قوموں کی قدیم تہذیبیں چند سال میں بدل گئیں۔ دنیا کی تاریخ کچھ سے کچھ ہوگئی۔ جس نے ایک مرتبہ بھی خمستانِ حجاز کی اس بادۂ تند و تیز کا ایک جُرعہ لے لیا، سرشاری و مستی کے

کیفِ جاں نوازمیں اپنا سر "ساقیِ حجاز" کے قدموں پر رکھ دیا۔ اور پھر وہیں "خاکِ درِ میخانہ" ہو کر رہ گیا۔ پھر کہاں کی سلطنت، کیسا اپنا پُرانا تہذیب و تمدن، کہاں کا عیش و آرامِ دنیوی، جو کچھ تھا اور جتنا کچھ تھا، سب کا سب اُسی شرابِ ناب کے جرعہائے کیف بار کے نذر کر دیا۔

اسلام کا اس انوکھی شان کے ساتھ عروج وارتقاء بے شبہ دنیا کی تاریخ کا عجیب و غریب واقعہ اور بے حد حیرت انگیز نظارہ تھا۔ یورپ جس کا ذوقِ تحقیق بال کی کھال نکالنے کا خوگر اور تاریخ ماضی کے علل واسباب معلوم کرنے کا عادی ہے کس طرح ممکن تھا کہ اسلام کی عظیم الشان تاریخ و روایات کی طرف متوجہ نہ ہوتا اور اپنے مطالعہ و تحقیق کا ایک قیمتی حصہ اس شوق و ذوق میں صرف نہ کرتا۔ چنانچہ یورپ کی مختلف زبانوں میں اسلام، پیغمبر اسلام، اور اسلامی علوم و فنون سے متعلق اس کثرت سے تصنیفات موجود ہیں کہ اُن کو دیکھ کر یورپ کے ذوقِ مطالعہ کی بیاختہ داد دینی پڑتی ہے لیکن سخت افسوس ہے کہ اسلام کی بعض روایات و تعلیمات کے متعلق ان مصنفین نے چند ایسے غلط نظریے قائم کر لیے ہیں جن سے باستثناء چند کسی مصنف کی کتاب خالی نظر نہیں آتی۔

اُن میں شاید سب سے زیادہ اہم "غلامی" کا مسئلہ ہے۔ ایسے عیسائی مصنفین بہت کم ہیں جنہوں نے اسلام کو رواجِ غلامی کے باقی رکھنے پر مطعون نہ کیا ہو، اور پھر اس پر قہر یہ ہے کہ بعض مغربی ممالک میں جو بردہ فروشی کی کثرت ہوگئی تھی اور افریقہ کے لوگوں کو زبردستی پکڑ پکڑ کے غلام بنا لیا جاتا تھا اُس کا ذمہ دار بھی اسلام کو ہی قرار دیا جاتا ہے" جے جے پول" لکھتا ہے :۔

"اسلامی ممالک میں غلام اتنے نہیں ہیں جتنی کہ باندیاں ہیں۔ مسلمانوں کے شہروں میں جو غلامی کا بڑا رواج پایا جاتا ہے تو اُس کا سبب یہ ہے کہ قرآن نے اُن کو اجازت دی ہے کہ وہ جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کو اپنی باندیاں بنا کر رکھیں اور اُن سے ہمبستری کریں ..... ایک منکوحہ عورت کے ساتھ کتنی ہی باندیوں کا اضافہ کرنے کی اجازت نے مسلمانوں کے لیے سیلاب بد کے صرف دروازے ہی نہیں کھولے بلکہ غلاموں کی گردنوں میں لوہے کی ایسی زنجیریں ڈال دی ہیں جنہوں نے غلامی کے رواج کو اسلامی ممالک میں ایک پسندیدہ طریقہ بنا دیا ہے"[1]

موئر (Muir) اپنی کتاب Lif of Mohammad میں لکھتا ہے:۔

"جہاں تک کہ مسلمان آقاؤں کی سطوت کے ماتحت باندیوں کے ہونے کا سوال ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی تحقیر و تذلیل کا کوئی تصور اس سے زیادہ بھیانک نہیں ہو سکتا۔ باندیوں سے انسانی جماعت کی ایک محقر مخلوق کا سا معاملہ کیا جاتا تھا جب یہ شادی کے قابل ہوتی تھیں تو ان کو شادی کے حقوق سے کُلیتہً محروم کر دیا جاتا تھا، اور غلام پورے طور پر آقاؤں کے قبضہ میں ہوتے تھے"

یہی مصنف ایک دوسری جگہ تحریر کرتا ہے۔

"عورتوں کی غلامی تسری" (باندیوں کے ساتھ ہمبستری کرنا) کے جواز کے لیے ایک ضروری شرط ہے۔ اس لیے مسلمان کبھی دلی جوش اور اتحاد کے ساتھ اس کے مٹانے

---

[1] Studies in Mohammadanism

کی کوشش نہ کرینگے" (لائف آف محمد نیو اڈیشن صفحہ ۲۴۷)

ایک اور دریدہ دہن عیسائی ٹی پی ہیوز کہتا ہے :-

"غلامی تعلیم اسلام کے عین مطابق ہے۔ لیکن مذہب عیسوی کو غلامی سے نفرت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عرب جاہلیت کی غلامی میں کچھ اصلاح کی، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ شارع عرب کا منشا غلامی کو ہمیشہ قائم رکھنے کا تھا"

Notes on Mohammadanism Second edition p. 195.

عیسائی مصنفین بیباکانہ کہتے ہیں کہ غلامی کے رواج کے باعث مسلمانوں کو ملک ملک کی حسین وجمیل اور دوشیزہ لڑکیوں کے ساتھ لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملتا تھا اس لیے انہوں نے غلامی کے رواج کو باقی رکھا، اور نہ صرف یہی کہ باقی رکھا بلکہ اُس کی بڑی شدومد کے ساتھ حمایت کی اور ترقی دی۔

پول غلامی کی حمایت کے اسباب پر زور بیان صرف کرنے کے بعد لکھتا ہے:-

"اب ہم یہ تصور کرسکتے ہیں کہ جن اسباب نے مسلمانوں کو غلامی کے رواج کو باقی رکھنے پر مجبور کیا وہ کس قدر قوی ہیں۔ اس کو ختم کرنے کے معنیٰ ایک بڑی حد تک یہ تھے کہ مسلمانوں میں "حرم" کا جو رواج جڑ پکڑ گیا تھا اُس کا خاتمہ کر دیا جائے[1]۔

یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے :-

"مدتہائے مدید تک مسلمان جنگوں کے ذریعہ غلام حاصل کرتے رہے۔ ہر ایک قیدی

---

[1] اسٹڈیز ان محمڈنزم۔

غلام بنالیا جاتا تھا۔ فاتح کو اختیار تھا کہ قیدیوں کو زرِ فدیہ کے بدلے میں یا اس کے بغیر ہی آزاد کردے۔ لیکن دستور کے مطابق جو عورتیں گرفتار ہوتی تھیں اُن کا زرفدیہ قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ آرائش و اضافۂ حرم کے لیے اُن کو روک لیا جاتا تھا۔"

غلامی کی نسبت یہ اور اسی طرح کے بیشمار افسانے ہیں جن کو عیسائی مصنفین اپنی تصنیفات میں بڑی رنگیں بیانی سے لکھتے اور اس طرح اسلام کے خلاف غیظ و غضب کی آگ مشتعل کرتے ہیں۔ ایک طرف تو اسلام کے دشمنوں کی حالت یہ ہے کہ وہ کسی جگہ کوئی رائی دیکھتے ہیں تو اُس کو پہاڑ بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف ہمیں بھی ایمانداری سے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ بعض شہوت پرستوں نے غلامی کے مسئلہ سے بالکل ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جن حالاتِ گرد و پیش کو ملحوظ رکھتے ہوئے استرقاق کے جواز کا حکم دیا تھا بعد کے بعض مسلمانوں نے عملی اعتبار سے قطعاً اُس کی اس رُوح کو فراموش کردیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تدریجی طور پر اس رسم بد کو ختم کرنا چاہتے تھے لیکن غرضمندوں نے الفاظِ اباحت سے فائدہ اُٹھا کر اس کو اس قدر قوی کردیا کہ آج عیسائی بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ غلامی کے خلاف عملی جد و جہد کرنے والے ہم ہیں۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ یہ صرف عیسائی مبلغین تھے جنہوں نے بڑے زور شور سے اس کے خلاف وعظ کیے اور اُس کی بُرائیاں واضح کیں، اور قانونی طور پر اس کا انسداد کرایا۔ صد حیف کہ جو فخر مسلمانوں کے لیے مخصوص ہونا چاہیے تھا غیر اُس پر دعویٰ کر بیٹھے اور اُس کو اپنے لیے خاص سمجھنے لگے۔ یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ مسلمانوں نے عملاً غلامی کے مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

منشائے گرامی کو بالکل نظر انداز کر دیا، اور غلاموں کے متعلق جو ارشاداتِ نبوی ہیں اُن کی روح کو یکسر بھلا دیا۔

ان وجوہ کی بنا پر سخت ضرورت تھی کہ ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں اسلامی نقطۂ نظر سے مسئلۂ غلامی پر تفصیلی بحث ہو۔ اور اُس میں یہ بتایا گیا ہو کہ غلامی کا رواج کب سے ہے؟ کن کن قوموں میں اور کس کس طرح باقی رہا؟ اور پھر اسلام نے اس کو باقی رکھا تو کیوں؟ اور کن مصالح کی بنا پر؟ اور نیز یہ کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اصل منشاء کیا تھا۔ کتاب زیرِ نظر اسی ضرورت کو پورا کرنے کی طرف ایک قدم ہے۔ وعلی اللہِ التکلان وھو نعم المعین ونعم الوکیل۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

غلامی کی تعریف

غلامی کی تعریف مذہب و اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا میں یہ کی گئی ہے: "وہ ایک معاشرتی رواج ہے جس کے باعث ایک شخص دوسرے کی ملکیت میں داخل ہو جاتا ہے"۔ ویسٹر مارک Westermark غلامی کی تعریف میں کہتا ہے:- "مالک کا حق غلام کی ملکیت پر اگرچہ ضروری اور قطعی نہیں ہے لیکن ایک مخصوص قسم کا ہے۔ یعنی وہ ایک ایسا حق ہے کہ آقا ہی اُس سے دستبردار ہو سکتا ہے۔ لیکن اُس کو ملک محض نہیں کہا جا سکتا کیونکہ قانون اور عرف نے غلام کو بھی یک گونہ کوئی حق دیا ہے۔

غلامی کی اقسام

اصولی طور پر غلامی کی دو قسمیں ہیں یعنی ایک یہ کہ ایک قبیلہ کے بعض آدمی اپنے بعض ہم قبیلہ آدمیوں کو اپنا غلام بنالیں اور دوسری قسم یہ ہے کہ ایک قبیلہ کے بعض افراد کسی دوسرے قبیلہ کے بعض افراد کو یا سب کو اپنی غلامی میں لے لیں پہلی قسم کو انگریزی میں Intra tribal slavery اور دوسری قسم کو Extra-tribal slavery کہتے ہیں۔

بالکل ابتدائی زمانہ میں قبائل میں مساواتِ انسانی کا احساس تھا اور ایک قبیلہ کے بعض افراد اپنے ہم قبیلہ لوگوں کو اُسی عزت و احترام سے دیکھتے تھے جس سے کہ وہ خود اپنے آپ کو دیکھتے تھے اس لیے اغلب یہی ہے کہ غلامی کی قسم اول کا وجود شروع زمانہ میں نہیں ہوگا اب رہی دوسری قسم تو اُس کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی غلامی کا وجود جنگ کے لوازم میں سے ہے۔ جب ایک قوم دوسری قوم سے یا ایک قبیلہ اپنے حریفِ مقابل کسی دوسرے قبیلہ سے برسرِ پیکار ہوتا ہے تو ہر ایک فریق کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے مخالف کے ساتھ ہر وہ معاملہ کر گزرے جو اُس کے بس میں ہو اور جس سے دشمن کو زیادہ سے زیادہ مضرت پہنچ سکتی ہو۔ یہی انسان جو بحالتِ امن و امان آپ کو فرشتہ محاسن اور پیکر صلح و صفا نظر آتا ہے اس کو جنگ میں دیکھیے تو پہلے سے بالکل مختلف نظر آئیگا۔ پہلے یہ غیروں کا محافظ، بیگانوں کا نگہبان تھا۔ نرم دل اتنا کہ کسی یتیم بچہ کی چیخ و پکار سُنتا تو کلیجہ شق ہو جاتا۔ کسی کے پاؤں سے خون نکلتا دیکھتا تو بیچین ہو جاتا اور دوڑ کر اس کی مرہم پٹی کرتا لیکن وہی نرم خو، اور رقیق القلب انسان جنگ کے وقت بالکل بدلا ہوا ہے۔ اب اُس کی تلوار سے جتنے زیادہ سر قلم ہوتے ہیں اُسی قدر زیادہ خوش ہوتا ہے۔ بیوہ عورتوں کے نالے۔ اور یتیم بچوں کی آہیں اور کمزور و ناتواں انسانوں کی چیخ و پکار اُس کے دل کو نہیں پسیج سکتی پہلے وہ فرشتۂ کرم تھا مگر اب ایک خون آشام درندہ ہے، جو ہر ممکن تدبیر سے اپنے دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ دشمن کے گھر سامنے آجائیں تو اُنہیں آگ لگا دے، مال ملجائے تو لوٹ لے۔ مرد اور بچے ہاتھ آجائیں تو غلام بنالے اور عورتیں اُس کے قبضہ میں گرفتار ہو جائیں

تو اُن کو اپنی باندیاں بنا کے رکھے۔

بہرحال غلامی کی دوسری قسم یعنی Extra-tribal slavery جنگ کے نتائج میں سے ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ جب سے دنیا میں جنگ کا وجود ہے غلامی بھی قائم و موجود ہے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے پہلے زمانہ کے لوگوں کا خیال یہ تھا کہ فریق فاتح کا غالب آنا اُس کے برحق ہونے کی اور فریقِ مفتوح کا مغلوب ہونا اُس کے سچے نہ ہونے کی دلیل ہے۔ اور اس بنا پر فاتح کو اختیار ہے کہ وہ جس طرح چاہے مفتوح کو اپنے آرام و آسائش کے لیے استعمال کرے[1]۔ اُس کی خواہش ہو تو مغلوب کو قتل کر دے، اور اگر چاہے تو اُس کو قیدی بنا کر رکھے۔ اب اس حالت میں وہ اُن قیدیوں کو مار سکتا ہے۔ کھا سکتا ہے، غلام بنا سکتا ہے، کسی چیز کے تبادلے میں دیا اور لیا جا سکتا ہے۔ اور اُس کو آزاد بھی کر سکتے ہیں[2]۔

غلامی کے رواج کے اسباب

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس رواجِ غلامی کے اسباب کیا تھے؟ جواب یہ ہے کہ اس کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ مسٹر ایل۔ این۔ گلبرٹسن نے لکھا ہے کہ شمالی امریکہ کے ہندوستانیوں میں ایک رواج قائم تھا جس کو (Adoption) کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ اس رواج کی رو سے فریقِ مغلوب کے مرد قتل کیے جا سکتے تھے۔ اور بچوں اور عورتوں کو زندہ رکھ کر اپنے گھر میں رکھ لیتے تھے۔ اس نامور مصنف کی رائے ہے کہ غلامی اسی رواج کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جس میں عورتوں اور بچوں کی طرح مردوں کو

---

(1) Morals in evolution by Hobhouse. P 244 — ۱ھ

(2) Encyclopaedia of religion and ethics. — ۲ھ

بھی زندہ رہنے دیا جاتا ہے۔ اور اُن کو غلام بنا کر رکھتے ہیں۔ نیبور (Nieboer) نے ایک بڑی دلچسپ بات لکھی ہے وہ کہتا ہے کہ "انسان کو جانور پالنے کی عادت ہوتی ہے۔ اسی عادت نے بڑھتے بڑھتے انسانوں کو پالنے کی عادت کی شکل اختیار کرلی اور اس کو غلامی کہا جانے لگا۔"

ہمارے خیال میں اصل یہ ہے کہ شروع شروع میں جبکہ تہذیب و تمدن کا پتہ نہ تھا۔ اور عام انسانی طبائع پر بہیمیت و بہجیت غالب تھی فریق فاتح اپنے گرفتار شدہ قیدیوں کو فرطِ غیظ و غضب میں قتل ہی کر دیتا ہوگا۔ لیکن پھر جب لوگوں کی اقتصادی اور معاشرتی ضرورتیں وسیع ہوئیں، اور اُن کو "بے معاوضہ مزدور" کی ضرورت پیش آئی تو اُس وقت اُنھوں نے اس امر پر غور کیا ہوگا کہ جنگ کے قیدیوں کو قتل کرنے کے بجائے اگر زندہ رکھا جائے تو اُن سے بہتیرے معاشرتی اور اقتصادی فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ایک انسان اپنے مخصوص دل و دماغ اور طبعی و عملی استعداد و صلاحیت کے باعث جماعت کو جو نفع پہنچا سکتا ہے قتل ہوجانے کے بعد اُس سے اس طرح کے فوائد و منافع کی اُمیدیں یک لخت منقطع ہوجاتی ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ فاتح قوم میں اگر کوئی ایسی اخلاقی اور تمدنی خوبی موجود ہے جو لوگوں کے لیے جذبِ التفات و جلبِ محبت کا سبب ہوسکتی ہے تو قوی اُمید ہے کہ مفتوح قوم کا ایک فرد یا چند افراد جب بحیثیت غلام کے فاتح جماعت کے افراد کے ساتھ معاشرت کرینگے تو فاتح کی اخلاقی اور تمدنی خوبیاں ان کو بھی اپنا حقیقی ہمدرد و بہی خواہ بنالینگی۔ پھر ان زندہ قیدیوں سے اندرونِ خانہ و بیرونِ خانہ دونوں قسم کے کام

لہ (1) Encyclopaedia of religion and ethics article on slavery.

لیے جا سکتے ہیں اور اس طرح "محنت" میں کمی اور آرام میں زیادتی پیدا ہو سکتی ہے۔ ان خیالات کی بناء پر لوگوں نے غلامی کا رواج قائم اور اسیرانِ جنگ کو قتل کرنے کا طریقہ مسدود کیا ہوگا۔ کیونکہ اس سے بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ فاتح قوم کے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے جو اس کے لیے یک گونہ تقویت کا باعث ہے۔

غلامی کی نفسیاتی حیثیت

نفسیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو بعض اوقات غلامی ناگزیر یا متعدد فوائد کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جنگ میں فرض کیجیے ایک فریق کے مرد کثرت سے قتل کر دیے گئے ہیں۔ اب جو عورتیں اور بچے اُن کے پسماندگان ہیں اور جو جنگ کے موقعہ پر گرفتار کر لیے گئے ہیں اُن کے لیے دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اُن کو آزاد کر دیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اُن کو لونڈی غلام بنا کر رکھا جائے۔ پہلی صورت میں اشکال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جبکہ ان کے سرپرست مرد زندہ نہیں ہیں تو اس آزادی کے عالم میں قوی اندیشہ ہے کہ یہ کہیں اخلاقی فواحش اور بدکاریوں میں مبتلا نہ ہو جائیں (جیسا کہ سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد انگلینڈ اور جرمنی کی عورتوں کا حال ہوا) اس بناء پر ان کے لیے آسان اور زیادہ سہل صورت یہ ہے کہ یہ کسی گھر میں باندی یا غلام ہو کر رہیں۔ ان کے اخراجات کی ذمہ داری ان کے آقاؤں پر ہوگی اور یہ بطور خدمتگذار اُن کے گھروں میں رہینگے۔ اِن کے طور و طریقہ میں تبدیلی ہوگی۔ اخلاق کی تہذیب و تربیت ہوگی اور پھر یہ اس گھر کے لیے اور یہ گھر ان کے لیے مفید و سود مند ثابت ہوگا۔

عورتوں اور بچوں پر ہی مردوں کو قیاس کر لیجیے۔ جو مرد جنگ میں گرفتار ہوتے ہیں

عقلاً اُن کے ساتھ حسب ذیل معاملہ کیا جا سکتا ہے :-

(۱) اُن کو قتل کر دیا جائے (۲) بے معاوضہ آزاد کر دیا جائے۔ (۳) کسی معاوضہ کے بدلہ میں آزاد کر دیا جائے (۴) اُن کو کسی جگہ State prisoner شاہی قیدی کر کے رکھا جائے (۵) اُن کو غلام بنالیا جائے۔

اب غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ قیدیوں کے مختلف حالات اور سیاسی مقتضیات کی بنا پر تمام اسیرانِ جنگ کے ساتھ یکساں معاملہ نہیں ہو سکتا ایک قیدی اگر آپ کا شدید دشمن ہے۔ اور اُس کے زندہ رہنے سے ملک کے امن و امان کو عظیم خطرہ پہنچنے کا اندیشہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اُس کو قتل نہ کیا جائے۔ اس کے برخلاف بعض قیدی ایسے ہیں جن کی آزادی سے ملک کے امن کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تو موقعہ ہو تو بلا معاوضہ ورنہ کوئی عوض لے کر ان کو آزاد کیا جا سکتا ہے۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک قیدی اپنی فطری استعداد و صلاحیت کی وجہ سے تو قابلِ تحسین و لائق ستائش ہے لیکن ایک فساد انگیز ماحول میں رہنے کے باعث ہمارا دشمن بنا ہوا ہے تو اب اس شخص کے لیے ضروری ہے کہ اُس کو اس ماحول سے نکال لیا جائے، اور ایک صالح "آب و ہوا" اور درست فضا میں اُس کی تربیت کی جائے۔ اس شخص کو نہ تو قتل کیا جا سکتا ہے اور نہ یونہی آزاد چھوڑا جا سکتا ہے۔ اِس کے لیے بہتر یہی ہے کہ اس کو غلام بنا کر رکھا جائے۔ رہی ایک صورت "شاہی قیدی" ہونے کی۔ تو ظاہر ہے کہ قیدی کو اس صورت میں اخلاقی تربیت اور تہذیب و اکتساب ادب کا ایسا عمدہ اور اچھا موقعہ نہیں مل سکتا جتنا کہ اُس صورت

میں مل سکتا ہے جبکہ وہ غلام کی حیثیت سے کسی گھر کا ایک فرد ہو کر کے رہے۔

بہرحال یہ وجوہ و اسباب ہیں جن کے باعث غلامی کے رواج کا ظہور ہوا۔ اور نہ صرف کسی ایک ملک و قوم میں بلکہ قریب قریب دنیا کی تمام قوموں میں شائع ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ "غلامی" کو خواہ کتنا ہی بُرا کہا جائے، اور اُس کو مذموم و قبیح قرار دیا جائے لیکن وہ نتیجۂ جنگ ہے۔ اور جس طرح آپ مخصوص حالات میں جنگ ایسی ہولناک مصائب بار اور تباہ کن چیز کو برداشت کر لیتے ہیں۔ اور نہ صرف برداشت بلکہ اُس کو بعض اوقات صنعت و حرفت کی ترقی اور ملکی عروج و ارتقا، کا باعث قرار دیتے ہیں۔ مخصوص حالات میں اگر آپ اسی طرح غلامی کے جرعۂ تلخ کو بھی دوا کا ایک گھونٹ سمجھ کر پی جائیں تو کیا مضائقہ ہے؟

غلامی کا اجتماعی و تمدنی پہلو

یہی وجہ ہے کہ اخلاقیات و اجتماعیات کے بعض علماءِ متبحرین نے غلامی کے رواج کو بعض خاص ملکی حالات کے پیشِ نظر مفید اور نافع اور تمدن کی ترقی کا باعث کہا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے۔

"یہ تسلیم کر لینا بالکل ممکن ہے کہ جب ایک فریق نے تسلط و اقتدار کے باوجود اپنے دشمنوں کو ہضم کرنے کے بجائے اپنا غلام بنا لیا ہے، تو اُن کو زندہ چھوڑ دینا ہی ترقی کی طرف ایک قدم ہے۔ غلامی خواہ کتنی ہی بُری ہو تاہم وہ اضافی طور پر اچھی ہے اور بعض حالات میں ہنگامی طور پر وہی سب سے زیادہ قابلِ عمل ثابت ہوتی ہے۔"[۱]

لارڈ ایکٹن نے کہا ہے:۔

---

[۱] اسٹڈی آف سوشیالوجی ص۲۵۳

"بعض اوقات حالات ہی ایسے رونما ہوتے ہیں کہ اُن کے پیشِ نظر یہ کہنا نامناسب نہیں ہوتا کہ غلامی بذاتِ خود آزادی کی منزل کا ایک مرحلہ ہے[1]۔

مسٹر آر۔ ایچ بارو نے "رومن امپائر میں غلامی" کے نام سے ایک نہایت محققانہ اور قابلِ قدر کتاب لکھی ہے، اُس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"غلامی ایک ایسا لفظ ہے جو سنتے ہی کانوں کو بُرا لگتا ہے اس لفظ کے کان میں پڑتے ہی گراں بار زنجیروں کی جھنکار کوڑوں کی چٹاخ پٹاخ اور مظلوم غلاموں کی چیخ پکار کا تصور قائم ہو جاتا ہے .... غلامی کو عموماً اُس کے بُرے پہلوؤں کے ساتھ دیکھا جاتا ہے لیکن اگر تحقیق کی جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ غلام خواہ کچھ زیادہ مقدس اور پارسا نہ ہوتا ہم اُس کو بھی تہذیب کی ترقی میں کسی حد تک ضرور دخل ہوتا ہے، ہم غلامی کے رواج کا خاتمہ کر سکتے ہیں لیکن ہم کو نہ چاہیے کہ عہد گزشتہ کے رواج غلامی کو قطعی طور پر بُرا کہیں اور اُس کو بالکل ہی مذموم قرار دیں"

ہوب ہاوس (Hobhouse) اپنی کتاب ارتقاء اخلاق (Morals in evolution) میں لکھتے ہیں:۔

"معاشرتی ترقی میں کبھی ایسا دور بھی آتا ہے جبکہ فتحیاب یہ خیال کرتا ہے کہ زندہ گرفتار قیدی مردہ کی نسبت زیادہ مفید و کارآمد ہے[2]"

ایک اور انگریز مصنف نے لکھا ہے:۔

[1] مقدمہ سلیوری ان دی رومن امپائر ص۱۵ [2] بحوالہ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس مضمون غلامی۔

"بہرحال جماعت کے خارجی تعلقات اور رشتے خواہ کچھ ہی ہوں، غلامی ہرگز وجود میں نہ آتی اگر اخلاقی اور اقتصادی نقطہائے نظر کے ماتحت کسی قبیلہ کی معاشرتی ضروریات اس رواج کے ساتھ وابستہ نہ ہوتیں"[1]

غلامی کا اخلاقی اور اقتصادی پہلو

اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ غلامی کے رواج کا بُرا یا اچھا ہونا موقوف ہے غلام بنانے والوں کے اخلاق کے اچھا یا بُرے ہونے پر اگر وہ لوگ اخلاقی اعتبار سے بلند و برتر ہیں تو غلام ان کے پاس خوش رہینگے، اور ان کے فیض صحبت سے ان کے اخلاق بھی اچھے ہو جائینگے۔ اُنیسویں صدی کی فرانسیسی دائرۃ المعارف میں مذکور ہے۔

"لڑائیوں نے نوع بشری کو بہت بڑا فائدہ پہنچایا ہے، یہاں تک کہ لڑائی کا ایک بدترین نتیجہ یعنی گرفتار شدہ قیدیوں کو غلام بنا لینا بھی ایک فائدۂ عظیم سے خالی نہیں ہے۔ —— نوع بشری کبھی ایسے طریقوں کے ماتحت ترقی پذیر ہوتی ہے کہ اُس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا —— غلام بنانے سے ایک بڑا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ عورت اُن مصائب سے بچ جاتی ہے جو اُس کو اُس وقت پیش آتی ہیں جبکہ خاوند کے گھر پر کوئی غلام نہیں ہوتا۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہر انسان فطرۃً جب کسی دوسری قوم کے افراد کے سامنے ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ اس اجنبی کے سامنے اُس کے قول و عمل سے کسی عزیز و قریب سے متعلق کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس کے باعث

[1] انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس بمضمون غلامی

خود اور اُس کا تمام کنبہ وقبیلہ ذلیل وخوار ہو جائے۔ اس بنا پر بڑا فائدہ یہ ہے کہ غلام کی وجہ سے شوہر اپنی بیوی کا، بیوی اپنے شوہر کا اور دوسرے رشتہ داروں کا ادب احترام کرنا سیکھ جاتی ہے"۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غلامی کا رواج ہنگامی طور پر ہی ضروری یا مفید ہو سکتا ہے۔ تہذیب وتمدن، اور صنعت وحرفت کی غیر معمولی ترقی کے زمانہ میں اس کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ فائدہ۔ چنانچہ یہی مضمون نگار اس مقالہ کے اخیر میں کہتا ہے[1]:-

"لیکن اب غلام بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ طرح طرح کی مشینیں ایجاد ہو گئی ہیں جن کے باعث لوگوں کو کاروبار میں غلاموں سے مدد لینے کی ضرورت نہیں ہے"

ہربرٹ اسپینسر نے اپنی کتاب "اصولِ معاشیات" (The principles of sociology) میں ایک مقام پر بڑی صفائی کے ساتھ لکھا ہے کہ

"غلامی کے بغیر سیاست کا مرحلہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا"

سمنر (Sumner) کا خیال ہے کہ غلامی جہاں کہیں بھی رہی ہے اُس نے سوسائٹی کے تمام گوشوں کو متاثر کیا ہے۔ اس کو قبیلوں اور جماعتوں میں اختیار کیا جاتا ہے، تو اس سے اُن تمام شعبوں میں ایک طرح کا رنگ وروغن پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اسی نامور مصنف نے ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ غلامی ایک بڑی معلمہ ہے جو پھرتی کے ساتھ کام کرنا سکھاتی ہے۔

[1] دائرۃ المعارف فرید وجدی جلد ۷ صفحہ ۳۸۲

اور وہ ایک ایسی جماعت ہے جس کے باعث لوگوں کو صنعتی نظام کے چلانے میں مدد ملتی ہے۔ ایک اور انگریز مصنف کا مقولہ ہے:-

" فرصت ابتدائی جماعتوں کی اولین ضرورت ہے اور اس کی تکمیل صرف غلاموں کے ذریعہ ہی ہوسکتی ہے"۔

ڈیلے اور وارڈ Dcaley and ward ان دونوں کا خیال یہ تھا کہ اصل مشکل یہ ہے کہ لوگوں سے کس طرح کام کرائیں، اور سوائے غلامی کے کوئی دوسری چیز اس مقصد کے لیے مفید نہیں ہوسکتی تھی۔

یونان کے فلاسفہ کا عام خیال یہ تھا کہ انسانی طبقات کو راعی اور رعایا، حاکم اور محکوم، آقا اور غلام کی طرف منقسم ہونا فطرۃً ضروری ہے۔ دنیا کا نظام اجتماعی اُس وقت تک باقی اور قائم و برقرار نہیں رہ سکتا جب تک کہ بعض لوگ حکومت کرنیوالے قانون بنانے والے، اور اُس کو نافذ کرنے کی طاقت و قوت رکھنے والے نہ ہوں، اور اُن کے بالمقابل اکثر وہ نہ ہوں جو رعایا کہلائیں[1]، اور جن پر حکومت کی جائے۔ ایک ملک کا مختارِ کل اور حاکم اعلیٰ کہلاتا ہے اور تمام اہلِ ملک اُس کی رعیت کہلاتے ہیں۔ پس جس طرح انسانوں کی ایک بڑی جماعت ایک شخص واحد کی یا چند آدمیوں کی محکوم ہوسکتی ہے انفرادی طور پر ایک فرد واحد ایک شخص واحد کا بھی محکوم ہوسکتا ہے۔ یہی محکومیت اگر ملکیت کا رنگ اختیار کرلے تو غلامی کہلاتی ہے۔ یونانی فلاسفۂ قدیم کی رائے تھی کہ تمدنی اعتبار سے غلاموں کا وجود ناگزیر ہے۔ تاکہ اہلِ دماغ جسمانی محنت سے

[1] سیاسیات کتاب اول باب ۴-۶ ارسطو

محفوظ رہ کر اعلیٰ سے اعلیٰ دماغی کام کر سکیں اور فکر و نظر کی یکسوئی میں جسمانی سخت کام مخل نہ ہوں۔

مسٹر البرٹ۔ این گلبرٹسن نے ذیل کی عبارت میں درحقیقت انہی فلاسفہ کی ترجمانی کی ہے۔

"غلامی نے انسان کی اقتصادی کوششوں اور اُس کے ذریعہ اور معاشرتی شعبوں پر جو عمیق اثر کیا ہے وہ محنت کا منقسم ہو جانا ہے۔ انسانی جماعت کی یہ تقسیم کہ بعض حاکم ہوں اور بعض محکوم۔ بالکل ابتدائی اور طبعی تقسیم و تفریق ہے۔ غلامی ایسے افراد کو پیدا کرتی ہے جو کام کرنے ہی کے لیے ——— سوچنے کے لیے نہیں۔ پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ لوگ سوچنے کے مکلف نہیں ہوتے کیونکہ فکر و نظر کے لیے دوسرے افراد ہوتے ہیں"۔

یہی مقالہ نگار آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"انسانی سوسائٹی کے انتہائی سادہ طبقوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ غلامی کا ظہور اور اُس کا نشو و نما معاشرتی حالات پر موقوف ہے یہ حالات ہمارے زمانہ کے ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کے معاشرتی احوال میں سرایت پذیر ہیں"[1]

پھر یہی مصنف اسی مقالہ میں ایک اور جگہ لکھتا ہے:۔

"اگر غلامی کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ وہ قتل کر دینے کا عوض و بدل ہے تو صرف

---

[1] ان معلومات کے لیے دیکھو مذہب و اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا۔ جلد یازدہم مضمون غلامی۔

یہی ایک حیثیت اس بات کی دلیل ہے کہ غلامی اخلاقی ترقی کی طرف ایک پیشقدمی ہے۔

غلامی پر ایک تاریخی نظر

غلامی سے متعلق مصنفین مغرب کے ان خیالات کو معلوم کرنے کے بعد اس پر ایک تاریخی نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ غلامی ازمنۂ قدیمہ کی تمام ترقی یافتہ قوموں میں پائی جاتی تھی۔ اور مذہبی اعتبار سے دیکھیے تو ثابت ہوتا ہے کہ مسیحیت اور یہودیت اور ہندومت ان تینوں کی مذہبی کتابوں میں غلامی کے رواج کی مذمت کہیں نہیں کی گئی جس کی توجیہ آج کل کے عیسائی عجیب و غریب طریقہ سے کرتے ہیں:۔

غلامی اور مسیحیت | مسٹر ایل۔ڈی۔آگیٹ (L.D.Agate) لکھتے ہیں:۔

حضرت مسیح کی تعلیمات میں غلامی کی صاف طور پر مذمت کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غلامی کا مخالف گروہ اپنی تائید کے لیے انجیل کی کسی ایک آیت کو بھی پیش نہیں کرسکتا۔ اس کے برخلاف غلامی کا حامی گروہ اپنی تائید میں انجیل کے اصل متن (Scripture) کے الفاظ سے استدلال کرسکتا ہے۔ ہمارے آقا (حضرت مسیح) نے اپنے عہد کے سیاسی اور معاشرتی حالات کو پیشِ نظر رکھ کر ایسی تعلیمات تلقین کی ہیں جو عیسائی گرجا اور تاریخ کے دور میں خود بخود حالات کے مطابق کام کرتی ہیں سینٹ پال کی تعلیمات میں کہا گیا ہے۔ "آزاد اور غلام دونوں برابر ہیں" لیکن اس سے زیادہ وضاحت ہم کو اُس پیغام میں ملتی ہے جو سینٹ پال نے فائلمین (Phileman)

کے نام بھیجا تھا اور جس میں انہوں نے اُس کے بھاگے ہوئے غلام انیسمس (Onisemus) کو حکم دیا ہے کہ پھر اپنے آقا کے پاس واپس چلا جائے سینٹ پال اپنے پیام میں فائلمین سے درخواست کرتا ہے کہ اونیسمس کا گناہ معاف کر دینا چاہیے لیکن نفسِ غلامی کی مذمت انہوں نے کہیں نہیں کی ہے[1]"

عیسائی اربابِ قلم نے جب دیکھا کہ غلامی کی مذمت تمام انجیل میں کہیں نہیں ہے اور عیسائی ممالک میں غلام بنانے اور غلاموں کی خرید و فروخت کرنے کا رواج بہت افراط و بہتات کے ساتھ پایا جاتا ہے تو اب انہوں نے حضرت عیسیٰ کی تعلیمات میں تاویلات و توجیہات پیدا کرنی شروع کیں اور اس سلسلہ میں خوب خوب موشگافیاں کیں۔

چنانچہ یہی مصنف لکھتا ہے۔

"اب سوال یہ ہوتا ہے کہ حضرت مسیح نے غلامی ایسی وحشیانہ رسم کی مذمت کیوں نہیں کی؟ تو جواب یہ ہے کہ اس کے تین اسباب ہیں:۔

(۱) ہمارے آقا (حضرت مسیح) نے اپنی تعلیمات ایسے انداز میں پیش کی ہیں جو ہر زمانہ کے سیاسی حالات کے ماتحت قابلِ عمل ہو سکیں۔

(۲) یک لخت غلامی کے رواج کا خاتمہ کر دینا اُس کے لیے کوشش کرنا رومانی سوسائٹی کے نظامِ معاشرت کو صدمۂ عظیم پہنچاتا۔

(۳) گرجا کا ابتدائی عہد اس اُمید میں تھا کہ حضرت عیسیٰ پھر دوبارہ جلد ہی

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس۔ جلد ۱۱ مضمون غلامی۔

تشریف لائینگے ۔ اس بنا پر غلامی ایسی مادی چیز پر کوئی توجہ نہیں کی گئی اور یہ خیال قائم کر لیا گیا تھا کہ ہر انسان کو اپنی اس دنیوی زندگی میں اپنی حالت پر قانع رہنا چاہیے خواہ وہ کسی کا حاکم ہو کر زندگی بسر کر رہا ہو یا کسی کا محکوم و مغلوب ہو کر"

اسی مضمون میں اس کی ایک اور توجیہ کی گئی ہے، اور وہ غالباً سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ فاضل مقالہ نویس کہتا ہے: "غالباً سینٹ پال کو اس کا خطرہ تھا کہ اگر عیسائیوں نے یہ محسوس کر لیا کہ تمام عیسائی خواہ وہ دنیوی پوزیشن کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کتنی ہی مختلف ہوں روحانی برتری اور معنوی بزرگی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے برابر ہیں تو کہیں اس احساس کے باعث پرانا نظامِ معاشرت درہم برہم نہ ہو جائے"۔

ہم نہیں کہتے کہ حضرتِ عیسیٰ کی تعلیمات کی یہ توجیہات و تاویلات غلط ہیں لیکن کیا اچھا ہوتا کہ اسلام پر اعتراض کرتے وقت بھی یہ تاویلات ان مسیحی اربابِ قلم سے فراموش نہ ہو جاتیں۔

غلاموں کا مسیحی تخیل آقا اور غلام کا رشتہ کیا ہوتا ہے؟ اسکندریہ کے سینٹ کائرل (Cyril) نے ان دونوں کو صانع اور مصنوع سے تشبیہ دی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات غلام کو کس مستحقرانہ نظر سے دیکھتے تھے[1]۔

انجیل میں غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم کہیں نہیں ہے، اور نہ اُن کے ساتھ حسنِ معاشرت کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس غلاموں کو جگہ جگہ تنبیہ کی گئی ہے کہ اپنے آقاؤں کی اطاعت کریں۔ اور اُن کے حکم سے سرمو منحرف نہ ہوں۔

---

[1] مذہب و اخلاق کی انسائکلوپیڈیا۔ مضمون غلامی۔

حضرت عیسیٰ کے ایک حواری بولیس نے اپنے ایک خط میں جو اُس نے افسین کے نام لکھا ہے غلاموں کا ذکر کیا ہے اور اُن کو تاکید کی ہے کہ تم اپنے آقاؤں کی اطاعت ایسی ہی کرو جیسی کہ حضرت عیسیٰ کی کرتے ہو۔

اور جو خط تیموشاوس کو لکھا ہے اُس میں بھی یہی تحریر کیا ہے، اور اخیر میں یہ تصریح کر دی ہے کہ "جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ حضرت مسیح کی بعینہ تعلیم ہے اور جو شخص اس سے انکار کرتا ہے جھوٹا ہے"

حضرت عیسیٰ کے ایک دوسرے حواری پطرس نے بھی غلاموں کو وصیت کی ہے کہ انہیں چاہیے ہر وقت اپنے آقاؤں کے اطاعت گذار و فرمانبردار بنے رہیں:

بولیس نے جو خط اہل افسس کے نام لکھا تھا قدیس باسیلیوس نے اپنی کتاب القواعد الادبیہ میں اس کے بعض حصوں کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "یہ خط اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ غلام پر اپنے آقاؤں کی اطاعت واجب ہے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے"۔

مسیحی علماء غلامی کو انسانی بیکسی و بے بسی کا کوئی المناک حادثہ نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اُن کا خیال تھا کہ انسانی طبیعت کا اقتضا ہی یہ ہے کہ اُن میں بعض افراد احرار ہوں اور بعض غلام جیسا کہ قدیس توماس نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے اور پھر اپنے دعوے کو مذہبی وضعی قوانین سے ثابت کیا ہے۔

ان لوگوں کو غلاموں پر رحم کیوں آتا۔ یہ سمجھتے تھے کہ ہم نے غلاموں کو قتل نہیں کیا یہی ہمارا سب سے بڑا احسان اور کرم ہے۔ جیسا کہ ایک مشہور پادری بوسونٹ فرنساوی نے لکھا ہے[1]۔

---

[1] ان معلومات کے لیے دیکھو دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۴ مضمون "الرق"

علامۂ فرید وجدی نے لاروس کی انسائکلوپیڈیا کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ تمام عیسائی علماء اس کا اقرار کرتے ہیں کہ غلام بنانے کا رواج اُن کے ہاں مشروع تھا، اور مذہبی احکام میں داخل تھا۔

مسٹر اے۔ این گلبرٹسن تحریر فرماتے ہیں:

"ہم کو یہ یاد دلانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ابھی تھوڑے ہی زمانہ تک غلامی نہ صرف یہ کہ ترقی یافتہ قوموں کی حکومتوں میں منظم طریقہ پر قائم تھی — وہ قومیں جو مذہباً عیسائی تھیں — بلکہ دینیات کے بڑے بڑے عالم اُس کو حکم خداوندی سمجھتے تھے اور ایک مصلحانہ قانون یقین کرتے تھے۔"[1]

پھر اس "مصلحانہ قانون" میں اس قدر شدت اور افراط ہوئی کہ افریقہ کی بعض قوموں کا بالکل خاتمہ ہی ہو گیا۔ اور یورپ والوں نے اُن کو پکڑ پکڑ کے غلام بنا لیا۔ ایک عیسائی مبلغ لکھتا ہے: "یورپ والوں نے افریقہ کے سیاہ فام انسانوں پر بڑے بڑے مظالم کیے ہیں اور اتنے سخت کہ اب اُن کا کفارہ بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اکثر قومیں بالکل ختم ہو گئی ہیں مثلاً مونغوی اور فالوہ اور نکومی سفید فام نخاس آتے تھے اور انہیں اور ان کے بچوں کو گرفتار کر کے لیجاتے تھے۔"[2]

غلاموں کی تجارت بازاروں میں غلاموں کی کھلم کھلا تجارت ہوتی تھی اور بازاری چیزوں کی طرح

---

[1] مذہب واخلاق کی انسائکلوپیڈیا۔

[2] حاضر العالم الاسلامی مصنفہ Lothrop Stodderad بحوالہ الاسلام والحضارۃ العربیہ ج ۱ ص ۹۰

اُن کا لین دین ہوتا تھا[1]۔ مختلف شہروں میں ان کے مستقل بازار قائم تھے۔ اور اُن کے لیے پوپ سلیسٹائن پنجم (۱۲۹۴ء) نے خاص خاص قواعد بنائے تھے جن میں سے بعض یہ ہیں:-

(۱) یہودی صرف وہی غلام رکھ سکتے ہیں جن کو گھروں میں پالا گیا ہو۔

(۲) اگر وہ غلام عیسائی ہوں تو آزاد ہو سکتے ہیں۔

(۳) اگر کسی پادری نے کسی باندی سے شادی کر لی ہے تو اُس کے تمام بچے گرجا کے غلام سمجھے جائینگے۔ اُن کو اپنے باپ (پادری صاحب) کے گناہ کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔

مسٹر اے۔ این گلبرٹسن نے بالکل صاف لفظوں میں کہا ہے کہ مسیحی پیشوایانِ قوم غلاموں سے تو یہ کہتے تھے کہ اپنے آقاؤں کی اطاعت کرو۔ لیکن آقاؤں سے یہ نہیں کہا کہ اپنے غلاموں کو آزاد کرو[2]۔

غلاموں کے ساتھ سلوک

غلاموں کے ساتھ عیسائی اقوام کا معاملہ اچھا نہیں تھا، زمین میں کاشت کراتے تھے۔ سخت سے سخت کام لیتے تھے اور چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر بُری طرح زدوکوب کرتے اور سنگین سزائیں دیتے تھے۔ ویسٹر مارک کہتا ہے: "غلامی کا رواج کم از کم برطانوی مستعمرات میں اور اُن مقامات پر جہاں غلامی کا رواج ہے ظلم وستم کے اعتبار سے اُس غلامی سے بدرجہا زیادہ ظالمانہ اور جابرانہ ہے جو کافروں کے قدیم وجدید ممالک میں پایا جاتا ہے"۔

یہی مصنف دوسرے مقام پر یوں رقمطراز ہے۔

تیرہویں صدی میں آقا کو اپنے غلام پر ہر طرح کا حق تھا کہ چاہے تو اُس کو زندہ رہنے

---

[1] الاسلام والحضارۃ العربیہ جلد ۱ صفحہ ۹۴ [2] مذہب واخلاق کی انسائیکلوپیڈیا۔

دے یا ہلاک کر دے۔ یہ لوگ غلام کو لکھنے پڑھنے سے منع کرتے تھے۔ اور جو اس کے خلاف کرتا تھا، اُس کو سزا دیجاتی تھی۔ غرض یہ تھی کہ غلام اپنے حقوق سے بے خبر رہیں[1]"

غلامی اور یہودیت | یہودی شریعت کی رو سے ایک عبرانی دوسرے عبرانی کو غلام بنانے کے لیے اِن تینوں صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو اختیار کر سکتا تھا۔

(۱) کوئی شخص غربت کے باعث قرض ادا نہیں کر سکتا، اس صورت میں ایک امیر کو یہ حق حاصل تھا کہ اس مدیون غریب کی طرف سے اُس کا قرض ادا کر دے اور اُس کو اپنی غلامی میں لے لے۔

(۲) کسی نے چوری کی ہے، اور اب وہ چوری کا مال اُس کے مالک کو واپس نہیں کر سکتا تو اس شخص کو یہ حق تھا کہ اپنے تئیں کسی امیر کے ہاتھ فروخت کر دے اور وہ اُس کی طرف سے چوری کا مال ادا کر کے اُس شخص کو اپنی غلامی میں قبول کر لے۔

(۳) والدین کسی بنا پر اپنے بیٹے یا بیٹی کو کسی کے ہاتھ بیچ ڈالیں[2]۔ یہودی غلاموں کی تجارت بھی کرتے تھے۔ لوئس مقدس (Louis the pious) کے عہد میں عیسائی غلاموں کی ایک بڑی تعداد اسپین اور شمالی افریقہ میں لائی گئی تھی۔ یہ لوگ مسٹر جے اِبلسن کے بقول دلالی کرتے تھے۔ مسلمان غلام عیسائیوں کو اور عیسائی غلام مسلمانوں کو پہنچاتے تھے۔

اسپین کی خوشحالی کے زمانہ میں (جس کی مدت دسویں صدی عیسوی سے پندرہویں

---

[1] الاسلام والحضارۃ العربیہ جلد ۱ صفحہ ۹۴ [2] سفر اللاویین (۲۵: ۳۹) وسفر الخروج (۲۱: ۷ و ۸) بحوالہ نداء للجنس اللطیف۔ مصنفہ علامہ رشید رضا مصری مرحوم۔

صدی کے ختم تک ہے) یہاں کے بہت سے متمول یہودی خاندان غلاموں کے فراہم کرنے سے بہت کچھ مال و دولت جمع کرتے تھے[1]۔

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ دوسری اقوام کی بہ نسبت یہودیوں کے ہاں غلاموں کے حقوق زیادہ تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے ہاں غلامی کی مدت سات برس تھی، اس کے بعد وہ آزاد ہو جاتا تھا۔ بعض بعض عبرانی تو اپنی باندیوں کو بیوی بنا لیتے تھے اور اُن کو اپنے گھر کی ملکہ بنا کر رکھتے تھے، اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بعض غلاموں کا نکاح اُن کے آقاؤں کی بیٹیوں تک سے بھی ہو جاتا تھا[2]۔

یہودیوں کے مذہب میں غلاموں کے لیے جو حقوق اور رعایتیں تھیں وہ اسلام سے بہت ملتی جلتی ہیں، مثلاً تلمود اور دوسری مذہبی و اخلاقی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہے:

(۱) اگر کوئی شخص اپنے غیر یہودی غلام کے ساتھ بُرا معاملہ کریگا تو اُس کو مجبوراً غلام آزاد کرنا ہوگا۔ (۲) اگر آقا غلام کو آزاد کرنے کا منشاء زبانی طور پر ظاہر کرتا ہے تب بھی وہ غلام آزاد ہو جائیگا اور وہ شخص اپنے الفاظ واپس نہ لے سکیگا۔ (۳) اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب قانون یہ تھا کہ اگر آقا نے اپنے غلام کی شادی کسی آزاد عورت سے کر دی یا اُس کے سر پر کوئی تعویذ رکھ دیا۔ یا مذہبی کتابوں میں سے کسی کتاب کی تین آیتیں ایک مجمع کے سامنے پڑھنے کا حکم دیا۔ یا اُس کو کسی ایسے کام کے کرنے کا حکم دیا جو آزاد لوگوں کے لیے ہی مخصوص ہیں تو ان تمام صورتوں میں غلام آزاد ہو جائیگا، اور اُس کا آقا مجبور ہوگا کہ اُس کو پروانۂ آزادی لکھ کر

[1] مذہب و اخلاق کی انسائیکلو پیڈیا مضمون از جے۔ اِنگلس [2] دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۶

اور اپنے دستخط ثبت کر کے دے[1]۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے قوانین وضوابط سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہودی غلاموں کے ساتھ کس قدر نرم اور قابلِ تحمل معاملہ کرتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ غلاموں کا مرتبہ معاشرتی اعتبار سے کتنا پست اور ذلیل سمجھتے تھے۔ گویا اُن کے نزدیک غلام بحیثیت غلام ہونے کے نہ تو اس قابل تھا کہ کسی شریف عورت سے نکاح کرے، اور نہ اس لائق تھا کہ کسی مجمع کے سامنے مذہبی کتاب کی تین آیتیں پڑھے، اور نہ اس کا حقدار تھا کہ اُس کے سر پر ازراہِ شفقت ومحبت کوئی تعویذ آقا کے ہاتھ سے رکھا جائے۔

غلامی اور ہندو مذہب

سنسکرت کی تمام مذہبی قوانین کی کتابوں میں غلامی کا ذکر موجود ہے، اور اس کی اصل حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ منو کی کتاب میں غلام بنانے کے سات اسباب مذکور ہیں:۔

(۱) جنگ میں گرفتار ہونا۔ (۲) نان نفقہ کے لیے خود برضا و رغبت اپنے آپ کو کسی کی غلامی میں دے دینا۔ (۳) کسی باندی کے بطن سے پیدا ہونا (۴) خریدنا (۵) بطور ہبہ یا تحفہ کے حاصل کرنا (۶) اپنے بزرگوں سے وراثۃً پانا (۷) سزا کے ذریعہ غلامی کی تحقیر کرنا۔

نارد نے غلاموں کی پندرہ قسمیں شمار کی ہیں، جن میں سے سات یہی ہیں اور آٹھ ان کے علاوہ ہیں۔ ان میں قمار بازی میں ہار کر کسی کا غلام بن جانا۔ اور قرض ادا نہ کر سکنے کی بنا پر کسی کا غلام ہو جانا خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

---

[1] مذہب واخلاق کی انسائیکلوپیڈیا۔ مضمون یہودیوں کے ہاں غلامی۔

شودروں کی نسبت ان کا خیال یہ تھا کہ یہ لوگ برہما کے قدموں سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس بنا پر غلامی ان کے بدن کا جزو بن گئی ہے۔ اگر ان کا مالک انہیں آزاد کر دے، یہ لوگ پھر بھی غلامی سے نہیں نکل سکتے۔

ان کا اعتقاد تھا کہ شودر برہمنوں کی خدمت کے سوا کسی اور مقصد کے لیے پیدا ہی نہیں کیے گئے۔ ہندو مذہب میں انسانی طبقات کی چار قسمیں کی گئی ہیں۔ سب سے اعلیٰ طبقہ برہمنوں کا اور سب سے ادنیٰ طبقہ شودروں کا سمجھا جاتا تھا۔

ہندوؤں کے مذہبی قوانین کی رو سے شودروں کے لیے جو تعقیبی دفعات تھیں اُن میں سے چند یہ ہیں:۔

۱۔ برہمن کے لیے جائز ہے کہ وہ شودر کو اپنی خدمت پر مجبور کرے خواہ اُس نے اُس کو خریدا ہو یا نہ خریدا ہو۔

۲۔ شودر کا آقا اگر اُس کو آزاد کر دے تب بھی اُس کو ہر وقت اختیار حاصل ہے کہ جو خدمت چاہے لے، کیونکہ غلامی اُس کے وجود کا جزء لاینفک ہے جو آزاد کر دیے جانے پر بھی اُس سے منفک نہیں ہو سکتی۔

۳۔ کسی شودر کے ہاتھ سے اگر کسی برہمن کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو اُس کے لیے بجز قتل کے کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے۔

۴۔ کسی شودر کی زبان سے کسی برہمن کے لیے گالی کا کوئی کلمہ نکل جائے تو اُس کی سزا یہ ہے کہ اُس کی زبان پکڑ کر گدی سے باہر کھینچ لی جائے۔

۵۔کوئی شودر کسی برہمن یا اُس کے خاندان کو حقارت آمیز کلام سے خطاب کرے تو اُس کی سزا یہ ہے کہ ایک خنجر جس کا طول دس انگل ہو سخت گرم کرانے کے بعد اُس کے مُنہ میں رکھا جائے۔

۶۔جو چیزیں برہمنوں کے واجبات سے متعلق ہیں اُن میں سے کسی ایک کی نسبت اگر کسی شودر کی زبان سے کوئی کلمۂ نصیحت ادا ہو تو بادشاہ پر فرض ہے کہ کھولتا ہوا تیل اُس کے مُنہ اور کانوں میں ڈلوائے۔

۷۔برہمن اگر کسی شودر کی چوری کرے تو اُس کی سزا صرف یہ ہے کہ شودر کو مال کا تاوان دلا دیا جائے۔ لیکن یہی جرم شودر سے کسی برہمن کے لیے صادر ہوتا تو اُس کی سزا یہ تھی کہ شودر کو جلا دیا جاتا تھا۔

۸۔کسی حاکم کو مارنے کی جسارت کسی شودر سے سرزد ہو جائے تو چاہیئے کہ شودر کو زندہ ہی بھون لیا جائے لیکن کوئی برہمن اگر ایسی حرکت کر بیٹھے تو اُس کو صرف تاوانِ خیانت دینا پڑیگا۔

پھر غلاموں میں کام کے اعتبار سے ایک تفریق یہ تھی کہ بعض غلام تو وہ تھے جو غلیظ اور گندہ کاموں کے لیے وقف ہوتے تھے، مثلاً بول و براز کو صاف کرنا۔ گائے بیل کے لیے کٹی کرنا۔ اپنے آقا کو بحالت برہنگی کپڑے پہنانا اور نہلانا۔ گھروں میں جھاڑو دینا وغیرہ وغیرہ

غلاموں کو آزاد کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ آقا غلام کے کاندھوں سے ایک پانی بھرا برتن اُتارتا اور اُس سے پانی کے چند قطرے لے کر غلام پر چھڑک دیتا تھا اور پھر تین مرتبہ اُس کو آزاد کرنے کے کلمات کہتا تھا۔

قدیم ہندو قانون کے مطابق والدین کو اس بات کا پورا حق تھا کہ وہ اپنے بچوں کو فروخت

کردیں یا بطور بخشش کسی کی غلامی میں دیدیں[1]

اہلِ فارس | اہلِ فارس اُن قوموں میں سے تھے جو غلاموں کی کثرت کو تمول کی نشانی اور ریاست و امارت کی علامت سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں غلام کو محض بدزبانی کے باعث کوئی شدید سزا نہ دی جاتی تھی۔ البتہ اگر وہ اپنی اس عادت کی اصلاح نہ کرتا اور بار بار اُس سے اس طرح کی حرکات صادر ہوتیں تو پھر اُس کو قتل کردیا جاتا تھا۔

اہلِ چین | چین والے بھی اپنے مذہبی اور ملکی دستور کے مطابق غلام سے ہر طرح کا خاطر خواہ معاملہ کرنے میں مختار تھے لیکن چینیوں کے اخلاق و عادات دوسری قوموں کی بہ نسبت اچھے تھے اسی لیے وہ غلاموں کے ساتھ زیادہ وحشیانہ معاملہ نہیں کرتے تھے۔ پہلی صدی عیسوی میں اُن کے ہاں ایسے قوانین بنائے گئے تھے جن کی رو سے ہر شخص کو اپنے غلام کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔

یونان میں غلامی کا رواج | بقول مسٹر ڈبلو۔ جے۔ وڈ ہاؤس یونان میں غلامی کا ظہور دو[2] اسباب سے ہوا۔ ایک جنگ اور دوسری ضرورت۔

یونان میں غلامی کے وجود کا پتہ ہومر کے عہد میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس عہد کا غلام کوئی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ اور تعجب انگیز یہ بات ہے کہ اس باب میں یونان کے بڑے بڑے فلسفی بھی رائے عامہ کے تابع اور عوام کے ہم خیال وہم عقیدہ تھے۔ ارسطو جو حکمائے یونان میں ایک مرتبۂ خاص کا مالک ہے اکثر کہا کرتا تھا کہ "غلام ایک آلہ ہے مگر ذی روح، اور ایک

---

[1] دائرۃ المعارف فرید وجدی اور مذہب[2] اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا۔

کھلونہ ہے مگر جاندار"۔

یونانیوں کے نزدیک انسانوں کی دو قسمیں ہیں: احرار اور غلام۔ اور پھر غلام دو قسم کے تھے، ایک وہ جن کے ملک پر زبردستی تسلط و استیلاء حاصل کر لیا گیا ہو۔ دوسری قسم اُن غلاموں کی تھی جن کو بازار سے خریدا گیا ہو۔ پہلی قسم کے غلام محض نام کے غلام تھے، ورنہ اُن کو زمینوں کے تابع سمجھا جاتا تھا۔ زمینوں کے ساتھ ان کی بھی خرید و فروخت ہوتی تھی۔

دوسری قسم کے غلام اپنے آقاؤں کے رحم و کرم پر زندگی گذارتے تھے۔ آقا جو چاہتا اُن کے ساتھ معاملہ کر سکتا تھا۔ کوئی نہ تھا جو اُس سے بازپرس کر سکتا۔

غلاموں کی تجارت

یونان میں اتینا نامی ایک بڑا بازار تھا جہاں غلاموں کی تجارت ہوتی تھی۔ یہاں سے جو غلام خریدے جاتے تھے مالک اُن سے اپنا ذاتی کام لیتا اور اُن کو کرایہ پر بھی دے سکتا تھا۔

غلاموں کو سزائیں

یونان کے دستور ملکی کے مطابق کوئی اجنبی کسی کے غلام کو نہیں مار سکتا تھا لیکن آقا کو معمولی معمولی خطاؤں پر سخت سے سخت سزا دینے کا اختیارِ کلّی حاصل تھا۔ صرف ایتھنز میں یہ قاعدہ تھا کہ غلام اپنے آقا کی غیر انسانی حرکت کے خلاف احتجاج کر کے کسی ایک "جائے پناہ" میں پناہ لے سکتا تھا۔

غلاموں کی عام سزا کوڑا تھی جس کی مقدار پچاس تک ہوتی تھی۔ دوسری قسم کی سزا حبس تھی، حبس کی مختلف صورتیں اور شکلیں ہوتی تھیں۔ اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال دینا تو اس قدر عام تھا کہ مذہب و اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار کے بقول اُس کو سزا ہی نہ کہنا چاہیے۔

اس کے علاوہ داغنے کی سزا کا بھی دستور تھا۔ مگر یہ سزا خصوصاً اُن غلاموں کو دی جاتی تھی جو اپنے آقا کے پاس سے فرار ہو گئے ہوں۔ اور پھر گرفتار کر لیے گئے ہوں چوتھی قسم کی سزا یہ تھی کہ غلام سے کانوں میں یا چکیوں پر بڑی ہی سخت محنت لیجاتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات یہ ہی محنت اُن کی حسرتناک موت کا سبب ہوتی تھی

غلاموں کو آزاد کرنے کے طریقے

یونان میں غلاموں کی آزادی کے تین طریقے تھے۔

۱۔ یہ کہ ملک کی طرف سے مدافعت کرنے کے لیے حکومت کو غلاموں کی فوجی خدمات کی ضرورت ہوتی تو اس صورت میں حکومت باختیار خود جتنے غلاموں کو چاہتی آزاد کر دیتی۔ آزاد ہونے کے بعد ان لوگوں کو فوج میں بڑے سے بڑا عہدہ دیا جا سکتا تھا۔

۲۔ آقا خود اپنی رضا و رغبت سے ازراہِ کرم و عنایت غلام کو یونہی بغیر کسی معاوضہ کے آزاد کر دے۔ یا اسلام میں عبد مکاتب کے ساتھ جو معاملہ کیا جاتا ہے وہ اختیار کرے یعنی اپنے غلام سے کہے کہ تو اتنی رقم مجھ کو کما کر دے دے، اس کے بعد تو آزاد ہو جائیگا۔ تو اس صورت میں حکم یہ تھا کہ اُس مقررہ رقم کو ادا کرنے کے بعد ہی غلام آزاد سمجھا جاتا تھا۔

۳۔ آزادی کی تیسری صورت یہ تھی کہ آقا اپنے غلام کو کسی دیوتا کی خدمت کے لیے وقف کر دیتا تھا۔ پھر اس میں بھی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ آقا اُس کے بدلے میں اپنے غلام سے یا بالفاظ دیگر دیوتا سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیتا تھا۔ بلکہ اُس کی جانب سے ایک طرح کا نذرانہ تھا۔ اور دوسری شکل یہ تھی کہ آقا غلام سے کہتا کہ اگر تو نے اتنی رقم مجھ کو ادا کر دی تو میں تجھ کو فلاں دیوتا کی خدمت کے لیے وقف کر دونگا۔ غلاموں کو اس صورت میں شخصی ملکیت سے

نکل آنے کے باعث یک گونہ راحت ملتی تھی۔ اس لیے وہ بسا اوقات اس شرط کو منظور کر لیتے تھے، پھر جو رقم غلام ادا کرتا تھا اُس کو سمجھا جاتا تھا کہ وہ درحقیقت دیوتا کی طرف سے ادا کی جا رہی ہے۔ یعنی دیوتا خریدار، اور مالک بائع، اور غلام مبیع ہوتا تھا۔ اس قسم کا معاملہ پیشوائے مذہبی کی موجودگی میں ہوتا، غلام کا باقاعدہ بیعنامہ لکھا جاتا، اور وہ مالک کی ملکیت سے نکل کر دیوتا کی ملکیت میں داخل ہو جاتا۔

درحقیقت یہ صورت آزادی کی نہیں ہے لیکن چونکہ غلام اس معاملہ کے بعد مالک کی ملکیت سے نکلجاتا ہے اور ایک شخص کی بجائے ایک عبادت گاہ کا غلام ہو جاتا ہے جس میں اُس کو صورتِ اوّل کے بالمقابل یک گونہ راحت و آرام ہے، اس لیے اس صورت کو بھی آزادی کی صورتوں میں شمار کیا گیا ہے۔

آزاد کردہ غلام | روما کی تاریخ بنانے میں آزاد کردہ غلاموں کو بھی بڑا دخل ہے لیکن یونان میں جو غلام آزاد ہوتے تھے اُن کو کوئی شہری حق مطلق نہیں ملتا تھا۔ آزاد ہونے کے بعد وہ اور چند در چند مصائب میں گرفتار ہو جاتے تھے۔ رہنے کے لیے اُن کو کسی شخص کی سرپرستی حاصل کرنی ضروری تھی۔ اور پھر ان غریبوں کو ایک بھاری ٹیکس بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔ اور یہ ٹیکس وہ تھا جو اجنبی باشندگانِ شہر سے وصول کیا جاتا تھا۔ پھر اُس کے لیے خاص خاص قواعد تھے جن کی پابندی اُس پر لازم تھی۔ اگر اُن میں سے کبھی کسی ایک قاعدہ کی خلاف ورزی ہوتی تو بطور سزا اُس کو دوبارہ غلام بنا لیا جا سکتا تھا۔ اسمبلی کا کوئی غیر معمولی ووٹ ہی اُس کو شہری حقوق دلا سکتا تھا[۱]۔

[۱] زیادہ تفصیلی معلومات کے لیے دیکھو انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس۔

مصر قدیم

دنیا کی قدیم تہذیبوں میں مصر کی تہذیب کو نمایاں امتیاز حاصل ہے، لیکن آپ کو تعجب ہوگا کہ تہذیب و تمدن کے اس قدر عروج کے باوجود اہل مصر کے نزدیک غلام صرف خدمتگذاری اور چاکری کے لیے مخصوص سمجھا جاتا تھا۔ آقاؤں کو غلاموں پر ہر طرح کا تسلط و استیلا رتھا، زندہ رکھیں یا قتل کردیں۔

تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان سختیوں میں کمی پیدا ہوتی رہی لیکن پھر بھی سب سے بڑی رعایت جو اُن کو دی گئی وہ یہ تھی کہ مصری حکومت کے اعلان کے مطابق یہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ جو شخص کسی غلام کو قتل کریگا انتقام میں اُس کو بھی قتل کردیا جائیگا۔

فینیقیوں میں غلامی کا رواج

سولھویں صدی قبل مسیح میں جبل لبنان اور سمندر کے درمیان کچھ لوگ رہتے تھے جو عرب اور یہود کے ساتھ ہمجنس تھے، یہ اہل فینیقیہ کہلاتے تھے فینیقیہ کے دو شہر بہت مشہور تھے، پہلے صیدا اور اس کے بعد صور۔ ان لوگوں میں بھی غلام حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا یہ ہر جگہ غلاموں کی جستجو میں رہتے تھے، خصوصاً جوان لڑکیاں، لڑکے اور جنگی غلام فاتحوں سے خریدتے تھے۔ اکثر اوقات صیدا کے لوگ غلاموں اور باندیوں کے خریدنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ آدمیوں کو چرالاتے، اور زبردستی غلام بنالیتے تھے۔ ہیروڈوٹس ایک حکایت بیان کرتا ہے کہ ایک روز فینیقی ارگوس (Argos) میں اُترے جو اُس زمانہ میں یونان کا بہترین شہر تھا، اور اپنا سامان بھی کنارے پر اُتارا۔ یونانی اُن سے سامان خریدنے کے لیے وہیں آنے لگے چند روز کے بعد جب ان کا سب مال فروخت ہو چکا تو وہاں کے بادشاہ کی لڑکی عورتوں کی ایک جماعت کے ساتھ فینیقیوں کے پاس آئی

ابھی یہ عورتیں خریدنے میں مصروف تھیں کہ اچانک بیچنے والوں نے ان پر حملہ کر دیا اور زبردستی انہیں پکڑ کر اپنی کشتیوں میں بٹھا کر چلتے ہوئے۔[1]

رومیوں میں غلامی کا رواج

غلامی کی تاریخ میں روما کی غلامی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ صرف اسی موضوع پر متعدد اربابِ قلم نے قیمتی تصنیفات لکھی ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک لوگوں کو غلام بنانے کے مختلف طریقے تھے، جن قوموں پر فتح حاصل کرتے تھے اُنہیں اپنا غلام سمجھتے تھے، اور جو بچے باندیوں کے بطن سے پیدا ہوتے تھے وہ بھی غلام ہی سمجھے جاتے تھے اس کے علاوہ رومانی قانون میں چند دفعات ایسی تھیں جن کی رو سے وہ جب چاہتے کسی حرالاصل آدمی کی حریت و آزادی کو سلب کر سکتے تھے۔ جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوتے تھے اُن کو روما کے بازاروں میں بہت کم قیمت پر فروخت کر دیا جاتا تھا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو چُرا لاتے اور غلام باندیاں بنا کر بیچ دیتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اخلاقی اعتبار سے روم کے لوگ بردہ فروشی کو بدترین کام سمجھتے تھے لیکن چونکہ اس میں نفع بہت تھا اس لیے اس کا رواج بھی بہت عام تھا۔

ان کا عام دستور تھا کہ جس غلام کو بیچنا ہوتا تھا اُس کو پتھر کی ایک اونچی چٹان پر کھڑا کر دیتے تھے تاکہ ہر ایک گاہک اُس کو دیکھ سکے اور جس کو پسند ہو وہ خرید سکے۔

روما کی حکومت آٹھ سو برس تک رہی اور کہا جاتا ہے کہ یہ عہدِ عتیق کی سب سے بڑی مہذب اور متمدن حکومت تھی لیکن اس کے باوجود ان کے تمدنی اصول و قواعد

[1] اُردو ترجمہ تاریخ ملل قدیمہ مُصنفہ سینولیس فرانسیسی ص ۲۶۹۔

میں غلاموں کے لیے کچھ حقوق نہیں تھے۔ اور انسانی زندگی کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے کا اُنھیں کوئی حق نہ تھا۔ زندہ رکھنے اور قتل کرنے میں آقا مختار کل ہوتے تھے۔ کسی کو ان کے کسی فعل پر نکتہ چین ہونے کا حق نہ تھا۔

غلاموں کو سزائیں

اِن کے یہاں غلاموں کو سزا دینے کے بھی عجیب و غریب طریقے رائج تھے مثلاً کسی غلام سے کوئی اُدنیٰ سا جرم صادر ہوا اور اُنھوں نے ایک بڑا بھاری پتھر اُس کی کمر پر لاد دیا۔ اور اُس پر طرفہ ستم یہ کہ غلام سے کہا جاتا کہ اسی حالت میں جا کر کھیتوں میں کاشت کا کام کرو۔ کبھی اُن کو بطور سزا اُلٹا لٹکا دیا جاتا اور بڑی بڑی وزنی چیزیں اُن کے جسم سے باندھ دی جاتیں، اور کبھی اُن کو اس بے دردی سے مارا جاتا کہ بیچارے پٹتے پٹتے قیدِ ہستی سے ہی آزاد ہو جاتے تھے۔

مسٹر آر۔ ایچ بارو نے خاص "رومن سلطنت میں غلامی" کے نام سے ایک ضخیم اور پُر از معلومات کتاب لکھی ہے۔ اُس میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ روما میں جو لوگ آباد تھے اُن کی تعداد تو مورخین نے لکھی ہے لیکن غلاموں کی صحیح تعداد کسی نے نہیں بتائی۔ قیاس و تخمین سے جو تعداد بتائی جاتی ہے وہ مختلف ہے۔ اور اُس کے اعتبار سے غلاموں کی آبادی روم کی آبادی کی تقریباً ایک چوتھائی تھی۔

رومانی لشکر نقل و حرکت کرتا تھا تو اُس کے جلو میں بردہ فروش بھی ہوتے تھے۔ ان کو جہاں کہیں موقع ملتا لڑکوں کو چُرا کر اور عورتوں کو گرفتار کر کے لے آتے۔ اس میں شبہ

Slavery in the Roman Empire ۵

نہیں کہ رومن سلطنت کے اخیر دور میں غلاموں پر زیادہ سخت اور بہیمانہ مظالم ہونے بند ہو گئے تھے۔ اور یہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ جو شخص کسی غلام کو قتل کریگا اُس سے غلام کے خون کا انتقام لیا جائیگا، لیکن اس قانون کے نفاذ سے قبل غلام کی حیثیت محض ایک جانور کی سی تھی جس کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ وہ ایک ایسا ذی روح ہے جس کو مملوک ہی ہونا چاہیے اس کے برخلاف آقاؤں کو غلاموں پر جو اختیارات حاصل تھے اُن کا کوئی حد و حساب نہ تھا۔ سیاسی اور شہری معاملات میں غلام کو کوئی دخل نہ تھا۔ اور نہ کسی پبلک اجتماع میں شریک ہو سکتا تھا اور نہ کوئی فوجی خدمت اُس کے سپرد کی جاسکتی تھی۔ قانونی طور پر یہ غریب شادی کے بھی مجاز نہیں تھے، اور وہ عدالت میں کسی طرف سے گواہی بھی نہیں دے سکتے تھے۔

روما کی تاریخ میں محمود و ایاز کے تعلقات کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سیسیرو (Cicero) اور اُس کے غلام تیرو (Tiro) اور اٹیکس (Atticus) اور اُس کے غلام الیکسس (Alexis) کے درمیان بہت خوشگوار اور دوستانہ تعلقات تھے لیکن ڈبلو۔ جے وڈہاؤس (W.J. Woodhouse) کے قول کے مطابق اس طرح کی مثالیں شاذ و نادر ہی ہیں اور ان کو عام اجتماعی اور تمدنی زندگی کا آئینہ دار نہیں کہا جا سکتا۔

غلاموں کے ساتھ مراعات

روم کی غلامی کو تین ادوار پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ سب سے آخری دور میں غلاموں سے متعلق متعدد اصلاحی قوانین بنائے گئے اور بقول ایک یورپین مصنف[1] کے سلطنت روما کا یہ اقدام رواجِ غلامی کے تدریجی انسداد کا پیش خیمہ تھا۔ اُن قوانینِ مراعات و اصلاح میں سے

---

[1] مذہب و اخلاق کی انسائیکلو پیڈیا۔

چند یہ ہیں :-

۱۔ بچوں کو بیچنا، اور قرض کے بدلے میں دے دینا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

۲۔ روم میں غلاموں کو سزا دینے کا ایک عجیب طریقہ یہ تھا کہ وہ غلاموں کو درندوں سے لڑنے کے لیے بھیج دیتے تھے اوران کا تماشا دیکھتے تھے۔ اس آخری دورِ غلامی میں اس کو بھی ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

۳۔ ہارڈین (Hardian) نے ایک آقا کے لیے یہ ناجائز قرار دیا کہ وہ مجسٹریٹ کی کی اجازت کے بغیر اپنے غلام کو قتل کرے۔ اینٹونینس (Antoninus) کے سامنے ایک ایسا ہی مقدمہ پیش ہوا تو اُس نے غلام مقتول کے آقا کو ایسا ہی ملزم قرار دیا جیسا کہ کسی دوسرے کے غلام کو قتل کرنے پر مُلزم ٹھہرایا جاتا۔

اِس نے یہ قانون بھی بنایا تھا کہ جس غلام کے ساتھ بُرا معاملہ کیا جائیگا وہ عبادت گاہ کے لیے وقف ہو جائیگا۔

روم میں ایک عام دستور یہ تھا کہ لوگ اپنی باندیوں سے پیشہ کراتے تھے لیکن حیرت کا مقام ہے کہ غلاموں سے متعلق جو اصلاحی قوانین بنائے گئے تھے اُن میں کہیں باندیوں کی نسبت اس طرح کی کوئی اصلاحی چیز موجود نہیں تھی، البتہ حضرت مسیح کی وفات کے چار سو اٹھائیس برس بعد یہ قانون بنایا گیا تھا کہ جو کوئی شخص اپنی باندیوں سے کسب کرائیگا اُس کو سزا دی جائیگی جسٹینین (Justiniun) نے اس میں اور اضافہ کیا، باندی کی عصمت دری

لہ ایک رومن لیڈی اپنے غلاموں کے ساتھ بہت ظالمانہ برتاؤ کرتی تھی۔ ہارڈین نے اُسکو پانچ سال کے لیے جلاوطن کر دیا۔

پر سزاءِ موت تجویز کی۔

انہی اصلاحات کا ایک جزء یہ تھا کہ کانسٹینٹائن (Constantine) نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ غلاموں کی تقسیم میں میاں اور بیوی، بھائی اور بہن، باپ اور بیٹے میں تفریق نہ کی جائے۔ جسٹینین نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور یہ قانون بنا دیا کہ ذی رحم محرم میں سے اگر کوئی ایک آزاد کیا جائیگا تو اُس کے دوسرے اعزاء بھی آزاد ہو جائینگے۔

غلاموں کی آزادی

روم میں غلام آزاد بھی ہوتے تھے، لیکن اُس کے لیے چند در چند قیدیں تھیں، پھر آزاد کرنے والوں کی نیت بھی بخیر نہیں ہوتی تھی۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کا مقالہ نگار لکھتا ہے :۔

"اصولی خود غرضی اور کمینگی کا ظہور شاید اس قدر بھیانک شکل میں کہیں نہیں ہوا ہوگا، جتنا کہ یہاں غلاموں کو آزاد کرنے میں ہوتا تھا۔ غلام کو آزاد کر کے آزاد کرنے والا اپنا کچھ کھوتا نہیں تھا بلکہ کچھ اور زیادہ حاصل کر لیتا تھا۔ رومیوں میں آزاد کرنا شرافت اور نجابت کی دلیل کم اور "صنعتی دیکھ بھال" کی زیادہ تھی، آقا کو بسا اوقات یہ زیادہ سود مند معلوم ہوتا تھا کہ وہ آزاد کردہ غلام کی تجارت میں بحیثیت حصہ دار کے شریک ہو بہ نسبت اس کے کہ جو کچھ غلام کمائے وہ سب اسی کے نام اور اسی کی ذمہ داری کے ساتھ انجام پذیر ہو"

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ روم میں لوگ غلام آزاد کرتے تھے تو اُن کے اس عمل کا محرک کوئی اخلاقی نقطۂ نظر نہیں ہوتا تھا بلکہ اُس کی وجہ زیادہ تر اقتصادی ہوتی تھی۔ یہ سمجھتے تھے کہ غلام اگر بحالت غلامی کوئی کاروبار کریگا تو اس میں اتنا فائدہ نہیں ہوگا جتنا کہ آزاد ہونے کے بعد اُس

کام کو کرنے میں ہو سکتا ہے۔

روم میں غلام کی آزادی دو قسم کی تھی، ایک باقاعدہ اور دوسری رسمی۔ پھر قسم اول کی تین قسمیں تھیں۔ ان سب کا حاصل یہ ہے کہ آزادی صرف زبان سے کہہ دینے سے ہی ثابت نہیں ہو جاتی تھی۔ بلکہ آقا کو عدالت میں حاضر ہو کر کہنا پڑتا تھا کہ میں اپنے غلام کو آزاد کرنا چاہتا ہوں، اس پر مجسٹریٹ اس کا بیان تحریری لیتا تھا، اور اپنے دستخط اُس پر ثبت کر دیتا تھا، اس کے بعد شہر کے لوگوں کی فہرست میں اُس کا نام درج کر لیا جاتا اور اُس کی آزادی کا اعلان عام کر دیا جاتا تھا۔

اب وہ اپنے تجارتی کاروبار اور دوسرے معاملات میں بالکل آزاد ہوتا تھا اور آزادوں کی طرح شہری حقوق کا مالک بھی۔ لیکن اپنے آقائے سابق اور اُس کے گھرانے کے ساتھ اُس کے تعلقات اب بھی نیم غلامانہ ہوتے تھے جن کے قائم رکھنے پر عرف اور قانون دونوں کی دفعات کے پیش نظر وہ مجبور رہتا تھا۔

دو سو اٹھارہ برس قبل مسیح کے کلاڈین (Claudian) قانون کے مطابق جو لوگ لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر ہوتے تھے اُن کو یا اُن کی اولاد کو تجارت کرنے کا حق نہیں تھا۔ اِس بنا پر ان لوگوں نے ترکیب یہ ایجاد کی تھی کہ غلاموں کو ایک خاص تجارتی معاہدہ کے بعد آزاد کر دیتے تھے۔ اور اس طرح گویا خود تجارت کر کے قانون شکنی کے جرم کا ارتکاب کرتے تھے۔ روم کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ آزاد کردہ غلاموں کو ملک کی سوسائٹی میں اگرچہ کوئی وقعت حاصل نہیں تھی اور وہ مجلس حکومت میں بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے لیکن اس کے باوجود

اِن لوگوں نے زیادہ سے زیادہ دولت کمائی۔ اور عرف عام میں دولت کا ہی دوسرا نام طاقت ہے اس بنا پر اُنہوں نے اچھی خاصی قوت و طاقت بھی پیدا کرلی لیکن آگسٹس کے عہد تک ان کو پبلک زندگی میں نمایاں ہونے کا کوئی موقع نہ تھا۔ میونسپلٹی، ملک کی حکمران جماعت ان میں سے کسی ایک کے ممبر نہیں ہوسکتے تھے۔ اور نہ ان کو مجسٹریٹی کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔[1]

فرنگیوں میں غلامی کا رواج

فرنگی قبائل میں فرانسیسی لوگ غلاموں کے معاملہ میں سب سے زیادہ بے رحم، متشدد اور تند مزاج تھے۔ ان کے قانون میں اس کی صراحت تھی کہ اگر کوئی آزاد کسی باندی سے نکاح کرلیگا تو وہ بھی بیوی کی طرح غلام سمجھا جائیگا۔ اسی طرح اگر کوئی حُرّہ کسی غلام سے نکاح کریگی تو خاوند کی طرح وہ بھی باندی سمجھی جائیگی۔ ان میں سے بعض قبائل کی سختی کا عالم یہ تھا کہ وہ غلام سے نکاح کرنے والی شریف و آزاد عورت اور باندی سے شادی کرنے والے "مردِ آزاد" کو زندہ ہی نہ چھوڑتے تھے۔ دونوں کو زندہ آگ میں ڈال دیتے تھے۔

یورپ میں رواج غلامی کا سبب

یورپ میں غلامی کے اس رواج کا سبب یہ تھا کہ روسی شروع شروع میں بحرِ اسود اور دریائے ڈینوب کے شمال میں فروکش ہوئے پھر آہستہ آہستہ وسط یورپ میں مغرب جنوب کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ اب اُن کے لیے ناگزیر تھا کہ راہ میں جو قبائل واقع ہوں اُن سے جنگ کریں۔ اس زمانہ میں عام قاعدہ تھا کہ جنگ کے اسیران بلا کو غلام بنا کر بیچ دیتے تھے۔ سوداگروں کی بڑی بڑی جماعتیں تھیں جو فرانس اور اسپین کی راہ سے قیدیوں کو افریقہ اور وہاں سے شام و مصر لے جاتے تھے۔

---

[1] ماخوذ از مذہب و اخلاق کی انسائیکلو پیڈیا۔ اور دائرۃ المعارف فرید وجدی۔

فرنگی سوداگر روسی اور جرمنی غلاموں کو فروخت کرنے کے لیے ڈینوب اور بحرِ اسود کے کناروں تک جاتے تھے اور بکریوں کے ریوڑ کی طرح انسانوں کے اس گلہ کو آگے آگے ہنکاتے چلتے تھے۔ اس کے علاوہ اہل جارجیا اور چرکس اپنی اولاد کو مال و متاع کی طرح بیچنے کے خوگر تھے۔[1]

روس میں غلامی

بعض روسی کہتے ہیں کہ ابتداءً روس میں غلامی کا وجود بالکل نہ تھا۔ بلکہ وہاں کی دیہاتی آبادی تین طبقوں پر مشتمل تھی ایک غلام، دوسرے آزاد زراعتی مزدور، اور تیسرے کسان۔ اٹھارویں صدی میں ان تین جماعتوں کو غلاموں کی ایک جماعت بنالیا گیا تھا۔ غلاموں کی طرح ان کو خریدا اور بیچا جاتا تھا۔ اور ان کی فروخت کے لیے باقاعدہ اشتہار شائع ہوتے تھے۔ ۱۸۰۱ء کے ماسکو گزٹ میں ایک مرتبہ چند غلاموں اور باندیوں کا ایک اشتہار شائع ہوا تھا اور اُس کی عبارت یہ تھی۔

"برائے فروخت موجود ہیں ــــ تین کام کرنے والے مرد عمدہ تربیت یافتہ۔ اور دو ۲ خوبصورت لڑکیاں۔ جن میں سے ایک کی عمر اٹھارہ ۱۸ سال کی اور دوسری کی پندرہ ۱۵ سال کی ہے۔ یہ دونوں لڑکیاں خوش منظر اور خانہ داری کے مختلف کاموں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اسی گھر میں ان کے علاوہ دو اور بال بنانے والے غلام فروختگی کے لیے موجود ہیں، ایک کی عمر بیس سال کی ہے، لکھ پڑھ سکتا ہے اور آلات موسیقی پر گا سکتا ہے، اور شکار میں بھی بڑی مدد دے سکتا ہے۔ دوسرا غلام عورتوں اور مردوں دونوں کے بال

---

[1] نظام العالم والامم ج ۲ ص ۲۰۴

سنوار سکتا ہے، اور اسی گھر میں پیانو و دیگر آلاتِ غنا بھی بکنے کے لیے موجود ہیں"۔

الیگزنڈر اول (۱۸۰۱ء تا ۱۸۲۵ء) نے غلاموں کے متعلق اس طرح کے اشتہارات شائع کرنا ممنوع قرار دیا۔ اور نکولس اوّل (Nicholas) نے تو اس رواجِ غلامی کا بالکل خاتمہ ہی کر دیا۔[۱]

موجودہ مغربی قومیں | موجودہ مغربی قوموں میں غلامی کا رواج انیسویں صدی کے نصف تک رہا اس کے بعد ان سب نے متفق ہو کر اس رواج کو باطل کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن جب تک رہا غلاموں پر طرح طرح کی سختیاں ہوتی تھیں۔ یہاں ایک خاص قانون تھا جس کو "سیاہ قانون" کہتے تھے یہ ۱۶۸۵ء میں فرانس میں شائع کیا گیا۔ اس کی رو سے اگر کوئی حبشی کسی شریف آدمی پر دست درازی کرتا یا سرقہ کے گناہ کا ارتکاب کرتا تو اس کو قتل کی سزا دی جا سکتی تھی۔

بھاگ جانے کی سزا | فرار ہونے کی سزا یہ تھی کہ اگر اس نے اس حرکتِ ناشائستہ کا ارتکاب پہلی یا دوسری مرتبہ کیا ہے تو اس کے دونوں کان کاٹ ڈالنے چاہئیں۔ اور ساتھ ہی لوہا گرم کر کے اس کو داغنا چاہیے۔ اور اگر اس پر بھی باز نہ آئے اور تیسری مرتبہ پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے تو اس کو سپردِ تیغ کر دینا چاہیے۔ اس قانون کے ماتحت انگلستان میں کثرت سے غلام قتل ہوتے تھے، وجہ یہ تھی کہ وہ سختیوں سے گھبرا گھبرا کر بھاگ جاتے تھے اور جب گرفتار ہو کر آتے تھے تو قتل کر دیے جاتے تھے۔ فرانس میں یہ حالت ۱۸۴۸ء کے انقلاب تک رہی۔ اس سلسلہ میں جہاں اور اصلاحات ہوئیں غلامی کا رواج بھی بند ہو گیا۔[۲]

---

[۱] ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس۔ [۲] دائرۃ المعارف فرید وجدی۔

فرنگی سوداگر روسی اور جرمنی غلاموں کو فروخت کرنے کے لیے ڈینوب اور بحرِ اسود کے کناروں تک جاتے تھے اور بکریوں کے ریوڑ کی طرح انسانوں کے اس گلہ کو آگے آگے ہنکاتے چلتے تھے۔ اس کے علاوہ اہل جارجیا اور چرکس اپنی اولاد کو مال و متاع کی طرح بیچنے کے خوگر تھے۔[1]

روس میں غلامی

بعض روسی کہتے ہیں کہ ابتداءً روس میں غلامی کا وجود بالکل نہ تھا۔ بلکہ وہاں کی دیہاتی آبادی تین طبقوں پر مشتمل تھی ایک غلام، دوسرے آزاد زراعتی مزدور، اور تیسرے کسان۔ اٹھارویں صدی میں ان تین جماعتوں کو غلاموں کی ایک جماعت بنا لیا گیا تھا۔ غلاموں کی طرح ان کو خریدا اور بیچا جاتا تھا۔ اور ان کی فروخت کے لیے باقاعدہ اشتہار شائع ہوتے تھے۔ ۱۸۰۱ء کے ماسکو گزٹ میں ایک مرتبہ چند غلاموں اور باندیوں کا ایک اشتہار شائع ہوا تھا اور اُس کی عبارت یہ تھی۔

"برائے فروخت موجود ہیں —— تین کام کرنے والے مرد عمدہ تربیت یافتہ۔ اور دو خوبصورت لڑکیاں۔ جن میں سے ایک کی عمر اٹھارہ سال کی اور دوسری کی پندرہ سال کی ہے۔ یہ دونوں لڑکیاں خوش منظر اور خانہ داری کے مختلف کاموں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اسی گھر میں ان کے علاوہ دو اور بال بنانے والے غلام فروختگی کے لیے موجود ہیں، ایک کی عمر بیس سال کی ہے، لکھ پڑھ سکتا ہے اور آلات موسیقی پر گا سکتا ہے، اور شکار میں بھی بڑی مدد دے سکتا ہے۔ دوسرا غلام عورتوں اور مردوں دونوں کے بال

---

[1] نظام العالم والامم ج ۲ ص ۲۰۴

سنوار سکتا ہے، اور اسی گھر میں پیانو و دیگر آلاتِ غنا بھی بکنے کے لیے موجود ہیں"۔

الیگزنڈر اوّل (۱۸۰۱ء تا ۱۸۲۵ء) نے غلاموں کے متعلق اس طرح کے اشتہارات شائع کرنا ممنوع قرار دیا۔ اور نکولس اوّل (Nicholas) نے تو اس رواجِ غلامی کا بالکل خاتمہ ہی کر دیا۔[۱]

موجودہ مغربی قومیں | موجودہ مغربی قوموں میں غلامی کا رواج انیسویں صدی کے نصف تک رہا اس کے بعد ان سب نے متفق ہو کر اس رواج کو باطل کرنے کا ارادہ کیا لیکن جب تک رہا غلاموں پر طرح طرح کی سختیاں ہوتی تھیں یہاں ایک خاص قانون تھا جس کو "سیاہ قانون" کہتے تھے یہ ۱۶۸۵ء میں فرانس میں شائع کیا گیا۔ اس کی رو سے اگر کوئی حبشی کسی شریف آدمی پر دست درازی کرتا یا سرقہ کے گناہ کا ارتکاب کرتا تو اُس کو قتل کی سزا دی جا سکتی تھی۔

بھاگ جانے کی سزا | فرار ہونے کی سزا یہ تھی کہ اگر اس نے اس حرکتِ ناشائستہ کا ارتکاب پہلی یا دوسری مرتبہ کیا ہے تو اُس کے دونوں کان کاٹ ڈالنے چاہئیں۔ اور ساتھ ہی لوہا گرم کر کے اُس کو داغنا چاہیے۔ اور اگر اُس پر بھی باز نہ آئے اور تیسری مرتبہ پھر اُسی حرکت کا اعادہ کرے تو اُس کو سپردِ تیغ کر دینا چاہیئے۔ اس قانون کے ماتحت انگلستان میں کثرت سے غلام قتل ہوتے تھے، وجہ یہ تھی کہ وہ سختیوں سے گھبرا کر بھاگ جاتے تھے اور جب گرفتار ہو کر آتے تھے تو قتل کر دیے جاتے تھے۔ فرانس میں یہ حالت ۱۸۴۸ء کے انقلاب تک رہی۔ اس سلسلہ میں جہاں اور اصلاحات ہوئیں غلامی کا رواج بھی بند ہو گیا۔[۲]

---

[۱] ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس۔ [۲] دائرۃ المعارف فرید وجدی۔

جنوبی امریکہ | جنوبی امریکہ میں غلام بنانے کا رواج انتہائی وحشیانہ اور جابرانہ تھا "سیاہ قانون" کا مفاد یہ تھا کہ اگر کوئی شریف کسی باندی سے نکاح کرلیگا تو اُس کو نوآبادیات میں کوئی عہدہ نہیں مل سکتا۔ ان کے قوانین میں اس امر کی تصریح تھی کہ آقا کو اپنے غلام پر ہر طرح کا اختیار حاصل ہے۔ یہاں تک کہ زندہ رکھنے اور مار ڈالنے کا بھی۔ مالک اپنے غلام کو رہن رکھ سکتا تھا۔ اُجرت پر دے سکتا تھا۔ اور اُس پر قمار کھیل سکتا تھا۔ سب سے زیادہ عجیب یہ بات ہے، کہ غلام شہر کی سڑکوں پر بغیر سرکاری اجازت نامہ کے نہیں چل سکتا تھا، اور اس پر طرفہ یہ کہ کسی سڑک پر کہیں سات غلام اکٹھے نظر آجاتے تو ہر شخص کو اختیار حاصل تھا کہ اُنہیں قید کرادے۔ خواہ اس کے پاس سرکاری اجازت ہو یا نہ ہو۔ صرف سفید فام ہونا ہر طرح کی سختی کا عذر تھا۔ غلاموں کی نسبت ان لوگوں کی "کتابِ اخلاق" کا سرعنوان یہ جملہ تھا کہ "غلام ایک جسم ہے بے روح و بے عقل۔ اور اُس کی زندگی ہمارے ہاتھ میں ہے"۔

۱۷۱۲ء اور ۱۷۴۱ء میں نیویارک میں غلاموں نے انتہائی سختیوں سے تنگ آکر بغاوت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو غلام گرفتار ہو کر آتے تھے یا تو گاڑیوں کے پہیوں کے نیچے دبوا دیے جاتے اور یا زندہ درآتش کردیے جاتے تھے۔

نئے زمانہ میں غلامی کی رسم | غلامی کی رسم اور غلاموں کی تجارت کے باعث یورپین ممالک میں کیسی کیسی قیامت سامانیاں ہوتی تھیں اُس کی داستان کا ایک باب آپ پڑھ چکے ہیں یہ ناتمام رہیگا اگر آپ ذیل میں ایک مقالہ کا اقتباس نہ پڑھینگے جو انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس کے فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے، وہ لکھتا ہے۔

۱۴۴۲ء میں گنزلیس (Ganzales) نے دس غلام پرتگال کے شاہزادہ ہنری کو بطور تحفہ پیش کیے۔ ۱۴۴۳ء میں نُنیز ٹریسٹن Nunez Trestan افریقہ کے لیے ایک مہم پر بحری راستہ سے روانہ ہوا اور چودہ غلاموں کو لے کر واپس آیا۔ افریقہ کے لوگ فطرۃً ان حملوں کو ناپسند کرتے تھے جو اُن کو غلام بنانے کی غرض سے کیے جاتے تھے۔ یورپین تاجر اپنے حملوں کے عذر پیدا کرنے کے لیے اہل افریقہ میں آپس میں جنگ کرا دیتے تھے۔ ۱۵۶۲ء میں سرجان ہاکنگ گونیا کے لیے روانہ ہوا اور تین سو غلام حاصل کیے۔ پھر اُن کو فروخت کر کے انگلینڈ چلا آیا۔ فرانسیسی، اسپینی اور ڈچ ان سب کے ہاں غلاموں کی تجارت کا سلسلہ برابر جاری رہا لیکن انگریزوں کے ہاں اس کا سُراغ چارلس (Charles) کے اُس فرمان تک نہیں ملتا جو اُس نے ۱۶۳۱ء میں افریقہ کمپنی کے نام اس مضمون کا لکھا تھا کہ وہ برطانوی علاقوں کے لیے افریقی غلام مہیا کرے۔ ۱۶۴۳ء میں تیرھویں لوئس نے ایک فرمان اس مضمون کا شائع کیا کہ تمام وہ افریقی جو فرانس کی نوآبادیات میں سکونت رکھتے ہیں بہرحال غلام بنائے جا سکتے ہیں۔ ۱۶۵۵ء میں کرومویل نے جمیکا کو اسپین والوں سے چھینا تو دیکھا کہ وہاں پندرہ سو سفید فام اور اتنے ہی نیگرو غلام موجود ہیں اور خود وہاں کے رہنے والوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ ۱۶۶۲ء میں تیسری افریقہ کمپنی قائم ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی مغرب کی ہندوستانی نوآبادیات میں تین ہزار غلام سالانہ مہیا کیے جائیں۔ ۱۶۷۹ء اور ۱۶۸۹ء کے درمیان صرف

دس برس کی مدت میں کم وبیش ساڑھے چار ہزار غلام ہر سال برطانوی نوآبادیات میں آباد کیے جاتے رہے۔ فرنسس کرونے ۷۔ مارچ ۱۶۸۶ء کو ان غریبوں کی سرگزشت لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ "اس جگہ کی سب سے بڑی تجارت اُن غلاموں کی ہے جن کو یہاں لایا جاتا ہے۔ یہ لوگ یہاں بالکل مادرزاد برہنگی کے ساتھ آتے ہیں اور اُن کے گاہک ان کا مُنہ کھول کھول کر دیکھتے ہیں اور ان کا امتحان گھوڑوں اور چوپاؤں کی طرح کرتے ہیں۔ ۱۷۱۳ء میں انگریزوں اور اسپینیوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اُس کی رُو سے انگلینڈ نے اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ اسپین والوں کو تیس سال تک برابر چار ہزار آٹھ سو غلام سالانہ مہیّا کرتا رہیگا۔ غلاموں کی تجارت سے جو نفع حاصل ہوتا تھا انگلینڈ اور اسپین دونوں کے بادشاہ اُس میں ایک حصّہ کے شریک تھے۔ افریقہ کے غلاموں کی تجارت کا سلسلہ برابر جاری رہا یہاں تک کہ ۱۷۸۸ء میں جب غلامی کے انسداد کے لیے پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا گیا تو اندازہ کیا جاتا ہے کہ اُس وقت افریقہ سے ہر سال دو لاکھ غلام لے جائے جاتے تھے۔ جن میں سے ایک لاکھ امریکہ وغیرہ اور بقیہ افریقہ کے مشرقی ساحل سے ایران اور کچھ تھوڑے سے وسط افریقہ سے ٹرکی اور مصر لیجائے جاتے تھے۔"

غلامی کے لیے اصلاحی کوششیں اور اُس کا انسداد

غلامی کی یہ شرمناک اور خونچکاں داستان آپ نے سُن لی۔ اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ غلامی کا رواج دنیا کی قدیم وجدید ہر قوم اور ہر ملک میں پایا جاتا تھا اور کس قدر بھیانک شکل وصورت کے ساتھ۔ یہ رواج گویا ایک دیوجان شکار وعفریتِ

خون آشام تھا جو اپنا دہن حرص و آز کھولے ہوئے ہر جگہ موجود تھا اور جسے انسانی تہذیب و شرافت کے خون کو قطرہ قطرہ کر کے چوسنے میں شہد و انگبیں کا مزہ ملتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ قومیں جو آج تہذیب و تمدن کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمک رہی ہیں۔ اور جنہوں نے اجتماعی و عمرانی اصول و قوانین کی تہذیب و ترتیب کر کے ازمنۂ قدیمہ کی ترقی یافتہ قوموں کے نقوشہائے عظمت و بزرگی کو اُن کے پسماندہ ماتم گساروں کے الواحِ یاد و ذکر سے مٹانا چاہا ہے وہ خود بھی اس لعنت میں گرفتار تھیں۔ اور اُن کے جیب و دامن کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو اس نجاست و گندگی سے بچا ہوا ہو۔ غلام ان کے یہاں ایک جانور تھا۔ عیش و عشرت کا سامان فخر و غرور کی پونجی، اور راحت و آرام کا مایہ۔ جس طرح انسان جانوروں کا گوشت کھاتا ہے اور نہیں پسیجتا اپنے کام و دہن کی تواضع کے لیے پرندوں کو ذبح کرتا ہے اور شرمندہ نہیں ہوتا، بلکہ سمجھتا ہے کہ اُس نے کوئی ظلم نہیں کیا یہ سب اِسی لیے تھے کہ اُس کو لذت پہنچائیں، اور اُس کے لیے لطف و مسرت کا سامان بنیں۔ ٹھیک اسی طرح یہ "رقصِ بسمل کا تماشا" دیکھنے والی قومیں غلام کو سمجھتی تھیں اور اس کے ساتھ معاملہ کرتی تھیں لیکن انسانی فطرت میں انفعال و تاثر لازماً رکھا گیا ہے۔ ایک انسان خواہ کتنا ہی بڑا سنگدل، بیرحم، اور ظالم ہو۔ اپنی ظالمانہ زندگی کے دردناک واقعات کو یاد کر کے کبھی اُس کی زبان سے بھی ایک آدھ کلمۂ حسرت و افسوس نکل جاتا ہے۔ مظلوم و بے کس غلاموں کی آہیں بالآخر کارگر ہوئیں اور انسانی حرص استعماریت و استبداد کے اِن بے گناہ شکاروں کی چیخ پکار اثر دکھائے بغیر نہ رہی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے وسط میں غلامی کے انسداد اور اُس کے لیے

اصلاحی کوششوں کی آئینی تحریک کا آغاز ہوا اور انجام کار فرانسیسی نوآبادیات میں ۱۸۴۵ء
میں غلامی سے متعلق بعض مفید اصلاحات ہوئیں۔ اور ۱۸۴۸ء میں اس کا بالکل خاتمہ ہی کر دیا
گیا۔ پھر دوسری جگہوں پر اس کی تقلید کی گئی۔ اور ۱۸۶۳ء میں ڈچ کے مغربی جزائر سے اور
۱۸۸۶ء میں کوبا سے اور ۱۸۸۸ء میں برازیل سے۔ اور ۱۸۹۷ء میں زنجبار سے۔ غلامی کو
قطعی طور پر ختم کر دیا گیا لیکن اُنیسویں صدی کے آخر تک بحرِ جنوب کے جزیروں میں کوئنز لینڈ
کے حملہ آور آتے رہے اور لوگوں کو غلام بناتے رہے۔ پھر ۱۸۸۴ء میں یہاں بھی غلامی کا
استیصال کر دیا گیا۔

غلامی اب بھی موجود ہے

غلامی کے انسداد کے لیے دُوَلِ یورپ نے جو مستحسن اقدام کیا ہے وہ بہر حال لائق
ستائش اور قابلِ تعریف ہے۔ لیکن اس کی بنیاد اقتصادی وجوہ پر زیادہ ہے
بہ نسبت اخلاقی وجوہ واسباب کے (اس کی تفصیل آگے معلوم ہوگی) اس لیے سخت افسوس ہے،
کہ اُن غلاموں کی تعداد اب بھی پانچ ملین ہے جو دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔
۱۶ اپریل ۱۹۳۸ء کے اخبار نیشنل کال میں ایک خبر چھپی تھی جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

"جنیوا میں جمعیۃ اقوام کی مشورہ کمیٹی جو چند ممبران پر مشتمل ہے اور جو غلامی کے مسئلہ پر
غور و خوض کرنے کے لیے مقرر کی گئی ہے اُس نے ۳۱ مارچ سے ۱۲ اپریل ۳۸ء
تک برابر اپنے اجلاس کیے ۱۹۳۰ء میں لیگ اسمبلی میں لارڈ سیسل نے برطانوی حکومت
کی نمایندگی کرتے ہوئے فرمایا "کہ دنیا میں اب بھی کم از کم پانچ ملین یعنی پچاس لاکھ غلام
موجود ہیں۔ یہ سب اس کے باوجود ہے کہ ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ اقوام کی مجلس نے یہ اعلان

کیا تھا کہ دستخط کرنیوالی حکومتیں جن کی تعداد ۲۸ تھی اپنے اپنے ماتحت علاقوں میں غلاموں کی
تجارت کو قانون اور حکمت عملی سے کاملاً بالکل ختم کر دیں۔ ان تحریکوں میں بیرونی
کی بڑی بڑی حکومتیں بھی شامل تھیں۔ اس مشورہ کمیٹی کے تقرر سے یہ فائدہ ضرور
ہوا ہے کہ غلام حاصل کرنے کے لیے جو باقاعدہ اور منظم حملے ہوتے تھے وہ رک گئے۔"

غلامی کا ذکر قرآن مجید میں

اُمم قدیمہ میں غلامی کا جو رواج پایا جاتا تھا اُس کی تاریخ زیادہ طویل ہوگئی لیکن ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ اس کے بغیر آپ غلاموں کی نسبت اسلامی مراعات و تعلیمات کی اہمیت کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اب جبکہ آپ کو یہ معلوم ہوگیا کہ غلامی دنیا کی ہر قوم میں پائی جاتی تھی۔ اور کس کس شکل و صورت سے۔ اتنا کہاں کہاں غلاموں کے حقوق کیا تھے اور ان کے ساتھ معاملہ کیا کیا جاتا تھا۔ اور پھر یہ بھی دیکھ لیا کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کی وجہ سے جب ان قوموں نے غلاموں کے متعلق اصلاحی کوششیں شروع کیں تو اس سلسلہ میں کہاں تک جا سکے اور یہ اصلاحات کتنے دنوں میں ظہور پذیر ہوئیں تو اب وقت آگیا ہے کہ کتاب کے اصل موضوع بحث سے متعلق کچھ کہا جائے۔

کیا غلام بنانے کا ذکر قرآن میں ہے؟

اسلام کا سب سے بڑا مستند اور جامع دستور العمل قرآن مجید ہے۔ اس لیے ہم کو سب سے پہلے اسی میں تلاش کرنا چاہیے کہ "استرقاق" یعنی غلام بنانے کے جواز کا کہیں ذکر موجود ہے یا نہیں۔ غور کرنے اور جستجوئے عمیق سے کام لینے کے بعد یہ واضح

ہو جاتا ہے کہ تمام قرآن میں کہیں غلام بنانے کا ذکر نہیں ہے۔ متعدد مواقع پر باندیوں اور غلاموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اُن کے آزاد کرنے کا حکم بھی کئی ایک جگہ ہے، غلام اُن لوگوں کو بنایا جاتا ہے جو جنگ میں گرفتار ہوں۔ قرآن مجید میں اِن اسیرانِ حرب کا ذکر بھی کئی مقام پر آیا ہے، اور اُن کی نسبت بعض احکام بھی بتائے گئے ہیں لیکن ان سب میں کہیں کسی موقعہ پر کسی عنوان اور کسی ادائے بیان کے ساتھ غلام بنانے کا ذکر صراحۃً نہیں ہے۔

جنگ کے اکثر و بیشتر احکام سورۂ انفال میں مذکور ہیں لیکن گرفتارانِ جنگ کی نسبت ایک موقعہ پر صرف یہ ارشاد ہوتا ہے:-

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى — نبی کو نہیں چاہیے کہ اپنے ہاں رکھے قیدیوں کو

حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ — جب تک خوب خونریزی نہ کرلے[1]۔

بدر کا واقعہ — عام اربابِ تفسیر لکھتے ہیں کہ یہ آیت واقعۂ بدر سے متعلق ہے، اور اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ بدر میں جو کافر مسلمانوں کے ہاتھ آئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی نسبت اپنے اصحاب سے مشورہ کیا تو حضرتِ عمر نے فرمایا کہ ان سب کو قتل کردینا چاہیے۔ کیونکہ یہ سب اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں۔ حضرت ابوبکر نے مشورہ دیا کہ ان کو معاف کردینا چاہیے کہ آپ (آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام) بڑے مہربان اور کریم النفس ہیں۔ کسی نے فرطِ غیظ و غضب سے صلاح دی کہ ان کو جلا ڈالنا چاہیے لیکن رحمت عالم نے حضرت ابوبکر کے مشورہ پر ہی عمل فرمایا۔ اور اسیران بدر میں سے بعض کو معاوضہ لے کر اور

---

[1] ترجمہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ۔

بعض کو بغیر معاوضہ کے ہی رہا کر دیا۔ آپ نے اس وقت اسیرانِ جنگ کے ساتھ جو معاملہ کیا ہر چند کہ وہ آپ کی طبعی نرمی و رافت، اور ذاتی حلم و عفو پر مبنی تھا لیکن عام ملکی اور سیاسی حالات اس فیصلہ کا اقتضاء نہ کرتے تھے۔ اس لیے آیتِ بالا کے ذریعہ یک گونہ عتاب کا اظہار فرمایا گیا۔[1] جس کا منشا یہ ہے کہ جب تک نبی کو زمین پر غلبہ حاصل نہ ہو جائے اُس کو یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے پاس قیدیوں کو زندہ رکھے۔

اس آیت سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ غلبہ حاصل نہ ہونے تک مسلمانوں کو فدیہ لے کر یا بغیر فدیہ اسیرانِ جنگ کو رہا کرنے کے قصہ میں نہیں پڑنا چاہیے۔ بلکہ قتل و قتال اور جنگ و جدال کو برابر جاری رکھنا چاہیے۔ اب رہا یہ سوال کہ اچھا اگر مسلمان معرکۂ جنگ میں فتحیاب ہو جائیں تو اُس وقت قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کریں؟ ظاہر ہے کہ یہ آیت اس سوال کے جواب سے بالکل خاموش ہے۔

اسی سورت میں ذرا اور آگے چل کر فرمایا گیا ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ	اے نبی آپ کے قبضہ میں جو قیدی ہیں اُن سے کہہ دیجیے
مِنَ الْأَسْرَىٰ إن يعلم الله فِيكُمْ	کہ اگر اللہ نے تم میں بھلائی معلوم کی تو وہ تم کو اُس سے بہتر

---

[1] اس کے برخلاف بعض علماء کا خیال ہے کہ عتاب اسیروں سے فدیہ لینے پر نہ تھا بلکہ اس بنا پر تھا کہ حکم خداوندی کے قبل مسلمانوں نے مالِ غنیمت لوٹنا شروع کر دیا۔ امام ترمذی نے اپنی جامع میں، امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں اور امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں یہ روایت نقل کی ہے:۔

فلما كان يوم بدر وقعوا في الغنائم قبل ان تحل لهم فأنزل الله لولا كتاب من الله سبق لمسكم فيما أخذتم عذاب عظيم.	جب بدر کا معرکہ ہوا تو مسلمان غنیمت کے حلال ہونے سے پہلے اُس پر ٹوٹ پڑے۔ اس پر یہ آیت اتری: 'لَوْلَا كِتَابٌ ا...'

خيرا يُّؤتِكُم خيرًا مِّمَّا اُخِذَ مِنكُمْ — دیگا جو تم سے لیا گیا ہے۔

یہ آیت بھی بدر کے اسیرانِ جنگ سے متعلق ہے۔ اور "مَا اُخِذَ مِنْكُمْ" سے مراد فدیہ ہے۔[1]
اس آیت سے بھی معلوم نہیں ہوتا کہ جنگ کے گرفتار شدہ لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔

سورۂ محمد کی آیت — البتہ سورۂ محمد میں ایک آیت ہے جس سے صاف طور پر اس سوال کا جواب دستیاب ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔

فَاِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰى اِذَا اَثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا۔ — سو جب تم مقابل ہو منکروں کے تو مارو گردنیں یہاں تک کہ جب خوب قتل کر چکو ان کو تو مضبوط باندھو قید پھر یا احسان کیجیو اور یا معاوضہ لیجیو جب تک کہ رکھ دے لڑائی اپنے ہتھیار۔[2]

اس آیت کا مطلب ظاہر ہے کہ اسیروں کے ساتھ صرف دو ہی قسم کا معاملہ ہو سکتا ہے۔ ان کو فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے، یا اس کے بغیر ہی انہیں آزادی دی جائے۔

آیت من و فدا سے متعلق بحث — لیکن حیرت کا مقام ہے کہ اس آیت کے متعلق مفسرین بہت مختلف ہیں۔ ایک گروہ تو اسی بات کا قائل ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور سورۂ براۃ کی وہ آیۃ جس میں مشرکین کے قتل عام کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے لیے ناسخ ہے۔[3] سدی، ابن جریج اور قتادہ ان سب کی رائے یہی ہے۔[4]

---

[1] تفسیر روح المعانی سورہ انفال۔ [2] ترجمہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ۔
[3] وہ آیۃ یہ ہے: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ الآیۃ [4] احکام القرآن ابوبکر جصاص ج ۳ ص ۳۹۳

لیکن اکثر علماء کا خیال ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ قطعی اور ثابت ہے اور اس میں جو حکم دیا گیا ہے وہ اُس موقع کے لیے ہے جبکہ مسلمانوں کو فتح تام حاصل ہو جائے اور وہ اپنے دشمنوں کی جانب سے بالکل محفوظ اور مامون ہو جائیں۔ چنانچہ آیت کا ابتدائی حصہ حَتّٰى اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ رہی سورۂ برارت کی وہ آیت جس میں مشرکوں کے متعلق حکم دیا گیا ہے کہ جہاں کہیں ملیں قتل کر دیے جائیں اُس وقت کے لیے ہے جبکہ جنگ ہو رہی ہو، اور مسلمانوں کو دشمنوں کی طرف سے اطمینان کلی حاصل نہ ہوا ہو۔

جنگ اور اُس کے احکام کے سلسلہ میں جتنی آیات ہیں ان سب پر ایک مجموعی نظر ڈالنے سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی آیت کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہے بلکہ دورانِ جنگ میں اور اُس کے بعد مختلف قسم کے حالات پیش آتے ہیں اور سیاسی تدبّر کا اقتضا رہوتا ہے کہ ہر موقعہ پر وہی کارروائی کی جائے جو وہاں کے مناسب اور لائق ہو۔ جو مفسرین من و فدا کی آیت کو منسوخ قرار دیتے ہیں اُنھوں نے درحقیقت تصویر کے صرف ایک رُخ کو دیکھا ہے۔ اور اُن کا خیال ہے کہ یہ آیت جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض قیدیوں کو معاوضہ لے کر اور بعض کو بغیر معاوضہ ہی رہا کر دیا تھا لیکن حق یہ ہی ہے کہ اس آیت کے منسوخ ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اسیرانِ جنگ سے متعلق سورۂ محمد میں صراحۃً اور سورۂ انفال میں اشارۃً جو حکم بیان کیا گیا ہے اُس کو پیش نظر رکھو۔ اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد صحابہ کے تعامل پر غور کرو تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے پر بالکل منطبق ہیں۔ اور ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت میں امام کو اختیار

دیا گیا ہے کہ حسب مصلحت و موقع قیدیوں کے ساتھ جو معاملہ مناسب ہو اُس کو اختیار کرے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں ثمامہ بن آثال کا واقعہ نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں :-

فکان فی ذٰلك تقویۃ لقول الجمھور ان الامر فی اسرٰی الکفرۃ من الرجال الی الامام یفعل ماھو الاحظ للاسلام والمسلمین[1]

ثمامہ کے واقعہ سے جمہور کے اس قول کو قوت پہنچتی ہے کہ کفار کے مرد قیدیوں سے متعلق امام کو اختیار رہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے جو معاملہ زیادہ بہتر ہو کرے

پھر سورۂ انفال کی آیت ما کان لنبیٍ ان یکون الاٰیۃ کی تفسیر کے ماتحت اسیرانِ جنگ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف معاملوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں

فدلّ کُلُّ ذٰلِكَ علی ترجیح قول الجمھور انّ ذٰلك راجعٌ الی رای الامام ومحصل احوالھم تخییرُ الامام بعد الاسرین ضرب الجزیۃ لمن شرع اخذھا منہ او القتل او الاسترقاق او المنّ بلاعوض او بعوضٍ[2]

پس یہ سب قولِ جمہور کے قابل ترجیح ہونے پر دلالت کرتا ہے کہ قیدیوں کے ساتھ معاملہ کرنا امام کی رائے پر محمول ہے اور اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ گرفتار کرنے کے بعد امام کو اختیار ہے کہ اُن لوگوں پر جزیہ مقرر کرے جن سے جزیہ کا لینا مشروع ہے۔ یا قتل کرے یا غلام بنائے اور یا عوض لے کر یا بغیر معاوضہ ہی اُن کی جان بخشی کردے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ نے اپنے نبی اور مومنین کو اختیار

---

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۱۱۴۔ [2] فتح الباری جلد ۶ ص ۱۱۵۔

دیا ہے کہ وہ چاہیں تو جنگ کے گرفتار شدہ لوگوں کو قتل کر دیں۔ چاہیں تو غلام بنالیں اور اگر مناسب ہو تو اُن کو فدیہ لے کر آزاد کر دیں[1]۔

عام کتابوں میں لکھتے ہیں کہ حنفیہ آیت من و فدا کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں لیکن اجلّۂ احناف کی تصنیفات سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کی طرف یہ قول منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔

علامہ محمود آلوسی صاحب روح المعانی جو پکّے حنفی ہیں فرماتے ہیں:۔

"قیدیوں کی نسبت اختلاف ہے اکثر علماء کا خیال ہے کہ امام کو اختیار رہے اگر چاہے تو قتل کر دے، بشرطیکہ اسلام نہ لائے ہوں۔ کیونکہ آنحضرت صلعم نے عقبہ بن ابی معیط، طعیمہ بن عدی۔ اور نضر بن حارث (جس کے متعلق اُس کی بہن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے چند دلدوز اشعار پڑھے تھے اور اُن میں ایک شعر یہ تھا۔

مَا کَانَ ضَرَّكَ لَوْ مَنَنْتَ وَرُبَّمَا مَنَّ الْفَتٰی وَھُوَ الْمَغِیظُ الْمُحْنَقُ

ان تینوں کو قتل کیا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں ان کے شر و فساد کا قلع و قمع کر دینا ہے اور اگر منشا ہو تو اُن کو غلام بنالے۔ اور اگر مناسب ہو تو اُن کو ذمی کر لے۔ جیسا کہ حضرت عمر نے اہل سواد کے ساتھ کیا تھا[2]۔

بدائع الصنائع میں صاف طور پر مذکور ہے

واما الرقاب فالامام فیھا بین خیارات ثلاث[3] رہے اسیران جنگ تو امام کو اُن کے ساتھ تینوں طرح کا معاملہ کرنے کا اختیار ہے۔

---

[1] فتح البیان جلد ۹ صفحہ ۵۔ [2] تفسیر روح المعانی جلد ۲۶ صفحہ ۳۶-۳۷۔ [3] ج ۷، ص ۱۱۹

یہ کہنا کہ آیت من وفدا منسوخ ہے اور اس بنا پر سورۂ برأت کی آیت کے بحکم اسیرانِ جنگ کے لیے صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ اسلام لائیں، یا قتل کر دیے جائیں، قرآنِ مجید کی دو مختلف آیتوں میں تطبیق پیدا نہ کر سکنے پر مبنی ہے، ورنہ اگر ذرا تامل سے کام لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ان آیات میں باہمی کوئی تعارض ہے ہی نہیں۔ بلکہ دونوں کا مصداق الگ الگ ہے۔

علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں۔

"سورہ براءۃ میں جو کچھ ہے وہ ان لوگوں کے متعلق ہے جو گرفتار نہ ہوئے ہوں۔ کیونکہ گرفتار شدہ لوگوں کو غلام بنانا بھی جائز ہے، اور سورۂ براءۃ کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بجز قتل کرنے کے کوئی اور چارہ ہی نہیں ہے۔ اور رہا استرقاق کے جواز کا حکم، تو وہ بھی علی الاطلاق نہیں کیونکہ معلوم ہے کہ مشرکین عرب کا استرقاق جائز نہیں۔"[1]

اسی آیت کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس کا ایک اور مقولہ ہے کہ جب مسلمان بہت ہو گئے اور ان کی طاقت بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے قیدیوں کے متعلق یہ حکم نازل کیا کہ "فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً" حضرت ابن عباس کے اس قول کو صاحب معالم التنزیل نے "اصح" اور صاحب خازن نے "وھو الصحیح" کہا ہے۔

سورۂ انفال کی آیت حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ کے ختم پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ" قاضی بیضاوی حکیم کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

یعلم ما یلیق بکل حال ویخصہ بھا کما أمر — اللہ تعالیٰ اُس چیز کو جانتا ہے جو کسی حال کے لائق ہوتی ہے

---

[1] میں نے یہ قول ... المعانی جلد ... سے لیا ہے۔

بالاثخان ومنع عن الافتداء حین کانت الشوکۃ للمشرکین وخیّر بینہ وبین المنّ لما تحوّلت الحال وصارت الغلبۃ للمؤمنین	اور اس چیز کو اس حال کے ساتھ مختص کردیا ہے جیسا کہ جب مشرکوں کو شوکت حاصل تھی تو اس نے زمین پر غلبہ پانے کا حکم دیا اور فدیہ قبول کرنے سے منع کیا پھر جب حال بدل گیا اور غلبہ مومنین کو حاصل ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے
(تفسیر بیضاوی ص ۱۸۶ مطبوعہ مصر)	قتل اور جان بخشی دونوں کے درمیان اختیار دیا۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے ایک مرتبہ ایک ولد الزنا کو آزاد کیا اور فرمایا کہ خدا نے تو ہم کو ان لوگوں پر بھی احسان کرنے کا حکم فرمایا ہے جو ان سے زیادہ شر انگیز اور فسادی ہیں۔ اور پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً [1]

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ابن جریر اور ابن مردویہ نے بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے کہا کہ فلاں قیدی کو قتل کردو۔ آپ نے فرمایا "اللہ نے ہم کو اس کی اجازت نہیں دی ہے۔ اسیران جنگ کے متعلق ہم کو صرف یہ بتایا گیا ہے کہ ان کو چاہیں تو بطریق احسان چھوڑ دیں اور یا فدیہ لے کر انہیں رہا کردیں" اس کے بعد آپ نے وہی آیت من و فدا، تلاوت کی۔

فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شہر میں داخل ہوئے تو فوج میں اعلان عام کرادیا:۔

لا تجھزنّ علٰی جریحٍ ولا یتّبعنّ مدبرٌ	کسی زخمی پر حملہ نہ کرو، کسی بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے

---

[1] فتح الباری باب عتق المدبر وام الولد بسندٍ صحیح عن ابن ابی شیبۃ والبیہقی۔

لا یُقْتَلَنَّ اَسِیْرٌ وَّ مَنْ اَغْلَقَ بَابَہٗ فھو اٰمِنٌ [1] | کسی اسیر کو قتل نہ کیا جائے، اور جس نے اپنا دروازہ بند کر لیا ہو وہ مامون ہے۔

اب بتاؤ اگر بدقسمت قیدی کے لیے من و فدا کی کوئی صورت، اور اس کے لیے اسلام یا قتل کے سوا کوئی اور راہ ہے ہی نہیں تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان اور حضرت ابن عمر کے اس فعل کی کیا توجیہہ کی جائیگی۔ حافظ ابوبکر جصاص الحنفی نے ان مختلف آیات کی تطبیق کرتے ہوئے لکھا ہے :-

اما قولہ فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب وقولہ ما کان لنبی ان یکون لہ اسریٰ حتیٰ یثخن فی الارض وقولہٗ فاما تثقفنھم فی الحرب فشرد بھم من خلفھم فانہٗ جائز ان یکون حکما ثابتا غیر منسوخ وذلك لان اللہ تعالیٰ امر نبیہٗ صلی اللہ علیہ وسلم بالاثخان بالقتل وحظر علیہ الاسر الا بعد اذلال المشرکین وقمعھم وکان ذلك فی قلۃ عدد المسلمین وکثرۃ عدد

اللہ تعالیٰ کا قول کہ جب تم کفار سے لڑو تو اُن کی گردنیں مارو اور اُس کا قول کہ نبی کو نہ چاہیے کہ اپنے پاس قیدی رکھے یہاں تک کہ وہ زمین میں غلبہ حاصل کرلے۔ اور اُس کا قول کہ اگر کبھی تو پائے اُن کو لڑائی میں تو اُن کو ایسی سزا دے کہ اُن کے پچھلے بھاگ جائیں اُن کو دیکھ کر تو جائز ہو کہ یہ حکم ثابت اور غیر منسوخ ہو۔ اور وہ اس طرح پر کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نبی کو حکم دیا ہے کہ خوب زمین پر غلبہ حاصل کرو اور مشرکین کو ذلیل کرو۔ اور یہ حکم مسلمانوں کی قلت اور مشرکوں کے ساز و سامان اور اُن کے آدمیوں کی کثرت کے وقت تھا پھر جب مشرکین مغلوب ہوگئے اور قتل و قتال سے ذلیل ہوگئے

[1] فتوح البلدان علامہ بلاذری ص ۴۷۔

عددهم من المشركين فمتى أثخن المشركون واذلّوا بالقتل والتشريد جاز الاستبقاء فالواجب ان يكون هذا حكمًا ثابتًا اذا وجد مثل الحال التي كان عليها المسلمون في اول الاسلام

تو اب اُن کا زندہ چھوڑ دینا جائز ہو گیا پس واجب ہے کہ یہ حکم ثابت ہو جبکہ مسلمانوں کے لیے وہی حال پایا جائے جو اول اسلام میں تھا۔

(احکام القرآن جلد ۳ ص ۴۸۱)

الغرض سورۂ انفال، سورۂ براءۃ اور سورۂ محمد اِن تینوں سورتوں کی آیات ایک دوسری سے متعارض نہیں ہیں کسی ایک کو دوسرے کے لیے ناسخ کہا جائے بلکہ ان میں سے ہر ایک کا محل جُدا جُدا ہے، اور ان میں جنگ سے قبل، اور جنگ کے درمیان، اور جنگ کے اختتام کے مختلف احوال و قواعد بیان کیے گئے ہیں۔ ان سب کو کسی ایک ہی وقت کے احکام سمجھنا اور پھر خواہ مخواہ تعارض مان کر نسخ کا قائل ہونا قرآن مجید کے تنوع احکام کے خلاف ہے، جو اس جیسی ہمہ گیر کتابِ الٰہی کے لیے از حد ضروری ہے۔

سورۂ انفال کی آیت کا منشا یہ ہے کہ جب تک مسلمانوں کو جنگ میں مکمل غلبہ حاصل نہ ہو جائے، اُن کو کسی منفعت دنیوی کے خیال سے قتل و قتال سے باز نہ رہنا چاہیے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمان کو امن کے وقت پیکر امن و امان ہونا چاہیے لیکن اگر مغرور و سرکش دشمنوں کے ساتھ جنگ ناگزیر ہو جائے تو پھر اس کو اُس وقت تک دم نہ لینا چاہیے جب تک شر و فساد کا استیصال کلی نہ ہو جائے اور جب تک کفر و باطل کی طاغوتی قوتیں مکمل طور پر شکست خوردہ و ہزیمت یافتہ نہ ہو جائیں۔

اس کے بعد دوسری حالت ہے اختتام جنگ کی یعنی جنگ ختم ہوگئی مسلمانوں نے معرکۂ حرب کو فتح کرلیا۔ شرک ذلیل اور ایمان و اسلام سربلند و سرفراز ہوگیا۔ جن کے مقدر میں مسلمانوں کی شمشیر کفر شکن کے ہاتھوں لقمۂ اجل بننا تھا وہ سب کے سب قتل کردیے گئے۔ اب جو لوگ کہ مسلمانوں کے ہاتھ قید ہوئے ہیں، سوال ہوتا ہے کہ اُن کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ تو سورۂ محمد کی آیت فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً اس کا جواب دیتی ہے۔ اور بتاتی ہے کہ اسیرانِ حرب کے ساتھ اس قسم کے معاملات کیے جاسکتے ہیں۔

اب رہی سورۂ براۃ کی آیت :۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ الآیہ

پھر جب گذر جائیں مہینے پناہ کے تو مارو مشرکوں کو جہاں پاؤ اور پکڑو اور گھیرو اور بیٹھو ہر جگہ اُن کی تاک میں[1]۔

تو اگرچہ ارباب تفسیر کے ارشاد کے مطابق یہ سلسلۂ قتال کی آخری آیت ہے لیکن پھر بھی اس کو کسی دوسری آیت کے ساتھ تعارض نہیں ہے۔ بلکہ اس کا محمل ان سب سے جُدا اور الگ ہے۔ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ مشاعر حرام کو مشرکین کے وجود نامسعود سے بالکل پاک و صاف ہونا چاہیے۔ وہ اگر یہاں رہنا چاہتے ہیں تو مسلمان ہوکر رہیں۔ جیسا کہ آیت کے اس ٹکڑے سے ثابت ہوتا ہے :۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ اگر یہ توبہ کرلیں، نماز قائم کرنے لگیں اور زکوٰۃ ادا کرنی شروع

---

[1] ترجمہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ۔

فخلوا سبیلھم — کر دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو

رمز شناسانِ بلاغت جانتے ہیں کہ فخلوا سبیلھم اور آیت کا اخیر ٹکڑہ یعنی اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ اس بات پر صاف، دلالت کر رہا ہے کہ یہ آیت کسی جنگ سے متعلق نہیں ہے بلکہ بحالتِ امن مشرکین سے کسی شے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اور فرمایا جاتا ہے کہ اگر مشرکین تمہارے اس مطالبہ کو پورا کر دیں تو خیر فخلوا سبیلھم ان کو ان کے حال پر رہنے دو یعنی مکہ میں انہیں قیام کی اجازت دیدو ورنہ بزورِ شمشیر ان سے اپنا مطالبہ پورا کراؤ۔ اور چونکہ آیت کا مقصد مکہ معظمہ سے ان مشرکین کا اخراج ہے اس لیے بتاکید فرمایا کہ دیکھو ان میں کا کوئی فرد کہیں ڈھکا چھپا نہ رہ جائے۔ ان کی خوب جستجو کرو واحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ان کی تاک میں ہر جگہ بیٹھو۔ غرض کہ اس آیت کا منشا مشرکین سے اپنا ایک مخصوص مطالبہ منوانا ہے اور بس۔ نہ تو یہ آیت تمام مشرکین کے لیے ہے، اور نہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مشرکین کے لیے صرف دو راہیں ہیں۔ اسلام قبول کریں یا قتل ہونا گوارا کریں۔

اس آیت کا سیاق یعنی اس سے قبل کی آیات دیکھیے تو معاملہ بالکل واضح ہو جاتا ہے اور یہ سب آیتیں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ۹ھ میں حضرت ابوبکر نے چند اشخاص کو اس لیے منیٰ بھیجا کہ وہ وہاں یوم النحر میں اس بات کا اعلان کر دیں۔

لا یحج بعد العام مشرک ولا یطوف بالبیت عریان — اس سال کے بعد نہ تو کوئی مشرک حج کرے اور نہ کوئی برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرے۔

اِن حضرات کی روانگی کے بعد ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پیچھے پیچھے حضرت علی کو بھیجا اور حکم دیا کہ وہ سورۂ براءۃ کا اعلان کردیں۔ ابو ہریرہ فرماتے ہیں "چنانچہ حضرت علی نے ہم لوگوں کے ساتھ سورۂ براۃ کا اعلانِ عام کیا، اور فرمایا کہ آئندہ سال کوئی مشرک حج نہ کرے اور کعبہ کا طواف بحالتِ برہنگی نہ کیا جائے[1]۔

محدثین اس ہیں مختلف ہیں کہ کُل سورۂ براءۃ کا اعلان کیا گیا تھا یا کسی جزء کا۔

حافظ ابنِ حجر فرماتے ہیں :-

وانما امر بتبلیغ منها اوائلها فقط[2] آنحضرت نے سورۂ برات کی صرف پہلی آیتوں کی تبلیغ کا حکم فرمایا تھا اگر اوائلِ سورت کی تبلیغ ہی کا حکم دیا گیا تھا تب بھی اب یہ بات تو بالکل واضح ہوگئی کہ آیہ فاذا انسلخ الاشهر الحرم الآیۃ اُنہی آیات کے سلسلہ میں ہے جن کی تبلیغ کا حضور نے امر فرمایا تھا اور اُن سے الگ کوئی حکم عام نہیں ہے۔ امام احمد اور نسائی نے جو روایت محرز بن ابی ہریرہ سے بیان کی ہے اُس میں حضرت ابی ہریرہ بالکل صاف لفظوں میں فرماتے ہیں

فکنا ننادی ان لا یدخل الجنۃ الا نفس مسلمۃ ولا یطوف بالبیت عریان ومن کان بینہ وبین رسول اللہ عهد فاجلہ اربعۃ اشهر فاذا مضت فان اللہ بریٔ من المشرکین ورسولہ ولا یحج بعد العام مشرک[3]

ہم اس بات کا اعلان کرتے پھرتے تھے کہ جنت میں سوائے نفس مسلمہ کے کوئی اور داخل نہیں ہوگا۔ اور کعبہ کا طواف کوئی برہنہ ہوکر نہ کرے۔ اور جن لوگوں میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں معاہدہ ہو چکا ہے اُسکی مدت کل چار ماہ ہے جب یہ گذر جائیں گے تو اللہ اور اُس کا رسول اہلِ شرک سے بری ہیں۔ اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کر سکیگا۔

---

[1] بخاری تفسیر سورۂ براۃ [2] فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۲۵۸ [3] فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۲۵۸

اب اس روایت کی روشنی میں اس آیت کو پڑھیے تو صاف عیاں ہوتا ہے کہ اس آیت کا تعلق عام جدال وقتال سے ہے ہی نہیں۔ بلکہ اس کی غرض مکہ کی مشرکین سے تطہیر ہے۔ اس کے برخلاف اگر اس حکم کو عام مانا جائے اور جیسا کہ بعض علماء فرماتے ہیں یہ کہا جائے کہ مشرکین کے لیے بجز اسلام یا قتل کے کوئی اور چارہ ہی نہیں ہے اور اس نے صلح و ملاطفت کی تمام آیتوں کو منسوخ کر دیا ہے تو غور کیجیے کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد صحابۂ کرام کا تعامل یہی تھا کہ مشرک جہاں کہیں ملا قتل کر دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک آیت من وفدا کیا! ذیل کی تمام آیات بھی یک قلم منسوخ ہو گئی ہوتیں۔

١۔ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا — اگر وہ صلح پر آمادہ ہوں تو آپ بھی صلح کر لیں۔

٢۔ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُسَيْطِرٍ — آپ اُن کے اجارہ دار نہیں ہیں۔

٣۔ وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ — آپ لوگوں پر زبردستی کرنے والے نہیں ہیں۔

٤۔ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ — آپ اُن کو معاف کر دیجیے اور چشم پوشی کیجیے

ابن بریدہ اپنے والدِ ماجد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ جب کسی ایک دستۂ فوج کو مشرکین سے جنگ کرنے کے لیے بھیجتے تھے تو اُس کو یہ ہدایت فرماتے تھے کہ "جب تم مشرکین سے ملو تو اُن کو اسلام کی دعوت دو۔ اگر وہ انکار کریں تو کہو کہ جزیہ ادا کرنے پر رضامند ہو جاؤ۔ وہ اس کو مان لیں تو اُن سے جزیہ لو، اور اپنے ہاتھوں کو اُن سے باز رکھو۔"[1] کہا جا سکتا ہے کہ مشرکین کا لفظ عام ہے۔ پھر اُس میں تخصیص کی دلیل کیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ

[1] بحوالہ احکام القرآن ج ٣ ص ١٠٠۔

فاذا انسلخ میں فا تفریع کے لیے ہے اس بنا پر یہ آیت ماقبل کی آیت سے بے تعلق نہیں ہو سکتی اور آیت ماقبل میں مشرکین کی صفت الذین عاھدتم لائی گئی ہے یعنی وہ مشرک جن سے مسلمانوں نے معاہدہ کیا تھا پس معلوم ہوا کہ آیت زیر بحث میں جو مشرکین کا لفظ ہے اُس سے مراد نہ عرب و عجم کے تمام مشرک ہیں اور نہ فقط عرب کے تمام۔ بلکہ صرف وہی لوگ مراد ہیں جن سے مسلمانوں کا معاہدہ ہوا تھا یعنی مشرکین مکّہ۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ سورۂ برأت میں جو حکم ہے وہ اُس حکم سے قطعاً متصادم نہیں۔ جو سورۂ محمد میں اسیرانِ جنگ کی نسبت ارشاد فرمایا گیا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تمام قرآن مجید میں اسیروں کے ساتھ معاملہ کرنے کی ہدایت جس آیت میں ہے وہ صرف سورۂ محمد کی آیت منّ و فدا ہے۔ اور وہ ثابت غیر منسوخ ہے۔

اسلام میں غلامی | اسلام کے بعض نادان دوستوں نے یہ دیکھ کر کہ قرآن مجید میں باندی غلام بنانے کا ذکر کہیں صراحۃً نہیں ہوا اور اِمّا کلمۂ حصر کی وجہ سے اسیران جنگ کے معاملہ کو صرف منّ و فدا کی دو صورتوں میں محدود کر دیا گیا ہے یہ دعویٰ کیا کہ اسلام میں باندی غلام بنانا جائز ہی نہیں ہے ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ اسلام کے مسائل و شرائع کے حسن و قبح کو غیر مسلم اقوام نے معیار تہذیب و تمدن پر پرکھتے ہیں ان کی آنکھوں پر تقلید فرنگ کی ایک ایسی عینک لگی ہوئی ہے جس کے رنگین شیشوں میں انہیں اسلامی مسائل کی اصل حقیقت نظر نہیں آتی تو وہ کوشش کرتے ہیں کہ غیر واقعی چیز کو واقعی کرکے دکھائیں۔ حالانکہ انہیں سمجھنا چاہیے کہ اسلام کے حقائق ازلی اور ابدی ہیں۔ زمان و مکان کے اثرات اور کسی ملک کی تہذیب و تمدن کے تغیرات سے بلند و بالا۔ ابھی کچھ مدت کی بات ہے کہ یورپ

طلاق کا مذاق اُڑاتا تھا۔ اور تعدد ازدواج کے جواز پر طعن دیتا تھا لیکن زمانہ نے دیکھ لیا کہ اب اسی یورپ نے طلاق کو قانونی حیثیت دی ہے، اسلام نے بیوہ عورتوں کے نکاح کو نہ صرف جائز کہا بلکہ اُس کو مستحسن اور کارِ ثواب قرار دیا۔ ہندوؤں نے اس پر اپنے مذہبی عقائد کی بنا پر لعن وطعن کیا۔ اور مسلمانوں کو بُرا بھلا کہا، لیکن دنیا جانتی ہے کہ اب وہی ہندو عقد بیوگاں کا مسودۂ قانون بعض ریاستوں میں پاس کرا چکے ہیں، اور اُس کو سماجی اصلاح کا ایک اہم جزء قرار دے رہے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے متعدد واقعات ہیں جو اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ اسلامی مسائل کو کبھی کسی غیر مسلم قوم خواہ وہ دنیوی نقطۂ نظر سے کتنی ہی ترقی یافتہ ہو اُس کی تہذیب وتمدن کی کسوٹی پر نہ پرکھنا، اور ردوقبول کے لیے اُس کو معیار نہ بنانا چاہیے، بلکہ تمام خارجی تاثرات سے خالی ہوکر یہ معلوم کرنا چاہیے کہ درحقیقت یہ اسلام کی تعلیم ہے بھی یا نہیں۔

یہی غلامی کا مسئلہ لیجیے، صدیاں گزر گئیں، اس اثناء میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں اور مٹ گئیں۔ بڑے بڑے فلاسفہ پیدا ہوئے اور فنا ہوگئے لیکن غلام بنانے کے مسئلہ پر کبھی کسی نے توجہ نہیں کی۔ اور جوازِ استرقاق کی بناء پر کسی نے اسلام کو مطعون نہیں کیا۔ انیسویں صدی کے عیسائی مصنفین نے اس پر زبانِ ملامت کھولی تو اس وضع وقماش کے بعض بزرگ اُٹھے اور اُنھوں نے سیلابِ مخالفت کے ڈر سے اپنی عمارت کو مضبوط بنانے میں قوت صرف کرنے کے بجائے سرے سے اصل عمارت پر ہی کدال چلانی شروع کردی کہ نہ اصل عمارت ہوگی اور نہ سیلِ مخالفت کی کوئی موج اُس کو نقصان پہنچا سکیگی۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن مجید میں غلام بنانے کے جواز کا ذکر کہیں نہیں ہے۔ لیکن یہ

"ی ظاہر ہے کہ کہیں "استرقاق" کی ممانعت بھی نہیں کی گئی ہے یعنی قرآن اس معاملہ میں ساکت ہے۔ باندی غلام بنانے کے متعلق نفیاً یا اثباتاً اُس میں کوئی صراحت نہیں۔ اس کے بعد احادیث نبویہ اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کیجیے تو ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں باندی غلام بنانا جائز ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اسیرانِ جنگ مردوں کو غلام، اور عورتوں کو باندی قرار دیا ہے۔ تاریخ و حدیث میں باندی غلام کا ذکر اس کثرت سے آیا ہے کہ اس سے انکار بہت مشکل۔ جن طریقوں سے یہ روایتیں ہم تک پہنچی ہیں اگر اُن کو ناقابل پذیرائی قرار دے دیا جائے تو پھر اُن روایتوں کے قبول کرنے کے لیے یہ طریقے کیونکر کافی ہونگے جن کو ہم قبول کیے بغیر رہ نہیں سکتے۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً میں جو لفظ اِمَّا آیا ہے کلمہ حصر ہے اور وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسیرانِ جنگ کے ساتھ صرف دو ہی قسم کا معاملہ ہو سکتا ہے، فدیہ لے کر چھوڑ دیے جائیں یا بغیر فدیہ ہی اُن کو رہا کر دیا جائے۔ ان دو کے علاوہ استرقاق یا قتل ان میں سے کسی طرح کا اسیر کے ساتھ معاملہ کرنا قرآن مجید کے حکم کے خلاف ہے اور کلمہ حصر "اِمَّا" کے مدلول کو فوت کر دیتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ کسی چیز سے متعلق جب کوئی حکم دیا جاتا ہے تو اُس کی حیثیتیں دو ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ حکم عام ہے، بہت ساری اشیاء کو شامل ہے اور چونکہ وہ چیز اُن اشیاء میں سے ایک ہے اس لیے وہ حکم اس کو بھی شامل ہو گا۔ دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ حکم عام نہ ہو بلکہ خاص ہو۔ اور صرف اُسی چیز کے ساتھ خاص ہو۔ حکم کی دو قسمیں عام اور خاص معلوم کرنے

کے بعد اب یہ سمجھیے کہ جب کبھی متعدد اشیاء کو سامنے رکھ کر کوئی ایک حکم بیان کرنا منظور ہو۔ تو ایسے موقع پر مقتضاء بلاغت یہ ہے کہ صرف حکم عام بیان کیا جائے، اور مختلف چیزوں کے لیے الگ الگ جو خاص خاص احکام ہیں اُن کو بیان نہ کیا جائے۔ اس طرح کے مواقع پر صرف حکم عام بیان ہوتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بعض اشیاء کے لیے کوئی خاص حکم الگ نہیں ہے بلکہ بربناءِ عُرف، یا کسی اور جگہ پر ذکر آجانے کے باعث، یا ذہن سامع پر اعتماد کے سبب یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ حکم عام ہونے کے باوجود سامع خود بخود بعض اشیاء کو مستثنیٰ قرار دے لیگا۔

مثالاً یوں سمجھیے کہ کسی ملک میں غنیم سے مقابلہ کی تیاریاں بہت زور شور سے ہو رہی ہیں۔ ایک ایک باشندۂ ملک سے عہد و پیمان لیا جا رہا ہے کہ وہ دشمن کے بالمقابل بڑی بہادری اور دلیری کے ساتھ لڑیگا۔ اس موقع پر لشکریوں سے جو قسم لی جاتی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

ہم خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتے ہیں کہ کل صبح ہم سب یا تو میدان جنگ کو فتح کر لینگے ورنہ وہیں خودکشی کر کے جان دے دینگے"۔

اب ظاہر ہے کہ یہاں جو حکم بیان کیا جا رہا ہے وہ عام ہے لیکن اس کے باوجود بعض خاص افراد ہیں جو خود بخود اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً ایک لشکری ہے جس کو یہ حلفِ شجاعت اُٹھانے کے بعد یک لخت ہیضہ کی بڑی سخت شکایت ہو جاتی ہے۔ تو کیا یہ کہا جائیگا کہ اس مریض کو چونکہ حکم عام سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا تھا اس لیے یہ مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا؟

قرآن مجید میں خود اس طرح کی متعدد مثالیں موجود ہیں ایک موقع پر ارشاد ہے، وَمَا

محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل ۔ ترجمہ :۔ اور محمد صرف اللہ کے رسول ہیں اور ان سے پہلے بہتیرے پیغمبر گزر چکے ہیں ۔ غور کیجیے یہاں کلمۂ نفی "ما" اور کلمۂ استثناء "الا" دونوں مل کر حصر کا فائدہ دے رہے ہیں لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد صرف اللہ کے رسول ہی ہیں اور اس کے سوا کچھ اور نہیں ؟ پھر آگے چل کر رسول کی صفت قد خلت من قبلہ الرسل لائی گئی ہے ۔ الرسل پر الف لام استغراق کا ہے لیکن کیا حضرت عیسیٰ بھی اس میں داخل ہیں ؟ اور داخل نہ ہونے کی صورت میں سوچیے اگر قد خلت من قبلہ الرسل کے ساتھ فوراً ہی الا عیسیٰ کا استثناء آتا تو اس سے بلاغت کو کتنا عظیم نقصان پہنچتا ۔

پس آیت زیر بحث کو بھی اسی پر قیاس کر لیجیے ۔ اسیرانِ جنگ کے لیے جو احکام ہیں دو طرح کے ہیں ۔ ایک وہ جو ہر ایک قیدی کے ساتھ برتے جا سکتے ہیں ۔ اور ایک وہ جو خاص خاص افراد کے لیے مخصوص ہوں ۔ پہلی قسم کا حکم من و فدا ہے ، اور دوسری قسم کا حکم استرقاق و قتل ہے ۔ اور چونکہ یہاں اسیرانِ جنگ کے لیے ایک عام حکم بیان کرنا تھا اس لیے صرف فاما منًّا بعد واما فداءً پر اکتفا کیا گیا لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ اسیرانِ جنگ کے لیے صرف یہی حکم ہے اور بس ، قرآنی بلاغت سے اور تاریخ و سیر سے آشنا نہ ہونے کی دلیل ہے ۔ چنانچہ اربابِ تفسیر میں سے کسی نے بھی اسیرانِ جنگ کے حکم کو ان دونوں میں محصور نہیں مانا ۔ بلکہ جیسے پہلے بیان ہو چکا ہے اسیرانِ جنگ کے معاملہ کو امام کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے وہ جیسا مناسب سمجھے کرے ۔ احسان کرے ، فدیہ لے ، قتل کر دے یا غلام بنا لے ۔ صرف ایک ابو عبید ہیں جنہوں نے غلام بنانے کے جواز میں شک کیا ہے[۱] ۔

[۱] احکام القرآن ج ۳ ص ۳۸۱ ۔

امام رازی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں :۔

هٰذا ارشادٌ فذکر الامر العامَّ الجائزَ فی سائر الاجناس والاسترقاق غیر جائزٍ فی اسر العرب۔ فان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان معهم فلم یذکر الاسترقاق واما القتل فان الظاهر فی المثخن الازمان ولان القتل ذکرہٗ بقولہٖ فضرب الرقاب فلم یبق الا الامران۔[1]

(ج ۷۔ص ۵۰۸)

یہ ارشاد کا موقعہ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے امر عام کو ذکر کیا ہے جو تمام اجناس میں شامل ہے بخلاف غلام بنانے کے کہ وہ عرب کے گرفتاران جنگ کے لیے درست نہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان موجود تھے۔ اس لیے غلام بنانے کا ذکر نہیں کیا۔ اب رہا قتل تو اس لیے کہ جو مغلوب ہوگیا بالکل اپاہج اور مفلوج ہو جائیگا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فضرب الرقاب فرما کر قتل کا ذکر کر دیا ہے پس اب صرف دو امر باقی رہے (یعنی مَنّ و فداء)

علامہ سید رشید رضا الوحی المحمدی میں لکھتے ہیں :۔

ولما کنا مخیرین فیهم بین اطلاقهم بغیر مقابل والفداء بهم جاز ان یُعدّ هٰذا اصلاً شرعیاً لابطال استئناف الاسترقاق فی الاسلام فانّ ظاهرَ التخییر بین هٰذین الامرین ان الامر الثالث الذی هو الاسترقاق غیر جائزٍ لولم یعارضه انّهٗ هو الاصل المتبع عند

اس آیت میں مسلمانوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ قیدیوں کو بغیر کسی معاوضہ کے رہا کر دیں یا فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔ اس آیت کو نئے غلام بنانے کی ممانعت میں اصل قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ ان دو صورتوں میں اختیار دینے کا مطلب یہ ہے کہ تیسرا امر یعنی غلام بنانا جائز نہیں ہے۔ اگر اس سے یہ بات متعارض نہ ہوتی کہ تمام قوموں میں غلام بنانے کا رواج جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ پس یہ امر سب سے بڑا مفسدہ در

جمیع الامم فمن اکبر المفاسد والضرر ان	نقصان کا باعث ہے کہ غیر قومیں تو ہمارے قیدیوں کو غلام
یسترقوا اسرانا ونطلق اسراھم ونحن	بنالیں اور ہم اُن کے قیدیوں کو رہا کردیں، حالانکہ قیدیوں
ارحم بھم واعدل ولکن الاٰیۃ لیست	کے حق میں ہم سب سے زیادہ مہربان اور عادل ہیں۔ پھر یہ بھی
نصًا فی الحصر ولا صریحۃ فی النھی عن	ظاہر ہے کہ آیت میں نہ تو حصر کی تصریح ہے اور نہ غلام
الاصل فکانت دلا لتھا علی تحریم	بنانے کی نفی صراحۃً ہے اس لیے یہ آیت غلامی کی ممانعت
الاسترقاق مطلقًا غیر قطعیۃٍ فبقی حکمہ	قطعی دلیل نہیں ہے، بلکہ یہ معاملہ ارباب حکومت کے
محل اجتھاد اولی الامر اذا وجدوا	اجتہاد سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اگر مناسب سمجھیں کہ
المصلحۃ فی ابقائہ ابقوہ واذا وجدوا	اسیران جنگ کو بغیر معاوضہ ہی رہا کردیں تو ایسا کریں
المصلحۃ فی ترجیح المنّ علیھم بالحریۃ و	اور اگر فدیہ لے کر آزاد کرنا مناسب ہو تو ایسا کریں۔
ھو ابطالہٗ اختیاریٌ لہٗ او الفداء بھم عملوا بہ	(صفحہ ۱۶۴)

علامہ رشید رضا کا مطلب یہ ہے کہ اگر جوازِ استرقاق کے لیے دوسرے دواعی نہ ہوتے تو بلاشبہ قرآن مجید کی آیت فاِمّا منًا بعد واِمّا فداءً غلامی کے ختم واستیصال کے لیے ایک اصل کا کام دیتی لیکن معاملہ یہ ہے کہ ایک طرف تو استرقاق سے متعلق نفیًا یا اثباتًا اس آیت میں کچھ نہیں فرمایا گیا اور دوسری طرف ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اسیرانِ جنگ کو غلام بنایا اور پھر اُس عہد کے عام ملکی احوال کا بھی یہی تقاضا تھا کہ غلام بنانا ناجائز نہ ہونا چاہیے ان وجوہ کی بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام میں غلام بنانے کی اجازت نہیں ہے اور آیت بالا نے غلامی کے جواز کا بالکل خاتمہ کردیا۔

اسلام نے غلامی کا خاتمہ کیوں نہیں کیا

لیکن اسلامی تعلیمات و تصریحات کو عدل و انصاف کے معیارِ تنقید پر جانچا جائے تو بے شبہ یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام نے غلام بنانے کی صرف اجازت دی ہے، حکم نہیں دیا، اور اس نے بعض ناگزیر اور وقتی حالات کے پیش نظر اگرچہ اس کو مباح کہا ہے لیکن اس کو بنظر پسندیدگی نہیں دیکھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ چونکہ استرقاق صرف ایک ہنگامی اور وقتی چیز ہے۔ معاشرت، اجتماعی زندگی اور تمدن کا کوئی مستقل عنصر نہیں ہے اس لیے قرآن مجید میں اس کا کہیں ذکر نہیں فرمایا گیا۔ قتل جو سزاؤں میں سب سے زیادہ سخت اور آخری سزا ہے قرآن مجید نے بصیغہ امر متعدد جگہ اُس کا ذکر کیا لیکن استرقاق کے جواز سے متعلق کہیں ایک حرف بھی نہیں فرمایا گیا۔

اسلام نے غلامی میں ممکن سے ممکن اصلاح کی اور اُس کو ہمسری و برابری کے درجہ تک پہنچا دیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسلام نے اس رسمِ بد کا قطعی طور پر خاتمہ کیوں نہیں کیا؟ اس کے چند وجوہ ہیں۔

پہلی وجہ

(۱) اسلام جب دنیا میں آیا۔ تو صدیوں پہلے ہر جگہ غلام بنانے اور رکھنے کا رواج تھا خود عرب اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ اہل عرب کثرت سے غلام اور باندیاں رکھتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، بسا اوقات اُن کی لڑائیاں اسی لیے ہوتی تھیں کہ اسیرانِ جنگ ہاتھ آئیں اور غلام بنائے جائیں۔

عمرو بن کلثوم ایک جگہ کہتا ہے:۔

فابوا بالنهاب وبالسبايا　　　وابنا بالملوكِ مصفدينا

وہ لوٹے ہوئے مال اور لونڈی غلام کو لے کر واپس ہوئے، اور ہم بادشاہوں کو لیکر لوٹے جو بندھے ہوئے تھے۔

زہیر بن ابی سلمٰی آلِ ربیعہ پر اپنی فتح کے واقعات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

وسبینا من تغلب کُلَّ بیضا ۔۔۔ ءِ رقودَ الضحیٰ برودَ الرضابِ

ہم نے تغلب کی گوری گوری لڑکیوں کو باندیاں بنا لیا، جو دن چڑھے تک سوتی رہتی ہیں، اور جن کا لعاب دہن شیریں وخنک ہے۔

حارث بن حِلِزَّہ، نعمان بن منذر کے ایک حملہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

ثم ملنا علیٰ تمیم فاحرمنا ۔۔۔ وفیھا بنات حُرٍّ اماءُ

پھر ہم بنو تمیم پر مائل ہوئے۔ اور ماہ حرام میں اُن کو جا کر پکڑ لیا اور اُن کی بیٹیوں کو باندیاں بنا لیا۔

اکثم بن صیفی کہا کرتا تھا :۔

اَھنأُ الظفر کثرۃ الاسریٰ وخیر الغنیمۃ المالُ	بہترین اور عمدہ کامیابی وہ ہے جس میں قیدی زیادہ ہاتھ آئیں اور غنیمت کا اچھا مال، اونٹ وغیرہ ہیں۔

پھر اُس زمانہ کے اقتصادی حالات بھی رواج غلامی کی بقا کا تقاضا کرتے تھے۔ ایک مُلک سے دوسرے ملک میں جانے کے لیے وسائل آمد و رفت بہت ناکافی اور محدود تھے۔ عرب کوئی زراعتی ملک نہ تھا جس میں کثیر التعداد کسانوں اور مزدوروں کی خوراک کا سامان بآسانی پہنچ سکتا۔ صنعت وحرفت کے اعتبار سے بھی اُس کو نمایاں امتیاز و مقام حاصل نہ تھا۔ وہاں بیش از بیش دستکاری کے کارخانے نہ تھے جن میں غریب لوگ کھپ سکیں اور اس طرح اپنے بال بچوں کے لیے روزی کا کوئی بندوبست کر سکیں۔ ان حالات میں سوسائٹی

کے نظم واجتماع کو باقی رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ لوگ جو سرمایہ دار ہیں غریبوں کو اپنی سرپرستی میں لیں۔ اقتصادی حالات سے تنگ آکر بعض بعض مائیں اپنے بچوں کو امیروں کے ہاتھ فروخت کر دیا کرتی تھیں۔ اور خریدنے والے اُن کو غلام یا باندی بنا لیتے تھے۔ فلسفۂ اجتماع کے ماہرین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انسانی معاشرت پر کبھی ایسا دور آتا ہے جبکہ غلامی کا رواج نقصان رساں ثابت ہونے کے بجائے تہذیب و تمدن کی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔[1]

غلامی سوسائٹی کے جسم صحیح کے لیے ایک جرعۂ تلخ سے کم نہیں لیکن جس طرح انفرادی بیماری مریض کو داروئے ناخوشگوار کے پینے پر مجبور کرتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسانی جماعتوں اور سوسائٹیوں کا حال ہے کوئی انسانی جماعت تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ترقی یافتہ ہو۔ وسائل و ذرائع معاش اُس کے ہاں بافراط تمام ہوں۔ ایجادات واختراعات کا بازار گرم ہو تو اُس میں غلامی کے رواج کا پایا جانا نہ صرف ناجائز بلکہ انتہائی شرمناک اور ذلت انگیز ہے لیکن اس کے برخلاف اگر ایسا نہ ہو تو بسا اوقات ناگزیر ہوتا ہے کہ غلامی کا رواج برتا اور جاری کیا جائے۔

بھر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ظہورِ اسلام کے وقت عرب میں باندی غلام کا عام رواج تھا۔ اور یہ رواج اُن کی معاشرت کا جزءِ اہم بنا ہوا تھا۔ پس یہ ظاہر ہے کہ جب تک اہل عرب کی طرزِ معیشت، عام معاشرت، اور اُن کے تہذیب و تمدن میں نمایاں انقلاب

---

[1] اس طرح کے متعدد مقولے کتاب کے آغاز میں گزر چکے ہیں۔

نہ پیدا کر دیا جاتا اس رسم بد کا اختتام نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر اُس عہد کے موجودہ حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یک لخت اس رسم کا استیصال فرما دیتے تو اقتصادی اور معاشرتی دونوں اعتبار سے عرب کو نقصانِ عظیم پہنچتا اور بہت ممکن ہے کہ اس سے ملک میں ایک عام بےچینی پیدا ہو جاتی۔ سید امیر علی لکھتے ہیں

"جن لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اُن میں رواجِ غلامی پورے طور پر سرایت کیے ہوئے تھا۔ اُس کے انسداد کی صورت یہی تھی کہ مسلسل طور پر انسانی اور عقلمندانہ قوانین کی اشاعت کی جاتی۔ اگر یکایک اس کا انسداد کر دیا جاتا تو اخلاقی اور اقتصادی اعتبار سے ایسا ہونا ناممکن تھا"[1]

پھر یہی جلیل القدر مصنف آگے چل کر یوں رقمطراز ہے:۔

"نامحدود قواعد، مثبت اور منفی، غلاموں کی بتدریج آزادی اور اُن کی مرفہ الحالی کے لیے وضع کیے گئے۔ اگر اس کے خلاف کوئی اور پالیسی اختیار کی جاتی تو اسلامی جماعت اور سوسائٹی کو اُس سے نقصانِ عظیم پہنچتا جو کہ اُس وقت اپنی ابتدائی حالت میں تھی"

مذہب و اخلاق کی انسائیکلو پیڈیا کا مقالہ نگار اس سوال کے جواب میں کہ جنوبی امریکہ میں غلامی کا خاتمہ یک لخت کیوں نہیں کر دیا گیا۔ لکھتا ہے:۔

"یقیناً وہ لوگ جو غلام رکھتے تھے اُن کے پاس بھی اپنے اس فعل کے لیے چند وجوہ تھیں وہ خود اس رواج کے ذمہ دار نہیں تھے۔ بلکہ یہ تو پہلے سے چلا آرہا تھا۔ اس کے علاوہ دوسری

---

[1] *The Spirt of Islam. P. 262*

بات یہ ہے کہ اگر غلامی کا خاتمہ اچانک کر دیا جاتا تو سیاہ فام غلاموں کا حشر کیا ہوتا۔ اگر ان کو وہی حقوق دیے جاتے جو سفید فام لوگوں کے تھے تو جنوبی علاقہ کے لوگ اس کے نتائج کے تصور سے خوفزدہ ہوتے تھے، اور اگر ان لوگوں کو وہ حقوق نہ دیے جاتے تو یہ اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی غرض ہر اعتبار سے مشکلات پیدا کر دیتے غلامی جنوبی امریکہ کی سوسائٹی کا اہم جزو بنی ہوئی تھی اور اس لیے اُس کو بدلنا بہت مشکل کام تھا۔

مقالہ نگار موصوف نے جنوبی امریکہ سے یک لخت غلامی کا خاتمہ نہ کرنے کی جو اخیر وجہ لکھی ہے۔ وہی بعینہ اس کی وجہ ہے کہ اسلام نے اچانک عرب سے غلامی کا رواج مسدود نہیں کیا۔

ولایاتِ متحدہ امریکہ نے غلام آزاد کیے تو ان میں سے بعض دور دراز ملکوں میں طلبِ رزق کے لیے نکل گئے لیکن جب اُن کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو انہوں نے اپنے آقاؤں کے پاس آکر درخواست کی کہ ہم کو پھر غلامی میں لے لیا جائے۔ یہی حال مصری سوڈان میں ہوا انگریز حاکموں نے اس کا تجربہ کرنا چاہا کہ اگر غلام آزاد کر دیے جائیں تو اُن کے لیے ایسے وسائل معاش مہیا ہوں جن سے وہ اپنی ضروریات کی تکمیل کر سکیں۔ لیکن انگریز حکام کا یہ تجربہ ناکامیاب رہا اور اُن کو مجبوراً یہ حکم دینا پڑا کہ وہ پھر اپنے اپنے آقاؤں کی غلامی میں واپس چلے جائیں بشرطیکہ وہ فروخت نہ کیے جائیں اور اُن کا کوئی مارکیٹ قائم نہ ہو[1]۔

برطانوی علاقوں میں ۱۸۳۳ء میں غلامی کے استیصال کلی کا بل منظور ہوا تو جو غلاموں

---

[1] الوحی المحمدی للسید رشید رضا۔ ص ۱۶۳۔

کے مالک تھے اُن کو بیس[2] ملین اسٹرلنگ معاوضہ دیا گیا۔[1]

اُس زمانہ میں غلاموں اور باندیوں کی کثرت، حکومت اسلام کی غربت و بے تمولی ان دونوں کو پیش نظر رکھو اور بتاؤ کہ کیا اسلامی حکومت اپنے اُس ابتدائی دور میں بیشمار غلاموں کو آزاد کرا کے اُن کے آقاؤں اور مالکوں کو معاوضہ دے سکتی تھی۔ اور پھر آزاد ہونے کے بعد جن غلاموں پر خود کسب معاش کا بار پڑتا کیا اسلامی حکومت اُن سب بے روزگاروں کی کفالت اپنے ذمہ لے سکتی تھی۔

عیسائی خود کہتے ہیں کہ حضرت مسیح نے غلامی کا خاتمہ اس لیے نہیں کیا کہ یک لخت غلامی کا خاتمہ کر دینا یا اُس کے لیے کوشش کرنا سوسائٹی کے نظامِ معاشرت کو سخت صدمہ پہنچاتا۔[2] تو کیا جو چیز حضرت مسیح کے لیے اس باب میں عذر ہو سکتی ہے پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں ہو سکتی تھی؟

مئی سنہ ۱۸۲۳ء میں فوویل بکسٹن (Fowell Buxton) نے دارالعوام میں غلامی پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ غلامی برطانوی دستور اساسی اور عیسائی مذہب دونوں کے اصول کے خلاف ہے اس بنا پر برطانوی نوآبادیات سے اس کا خاتمہ تدریجی طور پر کر دینا چاہیے۔

اس تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ خود برطانوی مدبرین بھی سمجھتے تھے کہ یک لخت غلامی

Encyclopaedia of religion and ethics.

Encyclopaedia of religion and ethics. article christian slavery.

کے رواج کا اختتام پریشان کن نتائج کا موجب ہوگا۔

دوسرا سبب | اُس عہد میں ہر جگہ غلام بنانے کا رواج تھا۔ پس اگر اسلام اس کو بحالتِ جنگ جائز نہ قرار دیتا تو اس سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچتا۔ لڑائی میں جو مسلمان کافروں کے ہاتھ گرفتار ہوتے، غلام بنا لیے جاتے اور اس کے برخلاف جو کافر مسلمانوں کے ہاں قید ہوتے سب کے سب مَنًّا یا فِداءً رہا کر دیے جاتے تو ظاہر ہے اس طرح مسلمانوں کو قسم قسم کے مصائب برداشت کرنے پڑتے۔ اُن کی طاقت و قوت کم ہوتی رہتی اور ان کے دشمنوں کی صولت و عظمت میں ترقی ہوتی۔

ہر شخص جانتا ہے کہ جنگ میں اپنی قوت کے توازن کو باقی رکھنے کے لیے ہر فریق کو اُنہی اصول و قواعدِ جنگ پر عامل ہونا پڑتا ہے جو دوسرے فریق کا معمول ہوتے ہیں پس ایک ایسے زمانہ میں جبکہ جنگ کے گرفتار شدہ لوگوں کو غلام بنا لینے کا رواج عام تھا آنحضرت کے لیے بھی ناگزیر تھا کہ استرقاق کو جائز رکھیں۔ اور آپ اس کا خاتمہ اُس وقت تک نہیں کر سکتے تھے جب تک کہ یا تو تمام اقوامِ عالم متفق ہو کر اس رسم بد کا خاتمہ کرنے پر آمادہ نہ ہو جاتیں اور یا مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے اتنی طاقت و قوت حاصل ہو جاتی کہ یہ خود اپنے اختیار سے اس رسم کا خاتمہ کر سکتے، اور اس کے باوجود غیروں کی جانب سے اُنہیں نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہوتا۔ چنانچہ آئندہ چل کر معلوم ہوگا کہ حضرت عمر نے اسلامی طاقت کے مضبوط ہو جانے پر ایسا ہی کیا۔ ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے اسی مفہوم کو ان مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے:-

وانما ابقی علیہ اولاً لحفظ التوازن بین الدولۃ الاسلامیہ وبین اعدائھا، و ثانیا الحمایۃ الضعفاء من نساءٍ اکلتِ الحربُ رجالھن ولو ترکنَ وشانھنّ لکنّ عالۃً علی المجتمع ومصدراً للشرور۔
(تاریخ الاسلام السیاسی ص ۲۳۱)

اسلام نے غلامی کو باقی رکھا اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ حکومت اسلامیہ اور اُس کے دشمنوں میں توازن باقی رہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس طرح اُن کمزور عورتوں کی اعانت و حمایت ہو جاتی تھی جن کے مرد لڑائی میں قتل ہو چکے ہوں۔ اگر ان عورتوں کو یونہی چھوڑ دیا جاتا تو انسانی جماعت پر یہ مصیبت ہو جاتیں، اور طرح طرح کے مفاسد کا باعث بنتیں۔

تیسری وجہ ڈاکٹر صاحب نے جو دوسری وجہ لکھی ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جنگ میں مرد بیشمار تعداد میں قتل ہو جاتے ہیں اور اپنے پیچھے عورتوں اور بچوں کی کثیر جماعت چھوڑ جاتے ہیں، تو اگر اس وقت ان پسماندگان کی رہائش و خورش اور اس سے زیادہ اُن کی اخلاقی نگرانی اور دیکھ بھال کا کوئی انتظام نہ ہو تو اندیشہ ہے کہ وہ بُرے اعمال کا ارتکاب کرنے لگیں اور مفاسد و فتن کا باعث بنجائیں جیسا کہ جنگِ عظیم (از ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے بعد انگلستان اور جرمنی میں ہوا۔

اِن حالات میں بجز اس کے کوئی راہ نہیں ہے کہ ان بچوں اور عورتوں کو ایک تعلق کے ساتھ مختلف افراد کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے۔ آپ اس تعلق کا نام غلامی رکھ دیجیے لیکن آگے چل کر آپ کو خود معلوم ہو جائیگا کہ اسلام نے جس حقیقت کو غلامی کہا ہے وہ در اصل غلامی ہے یا بھائی بندی اور برادری ہے۔

پھر ان سب سے قطع نظر کر کے اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ وہ لوگ جو جنگ میں

گرفتار ہوتے ہیں اُن کے ساتھ عقلاً کئی طرح کا معاملہ ہو سکتا ہے۔ (۱) قتل کر دیے جائیں۔ (۲) فدیہ لے کر یا بغیر فدیہ رہا کر دیے جائیں (۳) قید خانہ میں State prisoner کی حیثیت سے رکھے جائیں۔ بعض اوقات حالات ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک صورت کو بھی اختیار نہیں کیا جا سکتا، ایک قیدی جو عمدہ دل و دماغ کا مالک ہے اُس کو قتل کرنا سوسائٹی پر ظلم کرنا ہے علی الخصوص اُس وقت جبکہ وہ مسلمانوں کی دشمنی میں زیادہ سرگرم اور پیش پیش نہ ہو۔ اسی طرح اُس کو رہا کرنا بھی بعض مرتبہ سیاسی مصالح کے خلاف ہوتا ہے! اندیشہ ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے پاس جا کر کہیں پھر آپ کی مخالفت اور دشمنی میں سرگرم نہ ہو جائے

بالعموم جمہوری اور شخصی سلطنتیں ایسے اسیرانِ جنگ کے ساتھ جن کو نہ قتل کیا جا سکتا اور نہ اُن کو رہائی دی جا سکتی ہے، معاملہ یہ کرتی ہیں کہ کسی جزیرہ میں یا کسی الگ تھلگ مقام پر نظر بند کر دیتی ہیں اور یا کسی قید خانہ میں اُن کو قید کر دیا جاتا ہے۔ اسلام نے اس طریقہ کے بالمقابل ایک طریقہ استرقاق کا تجویز کیا ہے۔ اب دونوں پر غور کیجیے تو بڑا فرق نظر آتا ہے۔ پہلی صورت میں خرابی یہ ہے کہ ان نظر بندوں کے اخراجات کا بار حکومت کے خزانہ پر پڑتا ہے جس کو وہ کبھی جدید ٹیکس لگا کر وصول کرتی ہیں۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ نظر بند ہونے یا قیدی ہونے کی صورت میں ان لوگوں کی ذہنی تربیت اور دماغی نشوونما کا موقعہ نہیں ملتا۔ اور یہ بے شبہ سوسائٹی کی بدنصیبی ہے کہ وہ چند بہترین دماغوں سے جو بحالت آزادی مفید خدمات انجام دے سکتے تھے اُن کے قید و بند میں ہونے کے باعث محروم ہو جائے اس کے برخلاف غلاموں کا حال ہے، اُن کے اخراجات مختلف افراد پر تقسیم ہو جاتے

ہیں جن کو وہ اپنے منافع خدمت وغیرہ کے پیش نظر بخوشی انگیز کر لیتے ہیں اور پھر اُن کو دماغی تربیت اور ذہنی ارتقاء کے مواقع بکثرت ملتے ہیں بشرطیکہ سماجی نظام میں اُن کے ساتھ وحشیانہ اور غیر انسانی معاملہ روا نہ رکھا گیا ہو۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان غلاموں نے کیسے کیسے عظیم الشان سیاسی علمی اور ادبی کارنامے کیے ہیں جن کا تذکرہ کتاب کے آخری حصّہ میں ہوگا۔

الغرض یہ وجوہ و اسباب تھے جن کی بنا پر اسلام نے یک قلم غلامی کی رسم قدیم کا خاتمہ نہیں کیا۔ بلکہ اس کی اصلاح اور تدریجی اختتام کے لیے وہی راہ اختیار کی جو اُس نے دوسرے اسی نوع کے معاملات میں اختیار کی ہے۔

اسلام کا اصلاحِ معاملات میں ایک اہم اصول

بہ قول ایک انشا پرداز کے اسلام کا اصول ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ وقت کی اسپرٹ کے ساتھ جنگ نہیں کرتا۔ اگر کسی عمل انسانی کو دفع کرنا ہوتا ہے تو اُس کے لیے یکایک اعلان نہیں کرتا۔ بلکہ تدریجی طور پر وہ ایسی تعلیمات و تلقینات ذہن نشین کرتا ہے کہ آہستہ آہستہ خود وہ عمل ہی فنا ہو جائے۔

نماز فرض ہوئی تو شروع شروع میں اُس میں کلام کرنا جائز تھا۔ پھر جب مسلمان اس کے عادی ہو گئے اور اُن کا استغراق فی العبادت بڑھ گیا تو اکل و شرب اور کلام و سلام سب نماز میں ممنوع قرار دیدیے گئے۔

عرب کے لوگ شراب کے بڑے شوقین تھے اُس کا پینا اُن کے نزدیک باعثِ فخر اور نہ پینا سرمایۂ ننگ و عار تھا۔ اسلام نے اُس کی ممانعت کرنی چاہی تو یک لخت

اُس کی حُرمت کا اعلان نہیں کیا، بلکہ شروع شروع میں صرف اتنا کہا گیا کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو" اس طرح شراب نوشی میں کمی ہوئی۔ پھر جب نماز میں مُخل ہونے کے باعث شراب کی حرمت سے اُن کے دلوں میں نفرت بیٹھ گئی تو صاف حکم نازل ہوا

إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۔ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ○

اے ایمان والو یہ شراب اور جوا اور بت اور پانسے سب گندے کام ہیں شیطان کے عمل سے۔ سو ان سے پرہیز کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تم میں شراب اور جوئے کے ذریعہ دشمنی اور بیر ڈالے اور تم کو اللہ کے ذکر اور نماز سے روکے تو کیا تم اس سے پرہیز کرو گے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تدریجی طور پر ان شراب کے متوالوں کے دلوں میں اُمّ الخبائث کی جو نفرت جاگزین کر دی تھی اُس کا اثر یہ ہوا کہ اس آیت کو سنتے ہی حضرت عمر بول اُٹھے اِنْتَهَيْنَا يَا رَبِّ "اے رب ہم رُک گئے"

اسلام کا جو اصولِ اصلاح ہے وہ حضرت عائشہ کی حدیث سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ آپ فرماتی ہیں:

انما نزل اوّل ما نزل منه سورة من المفصّل فيها ذكر الجنة والنار حتى اذا ثاب الناس الى الاسلام نزل الحلال

سب سے پہلے قرآن مجید کی وہ سورت مفصل کی نازل ہوئی جن میں دوزخ اور جنت کا ذکر تھا یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہو گئے تو حلال و حرام نازل ہوئے

واحرام و لو نزل اول شیٔ لاتشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابدا [1] اگر پہلی مرتبہ ہی یہ حکم نازل ہوتا کہ شراب مت پیو، تو وہ کہتے کہ ہم شراب پینا کبھی بھی نہیں چھوڑینگے۔

مالِ غنیمت کی مثال — تدریجی عمل اصلاح کا ایک اور واضح اور کامیاب نمونہ مالِ غنیمت کا مسئلہ ہے۔ اسلام سے قبل دوسرے ادیان وملل میں مالِ غنیمت حلال نہ تھا۔ لیکن اسلام کا ظہورِ اول اوّل جس قوم میں ہوا وہ اموالِ غنیمت کی بڑی دلدادہ تھی۔ ان کا حاصل کرنا اُن کے لیے باعثِ صد فخر و مباہات تھا، ایک شاعر کہتا ہے۔

عَشِيَّةَ وَلّٰى جَمْعُهُمْ فَتَتَابَعُوا فَصَارَ اِلَيْنَا نَهْبُهُ وَعَوَانِسُهُ

ترجمہ:۔ اُس رات اُن کا گروہ بھاگا اور آگے پیچھے بھاگ چلا گیا پھر اُن کا لٹا ہوا مال و متاع اور اُن کی دوشیزہ لڑکیاں ہمارے ہاتھ آگئیں۔

ایک شاعر اپنے شوق و اشتیاقِ غنیمت کو یوں ظاہر کرتا ہے:۔

فَلَئِنْ بقيت لارحلن بِغَزْوَةٍ تحوى الغنائم او يموت كريم

ترجمہ:۔ "اگر میں زندہ رہا تو ایک ایسے غزوہ پر جاؤنگا جس میں اموالِ غنیمت خوب ہاتھ آئیں یا میں ایک شریف انسان کی سی موت مرجاؤں"

مالِ غنیمت کی طلب کے شوق میں ان لوگوں کو اپنے بھائی بندوں اور اعزا و اقرباء کی بھی پروا نہیں ہوتی تھی۔ دشمن سے غنیمت نہیں ملتی تھی تو خود اپنے خویش و اقارب پر حملہ کر بیٹھتے تھے۔ ایک شاعر حماسی کس فخر سے بنکارتا ہے:۔

---

[1] بخاری باب تالیف القرآن۔

وکُنَّ اذا اغرن علی جنابٍ — واعوزھن نھبٌ حیث کانا

اغرن من الضباب علی حلولٍ — وضَبَّۃَ انَّہٗ مَن حَان حانا

واحیانًا علی بکرٍ اخینا — اذا مالم نجد الّا اخانا

ہمارے گھوڑے جب قبیلہ جناب پر غارتگری کرتے ہیں اور وہاں اُن کو لوٹ مار کا مال ہاتھ نہیں آتا تو وہ ضباب اور ضبۃ پر جبکہ وہ اپنے گھروں میں ہوتے ہیں غارتگری کرتے ہیں اور جس کی موت آگئی ہے وہ تو مریگا ہی۔ اور کبھی ہم اپنے بھائی بکر پر بھی حملہ کر بیٹھتے ہیں جبکہ ہم اپنے بھائی کے سوا کسی اور کو نہیں پاتے ہیں[1]

مرد تو مرد عورتیں تک جو نرم دلی اور رقت و تاثر میں ضرب المثل ہیں غنیمت حاصل کرنے کی اس درجہ گرویدہ اور شوقین تھیں کہ جنگ پر جاتے وقت مردوں کو قسم دے دیا کرتی تھیں کہ بغیر مال غنیمت کے واپس نہ آنا۔ سبعۂ معلقہ کا مشہور شاعر عمرو بن کلثوم کہتا ہے:۔

اَخَذنَ علی بعولتھِنَّ عھدًا — اذا لاقوا کتائِبَ مُعلَمِینا

لَیَستَلِبُنَّ افراسًا وبیضًا — واسریٰ فی الحبالِ مقرنینا

ترجمہ:۔ ان عورتوں نے اپنے شوہروں سے عہد لیا ہے کہ جب نشان لگائے ہوئے لشکروں سے ملیں تو گھوڑے اور صیقل شدہ تلواریں لیکر لوٹیں اور رسی میں بندھے ہوئے قیدی بھی لے کر آئیں۔

اِن اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے لوگ مال غنیمت اور باندی غلام حاصل کرنے

---

[1] یہ سب اشعار کتاب الحماسہ ابو تمام کے باب الحماسہ میں موجود ہیں۔

کہ کس قدر شوقین تھے۔ یہ شوق اُن کی فطرت کا ضروری تقاضا بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی بہت دنوں تک اُن کا یہ جذبہ کم نہیں ہوا۔ جنگ اُحد میں مسلمانوں کو جو پسپائی ہوئی اسی شوق کی بدولت ہوئی غزوہ حُنین میں بھی یہی ہوا کہ پہلے حملہ سے دشمنوں کی طاقت ٹوٹنے لگی تو حدیث الاسلام اَعراب غنیمت کی طرف مائل ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ بنی ہوازن کے تیراندازوں نے اس زور سے حملہ کیا کہ لشکر اسلام میں ابتری پیدا ہو گئی۔

ان حالات میں یہ ناممکن تھا کہ غنیمت لینے سے بالکل روک دیا جاتا۔ اس لیئے یہاں پر بھی وہ ہی تدریجی عمل اصلاح کام میں لایا گیا۔ پہلے پہل تو صرف اتنا ہوا کہ غزوۂ بدر میں بعض لوگوں نے جو مال حاصل کرنے کے لیے قیدیوں کو رہا کر دینے کا مشورہ دیا تھا اُن پر عتاب نازل ہوا اور فرمایا گیا۔

تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا وَاللّٰہُ یُرِیْدُ الاخرۃ۔ — تم دنیوی مال و متاع کا ارادہ کرتے ہو حالانکہ اللہ آخرت کا ارادہ کرتا ہے۔

اور پھر ارشاد ہوا۔

ولولا کتابٌ من اللہ سبق لَمَسَّکُمْ فِیْمَا اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ — اگر پہلے سے اللہ کا حکم نہ آچکا ہوتا تو تم نے جو کچھ لیا ہے اُس پر بڑا عذاب ہوتا۔

پھر مختلف طریقوں سے دنیوی مال و دولت کی بے ثباتی اور بے حقیقتی بیان کی گئی اور یہ امر اُن کے ذہن نشین کرا دیا گیا کہ جہاد کی اصل غرض اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ مال و متاع کا حاصل کرنا نہیں۔ پھر بتایا گیا کہ اموالِ غنیمت میں صرف اُن کا ہی نہیں بلکہ اللہ، رسول۔ اہلِ قرابت

یتیم، مسکین اور مسافروں سب کا حصّہ ہے اس کامیاب طریقِ اصلاح کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو غنیمت کا زیادہ شوق نہیں رہا، اور اُن کا جہاد خالصۃً لوجہ اللہ رہ گیا۔

ایک مرتبہ ایک بدوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ میں شریک ہوا درمیان میں کچھ مالِ غنیمت آپ کو ملا تو آپ نے دوسرے مجاہدین کی طرح اس بدوی کا بھی حصّہ لگایا۔ بدوی کو اطلاع ہوئی تو اُس نے حاضر ہو کر عرض کی کہ "میں نے تو اس مال کے لیے آپکی پیروی اختیار نہیں کی ہے (حلق کی طرف اشارہ کر کے کہا) میں تو چاہتا ہوں کہ اس جگہ تیر کھاؤں اور شہید ہوں"[1]

اس تقریر سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہو گی کہ اسلام نے ملکی و اجتماعی احوال کی اصلاح میں بڑی حکمت عملی سے کام لیا ہے۔ اور اس راہ میں جماعتی نفسیات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا خود قرآنِ مجید میں آپ کو حکم دیا گیا تھا۔

وَادْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ	اور اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھے وعظ
الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ	نصیحت کے ساتھ بلاؤ

پس اسی قسم کے مسائل پر غلامی کو قیاس کر لیجیے۔ اوّل تو غلامی کا رواج عرب اور دوسرے ملکوں کی معاشرت و مدنیت کا ایسا اہم جزو بنا ہوا تھا کہ اگر اُس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُس کو بالکل ختم کرنا بھی چاہتے تو نہ کر سکتے تھے اور پھر بعض وقتی، سیاسی، دور اندیشی اور احتیاط و حزم کا بھی اقتضاء نہ تھا کہ اس رواج کو یک قلم مٹا دیا جائے۔ اِن وجوہ و اسباب

[1] نسائی باب الصلوٰۃ علی الشہداء۔

کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ نے اس رواج کے بالکل خاتمہ کا اعلان نہیں فرمایا لیکن اس میں چند در چند ایسی جامع اور اصولی اصلاحیں کی ہیں کہ غلامی صرف نام کی غلامی رہ گئی اور برادری و بھائی چارگی بن گئی۔

صرف اسیرانِ جنگ غلام ہو سکتے ہیں

اس سلسلہ میں سب سے پہلے آپ نے یہ کیا کہ غلام اور باندی بنانے کے قدیم مختلف طریقوں کو مٹا کر آپ نے صرف ایک ہی طریقہ کو باقی رکھا۔ اسلام سے پہلے عام دستور تھا کہ فقر و فاقہ کے باعث یا قرض کے دباؤ میں لوگ اپنے بال بچوں کو یا خود اپنے آپ کو کسی شخص کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے اور وہ اُن کو اپنا غلام بنا لیتا تھا۔ اس کے علاوہ جرم کی پاداش، یا قمار بازی میں شرط ہو جانے کی بنا پر بھی لوگوں کو غلام بنا لیتے تھے[1] یا یونہی چُرا کر لے آتے اور زبردستی باندی غلام بنا لیتے[2]۔ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ یہودیوں کے مذہب میں تو یہ ناجائز ہی نہ تھا۔ اور عیسائیوں کے ہاں اگرچہ اس مضمون کی کوئی مذہبی روایت نہ تھی لیکن عملاً اُچک کر غلام بنا لینے کا طریقہ عیسائیوں میں خوب رائج تھا۔

خود لارڈ کرومر جو عیسائیت کا مبلغ اعظم ہے کہتا ہے:-

"وہ امور جو عیسائیوں کے لیے بیحد شرمندگی کا باعث ہیں اُن میں سے ایک یہ بات

---

[1] کتاب الاغانی لابی الفرج الاصفہانی میں اس قسم کے متعدد واقعات مذکور ہیں۔

[2] اسد الغابہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام زید بن حارثہ ایک مرتبہ اپنی ماں کے ہمراہ اپنی قوم بنو معن کی زیارت کو جا رہے تھے بنو القین بن جسر کی ایک جماعت نے ان پر غارتگری کی۔ اور زید کو گرفتار کر کے بازار عکاظ میں بیچ دیا وہاں حکیم بن حزام نے اُنھیں اپنی پھوپی کے لیے خرید لیا جن کا نام خدیجہ بنت خویلد تھا اور جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی تھیں۔ خدیجہؓ نے زید کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہبہ کر دیا اور آپ نے اُن کو شرف آزادی بخشا۔

ہے کہ انھوں نے صرف غلام بنانے پر ہی کفایت نہیں کی بلکہ اس سے بھی زیادہ برے کام کا ارتکاب کیا یعنی یہ لوگ انسانوں کو اُچک کر لیجاتے اور بجبر غلام بنا لیتے تھے۔[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلامی کی ان سب صورتوں کو سخت ناجائز اور موجب عذاب الٰہی قرار دیا۔ اور صرف ایک صورت کو باقی رکھا یعنی وہ لوگ جو جنگ میں گرفتار کیے جائیں امام کو اختیار رہے اگر مقتضائے مصلحت و سیاست جانے تو اُن کو باندی غلام بنا لے پھر بھی یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ صرف اجازت ہے حکم نہیں۔ اس کے علاوہ غلامی کی جتنی صورتیں ہیں سب قطعی حرام اور سراسر ناجائز و غیر مباح ہیں آپ فرماتے ہیں۔

قال اللہ تعالیٰ ثلاث انا خصمھم یوم القیامۃ ومن کنت خصمہ خصمتہ رجل اعطی بی ثم غدر ورجل باع حرًا اکل ثمنہ ورجل استاجر اجیرًا فاستوفی منہ ولم یعطہ اجرہ۔ (بخاری وغیرہ)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تین شخص وہ ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑونگا اور جن سے میں جھگڑا کرونگا میں اُن پر غالب آجاؤنگا، ایک وہ شخص ہے جس نے میرے نام پر دیا اور پھر غدر کیا۔ دوسرا وہ شخص ہے جس نے کسی حُر کو بیچ دیا اور اُس کی قیمت کھا گیا۔ تیسرا وہ ہے جس نے اُجرت پر کسی مزدور کو رکھا اور اُس سے اپنا کام تو پورا لے لیا لیکن اُس کی مزدوری اُسے نہیں دی

ایک اور حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ تین شخص وہ ہیں جن کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کریگا، اُنہی تین میں ایک وہ شخص ہے جس نے کسی آزاد کو غلام بنا لیا۔ حدیث کے اصل

---

[۱] الاسلام واللورد کرومر۔ ص ۱۴۴۔

الفاظ یہ ہیں: "ورجلٌ اعتبد محررًا" اعتبد کا مفہوم یہ ہے کہ اُس کو زبردستی غلام بنالیا۔ یا اُس کی آزادی کا انکار کیا۔ یا اُس کو معلوم تھا کہ وہ آزاد ہے لیکن اُس نے اس حقیقت کو ظاہر نہیں کیا اور وقت پر چپ رہا[1]۔

آزادی اصل ہے

عمرو بن العاص حضرت عمر کی طرف سے مصر کے گورنر تھے وہاں انہوں نے قبطیوں پر تشدد کیا۔ کسی نے اس کی شکایت حضرت عمر سے کردی تو آپ نے فوراً گورنر مصر کو تحریر فرمایا:۔

یا عمرو منذ کم تعبدتم الناس و	اے عمرو تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنانا شروع کردیا حالانکہ
قد ولدتھم امھاتھم احرارًا	اُن کی ماؤں نے اُنہیں آزاد جنا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے آزادی کو ہر انسان کا پیدائشی حق سمجھا ہے۔ اور اُس کو اصل اور غلامی کو محض ایک امر عارض قرار دیا ہے اسی بنا پر فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے اپنے متعلق غلامی کا اقرار کیا لیکن دوسرا کوئی شخص ہے جو اس سے انکار کرتا ہے۔ تو اگرچہ قاعدہ یہ ہے کہ المرء یوخذ باقرارہٖ آدمی اپنے اقرار سے پکڑا جاتا ہے" لیکن اس معاملۂ خاص میں خود مُقِر کا اپنے حق میں اعتراف بھی قبول نہ کیا جائیگا اور قولِ منکر کو ترجیح دی جائیگی۔

دو جزیے

اسی طرح فقہاء کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اگر کسی شخص کے قبضہ میں کوئی لڑکا ہو اور وہ دعویٰ کرے کہ یہ میرا غلام ہے، تو بحکم اَلْبَیِّنَۃُ لِلْمُدَّعِیْ وَالیمین عَلیٰ مَنْ اَنْکَرَ مدعی سے گواہ طلب

---

[1] یہ روایت سنن ابی داؤد و ابن ماجہ میں ہے اور اعتبد کا یہ وسیع مفہوم علامہ رشید رضا نے اپنی کتاب الوحی المحمدی میں لکھا ہے ص: ۱۶۵ و ۱۶۶

کیے جائینگے۔ اور وہ اُن کے پیش کرنے سے عاجز رہیگا تو غلام سے قسم لے کر اُس کے حق میں فیصلہ کر دیا جائیگا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں آزادی اصلی ہے اور غلامی عارضی ورنہ ایک مملوک مقبوض کے بالمقابل مالک سے گواہ طلب کرنے کے کیا معنیٰ؟

اس کے علاوہ فقہاء کا اس پر بھی اجماع ہے کہ اگر دو شخصوں کو جن میں سے ایک مسلمان ہے اور دوسرا کافر۔ ایک بچہ کہیں پڑا ہوا مل گیا۔ اور اُس کے متعلق مسلمان نے دعویٰ کیا کہ میرا غلام ہے۔ اور کافر نے کہا کہ میرا بیٹا ہے تو اس صورت میں کافر کا قول مانا جائیگا اور وہ بچہ اُسی کو دے دیا جائیگا۔ فقہا کا یہ حکم اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام کو آزادی اس قدر عزیز ہے کہ اُس کے بالمقابل اُس نے ایک مسلمان کی بھی پروا نہیں کی اور اس کا بھی خیال نہیں کیا کہ ممکن تھا وہ بچہ ایک مسلمان کے پاس رہتے رہتے خود بھی مسلمان ہو جاتا۔

جنگ کی شرعی حیثیت

اب ہم کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ جس جنگ میں گرفتار ہونے والے لوگ غلام بنائے جاسکتے ہیں اُس کی شرعی حقیقت کیا ہے۔ کیا وہ باندی غلام حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ کیا اُس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُس کے ذریعہ دوسری قوموں پر استعماری گرفت مضبوط کی جائے؟ کیا اُس سے غرض یہ ہے کہ دنیا میں فتنہ و فساد اور قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا جائے۔

اسلام نے صاف طور پر اعلان کر دیا ہے کہ جہاد کا مقصد کسی ملک کو حاصل کرنا یا کسی قوم کو خواہ مخواہ محکوم کرنا نہیں ہے۔ بلکہ اُس کی غرض و غایت یہ ہے کہ فتنہ کا سر قلم کر دیا جائے، اور مسلمانوں کے حقوق اس قدر محفوظ اور مستحکم ہو جائیں کہ کوئی طاقت اُن کو

ذلیل نہ کرسکے۔ رشاد ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ

اور تم ان سے جنگ کرو۔ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور تمام دین اللہ کے لیے ہی ہو جائے۔ پھر اگر وہ لوگ رُک جائیں تو (تم بھی رُک جاؤ) اللہ اُن کے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔

دوران جنگ میں اگر فریق مخالف آمادہ صلح ہو تو حکم ہے کہ مسلمانوں کو بھی صلح کر لینی چاہیے

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔

اگر وہ لوگ صلح پر آمادہ ہوں تو آپ بھی ہو جائیے۔ اور اللہ پر توکل کیجیے۔

قانون جنگ کی اصل

قانونِ جنگ میں اصل ایک حدیث ہے جس کو سلیمان بن بریدہ نے اپنے والد سے روایت کیا ہے۔ بخاری کے علاوہ ایک جماعت اس حدیث کی راوی ہے اور وہ یہ ہے :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی شخص کو کسی لشکر یا کسی ٹولی کا سردار بناتے تھے تو اُس کو حکم فرماتے تھے کہ "اللہ سے ڈرتے رہنا۔ تمہارے ساتھ جو مسلمان ہیں اُن سے اچھا برتاؤ کرنا" پھر فرماتے :" اللہ کے راستے میں اللہ کا نام لے کر جہاد کرو، جنہوں نے اللہ کے ساتھ کفر کیا ہے اُن سے جنگ کرو، غزوہ کرو مگر خیانت نہ کرو، دھوکہ نہ دو، کسی کو مُثلہ[1] نہ بناؤ، بچہ کو قتل نہ کرو جب تم اپنے دشمن مشرکوں سے ملو تو اُن کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کو قبول کرنے کی دعوت دو۔ ان میں سے کسی ایک کو قبول کر لیں تو اُن کی بات کا یقین کر لو، اور اپنا ہاتھ اُن سے روک لو۔ اُن کو اسلام کی طرف بلاؤ۔ اگر وہ اس

[1] ناک کان کاٹ دینا

کو قبول کرلیں تو تم اُن کی بات مان لو اور اُن سے اپنے ہاتھوں کو روک لو۔ پھر تم اُن سے کہو کہ وہ اپنے وطن سے دار مہاجرین کی طرف ہجرت کر جائیں۔ اگر وہ اس کو نہ مانیں تو تم اُن کو بتا دو کہ اُن کے ساتھ اعراب مسلمین کا سا برتاؤ کیا جائیگا، اور اُن کو فئے اور غنیمت میں حصّہ نہیں ملیگا۔ اگر وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کریں تو اُن سے کہو کہ جزیہ دیا کریں اگر وہ اس کو مان لیں تو خیر، اُن کی بات قبول کرلو۔ اور اُن سے اپنے ہاتھوں کو روک لو۔ اگر وہ جزیہ ادا کرنے سے انکار کریں تو اللہ سے مدد مانگو۔ اور اُن سے جنگ کرو، اور جب تم کسی قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے ہو اور وہ لوگ چاہیں کہ تم اُن کو اللہ اور اُس کے رسول کا ذمہ دے دو۔ تو تم اُن کو اللہ اور اُس کے رسول کا ذمہ نہ دو۔ بلکہ اپنا اور اپنے ساتھیوں کا ذمہ دے دو۔ کیونکہ تم اپنا اور اپنے ساتھیوں کا ذمہ توڑ دو یہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ تم اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ توڑ دو" اس حدیث کی بنیاد پر اسلام کا جو عمومی قانون جنگ ہے اُس کی چند جزئیات یہ ہیں۔

(۱) آغازِ جنگ سے قبل ضروری ہے کہ مسلمان اپنی دعوت عام اُن لوگوں تک پہنچا دیں جن کو اب تک نہیں پہنچی ہے۔ اگر اس کے بغیر اُنہوں نے قتال شروع کر دیا تو جتنے لوگ قتل ہونگے اُن کی دیتیں دینی ہونگی۔

(۲) عورتوں، اور بچوں، اور گرجوں میں عبادت کرنے والوں، اور صومعہ کے راہبوں کو اور سن رسیدہ لوگوں، اپاہجوں، اور بیماروں کو اور اُن لوگوں کو جنہوں نے جنگ میں کوئی حصّہ نہیں لیا ہے، قتل کرنا جائز نہیں۔

(۳) غلاموں اور نوکروں اور تیمارداروں کا قتل کرنا منع ہے۔

(۴) دھوکہ دہی اور مقتولین کو مثلہ بنانا ممنوع ہے۔ اسی طرح کسی زندہ یا مردہ کو جلانا، پھلوں کو خراب کرنا، کھیتوں کو برباد کر دینا، گھروں کو آگ لگانا سامانوں کو نذرِ آتش کرنا، یا اس کے علاوہ اور نازیبا ہلاکت آفریں حرکات کا ارتکاب کرنا ممنوع ہے۔

(۵) درختوں کا کاٹنا اور پانی میں زہر ملا دینا بھی ناجائز ہے۔[1]

جہاد بے اجر | یہ بار بار فرمایا گیا ہے کہ جہاد کی اصل غرض فتنہ و فساد کا مٹانا ہونی چاہیے اُس سے باندی غلاموں کا حاصل کرنا، یا مالِ غنیمت کے پانے کی توقع کرنا جہاد کے اجر و ثواب سے محرومی کا باعث ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا "یا رسول اللہ ایک شخص ہے جو اللہ کے راستہ میں جہاد کرتا ہے اور ضمنی طور پر کسی دنیوی منفعت کا بھی خواستگار ہے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لَا اَجْرَ لَہٗ "اُس کے لیے کوئی اجر و ثواب نہیں ہے"۔ ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے اس بات کو بہت بُرا خیال کیا اور اُس شخص سے کہا کہ حضور کی خدمت میں پھر دوبارہ حاضر ہو اور یہی سوال کر شاید کہ تو نے حضور کے کلام کو سمجھا نہیں ہے۔ وہ شخص دوبارہ آیا اور یہی سوال کیا۔ آپ نے اس مرتبہ بھی جواب میں وہی فرمایا۔ لَا اَجْرَ لَہٗ "اس کے لیے کوئی اجر نہیں ہے"۔ اس دفعہ پھر وہی صورت ہوئی۔ لوگوں نے اُس سے کہا کہ تیسری مرتبہ اور جا شاید تو کلامِ نبوت کو سمجھ نہیں سکا ہے۔ وہ پھر آیا، اور وہی سوال کیا۔ آپ نے اس دفعہ بھی وہی جواب دیا "اس کے لیے کوئی

[1] السیاسۃ الشرعیۃ لعبد الوہاب الخلاف ص ۸۹-۹۰

اجر نہیں ہے[1]"

اب غور کیجیے کہ جہاد اُسی وقت شروع ہوتا ہے جبکہ فتنہ کا زور شور ہو۔ پھر مسلمان جہاد میں جاتے ہیں تو صرف اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے کسی دنیوی منفعت کے حصول کے لیے نہیں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ایک طرف تو بتایا جاتا ہے کہ باندی غلام صرف وہی زن و مرد ہو سکتے ہیں جو جنگ میں گرفتار کیے جائیں۔ اور دوسری جانب یہ ہدایت ہے کہ جنگ میں شریک ہوں تو محض اللہ کے لیے۔ باندی غلام یا کسی اور منفعت دنیوی کی خاطر نہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اول تو جنگ میں لوگوں کو گرفتار کرنے کی سعی کم ہوگی اور تھوڑے بہت جو گرفتار ہوں گے بھی اُن کو غلام بنانے کی خواہش کوئی نہ کریگا۔ کیونکہ اُن کو ڈر یہ ہوگا کہیں اس منفعت کا حصول اُن کے اجر و ثواب جہاد کے فقدان کا باعث نہ ثابت ہو۔ بنظر انصاف دیکھیے تو استرقاق کے باب میں یہی اسلام کی حکمت نہیں ہے کہ اول تو غلام بنانے کی تمام راہوں کو مٹا کر اور اُن کو ممنوع و محظور قرار دے کر صرف ایک راہ کو باقی رکھا۔ اور پھر اس کا بھی یہ حال ہے کہ بار بار مختلف پیرایہائے بیان کے ساتھ بتایا جاتا ہے کہ اس راہ پر چلنے کی غرض باندی غلام وغیرہ کا حاصل کرنا نہیں بلکہ محض خالصۃً لوجہ اللہ ہونا چاہیے[2] پھر اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہے کہ اگر تمہارے دشمن آمادہ بہ صلح ہوں تو تم بھی اُن سے صلح کرلو، اور نتائج و عواقب کی پروا ذرا نہ کرو۔ اللہ پر توکل رکھو۔ ظاہر ہے مسلمانوں اور اُن کے دشمنوں میں صلح ہو جائیگی تو پھر باندی غلام کیونکر مل سکینگے؟ جیسا کہ عہد فاروقی میں متعدد

---

[1] سنن ابی داؤد باب فی من یغزو ویلتمس الدنیا۔ [2] تفصیل آگے آتی ہے۔

مرتب ہوا۔[1]

اسلام میں وحدتِ انسانی

غلاموں سے متعلق اسلام کی دوسری اہم اصلاح یہ ہے کہ اُس نے غلامی کا تخیل بالکل ہی بدل دیا۔ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ یونان و روم کے فلاسفہ اور علما بھی غلام کو ایک جسدِ بارُوح، اور ایک آلۂ متحرک کہا کرتے تھے۔ اور جس طرح ہندو شودروں کو سمجھتے تھے کہ وہ

---

[1] یہ صرف قرآن مجید کی خصوصیت ہے کہ اُس میں مالِ غنیمت حاصل کرنے اور لونڈی غلام بنانے سے سکوت اختیار کیا گیا ہے، ورنہ دوسرے مذاہب کی آسمانی کتابوں میں اس کا نہ صرف ذکر ہے بلکہ مالِ غنیمت حاصل کرنے کا امر فرمایا گیا ہے۔ تورات میں ہے "جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لیے پہنچے تو پہلے اُس کو صلح کا پیغام دے تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور، اور دروازہ تیرے لیے کھول دے تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے تیری باج گزار ہوگی اور تیری خدمت کریگی، اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو تو اُس کا محاصرہ کر۔ جب خداوند خدا تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کر دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور بچوں اور جانوروں کو جو کچھ اس شہر میں ہو اپنے لیے غنیمت کے طور پر لے لے۔ (استثنا باب ۲۰ آیۃ ۱۰-۱۴)

ہندو مذہب کے منتروں میں اس مضمون کے منتر کثرت سے ملتے ہیں جن میں مالِ غنیمت حاصل کرنے اور غلام بنانے کو اچھا کہا گیا ہے۔ اور اندر کی تعریف صرف اس بنا پر کی گئی ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو کثرت سے لونڈی غلام دیتا ہے۔ ایک منتر میں ہے "اے اگنی تیرے مالدار بجاری خوراک حاصل کریں اور امرا بڑی عمریں پائیں۔ ہم اپنے دشمنوں سے لڑائی میں مالِ غنیمت حاصل کریں اور دیوتاؤں کو اُن کا حصہ نذر کریں۔ اے اگنی! ہم تیری مدد سے گھوڑوں کے ذریعہ گھوڑے، آدمیوں کے ذریعہ آدمی (یعنی غلام) اور بہادروں کے ذریعہ بہادر فتح کریں"

(۱: ۷۳: ۵-۹)

ایک اور منتر میں ہے: "اے اندر! ہم کو بہادرانہ سطوت عطا کر، آزمودہ کاری، اور اس روز افزوں قوت کے ساتھ جو مالِ غنیمت حاصل کرتی ہے تیری مدد سے ہم جنگ میں اپنے دشمنوں کو مغلوب کریں۔ چاہے وہ اپنے ہوں یا پرائے۔ ہم ہر دشمن پر فتحمند ہوں اے بہادر! ہم تیری مدد سے دونوں قسم کے دشمنوں کو قتل کر کے خوشحال ہوں، بڑی دولت کے ساتھ۔ (۶: ۱۹: ۸-۱۳) (بحوالۂ الجہاد فی الاسلام)

برہمنوں کی خدمت ہی کے لیے بید کیے گئے ہیں یا قوام متمدنہ بھی یقین کرتی تھیں کہ غلام صرف آقاؤں کی خدمت کے لیے خلق ہوئے ہیں اور اُن کی حیثیت ایک ذاتی جاگیر Property اور ایک پالتو جانور Chattel سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن اسلام نے ایک غلام کو بالکل اُس کے آقا کی طرح ایک صاحبِ حس وشعور انسان مانا ہے، اور مختلف طریقوں سے اُس قدیم ذہنیت کو یکسر تبدیل کردیا ہے جو غلاموں اور باندیوں سے متعلق ہر قوم و مذہب کے افراد میں پائی جاتی تھی۔

اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو عام انسانوں سے متعلق ہیں۔ اُن کے ماتحت غلام بھی داخل ہو جاتے ہیں۔ اور دوسری تعلیمات وہ ہیں جو خاص غلاموں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم دونوں کو علی الترتیب بیان کرتے ہیں

اسلام کا یہ طغرائے امتیاز ہے کہ اُس نے رنگ ونسل اور قوم و وطن کے تمام امتیازات کو یک قلم اُٹھا کر تمام انسانوں کو ایک برادری اور ایک جماعت سمجھا ہے۔ ایک انسان کو کسی دوسرے انسان پر تفوق اور برتری اعمال صالحہ اور ایمان محکم کی وجہ سے تو ہوسکتی ہے، لیکن امارت وریاست سفید فامی کسی بچھے اور بڑے شہر سے نسبت ان میں سے کوئی ایک چیز بھی بزرگی اور شرافت کا دار مدار نہیں ہے۔ تمام انسانوں کو خطاب کر کے قرآن مجید صاف و صریح اعلان کرتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ.	اے لوگو ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے۔

پھر لوگوں میں جو قبائل کا اختلاف پایا جاتا ہے تو اُس کے متعلق ارشاد ہے۔

وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا	اور ہم نے تم کو جو مختلف قبیلوں اور گروہوں میں تقسیم کیا ہے
إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ	تو اس لیے کہ ایک دوسرے سے متعارف ہوسکو ورنہ تحقیق
	اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم تو وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے

اسی آیت کی شرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح فرماتے ہیں۔

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی	نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے۔ اور نہ عجمی کو عربی پر۔ اور نہ سفید
عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود	فام کو سیاہ رنگ پر ترجیح ہے اور نہ سیاہ رنگ کو سفید فام پر
علی احمر الا بالتقوی [1]	مگر ہاں فضیلت صرف تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں جو مشہور خطبہ ارشاد فرمایا تھا اُس میں آپ نے فرمایا۔

انّ اللہ اذھب عنکم عیبۃ الجاھلیۃ	اللہ نے تم سے عہد جاہلیت کے غرور اور باپ دادوں پر
وفخرھا بالاٰباء انما ھو مؤمن تقیّ	فخر کرنے کو مٹا دیا۔ انسان اب یا تو پرہیزگار مومن ہے یا بد
وفاجرٌ شقیٌّ النّاس کلّھم بنو اٰدم و	نصیب گنہگار رہے۔ تمام لوگ آدم کے بیٹے ہیں، اور آدم

[1] الاسلام روح المدنیۃ ص۱۴۷ اسی حدیث کے قریب قریب ایک اور حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں لیس للعربی فضلٌ علی العجمی ولا للعجمی فضلٌ علی العربی کلکم ابناء اٰدم واٰدم من تراب۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے خطبات مدراس میں اس کو نقل کر کے مسند احمد کا حوالہ دیا ہے لیکن تعجب ہے کہ سیرت النبی جلد اص ۵۳ پر مولانا شبلی نے اس کو نقل کر کے عقد الفرید کا حوالہ دیا اور مولانا سید سلیمان ندوی نے اُس پر جو نوٹ لکھا ہے اُس میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ یہ فقرہ حدیث اور سیر کی کتابوں میں مجھ کو نہیں ملا

۱۔ خُلِق مِنْ تُراب۔ مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں۔

(ابوداؤد باب التفاخر بالاحساب)

وہ لوگ جو اپنی تونگری اور آقائی پر ناز کرتے ہیں اور اپنے سے کمزور و ناتواں انسانوں کو ذلیل و حقیر سمجھنے کے عادی ہیں قرآن مجید اُن کو متنبہ کرتا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ہم نے انسان کو بالتحقیق محنت میں بنایا و پیدا کیا ہے۔

یعنی انسان کو چاہیے کہ کسی وقت اس حقیقت سے غافل نہ رہے کہ کسی قدر مراتب تھوڑی بہت تکلیف اور دکھ ہر ایک کو ہوتا ہے پھر اس کے بعد ارشاد ہے۔

اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْہِ اَحَدٌ کیا انسان سمجھتا ہے کہ کوئی اُس پر قادر نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو اپنی توانائیت سے گھمنڈ میں نہیں سمجھنا چاہیے کہ اُس کو تو اپنے ماتحتوں اور غلاموں پر قدرت حاصل ہے لیکن خود اُس پر کسی کو قدرت نہیں ہے۔

وحدتِ انسانی کی یہ عام تعلیم ہے جو آپ کو جگہ جگہ ملے گی اور جس کا حاصل یہ ہے کہ انسان سب برابر ہیں۔ اُن میں رنگ و نسل، اور حاکمیت و محکومیت اور آقائی و غلامی کا امتیاز کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ تحقیر آمیز و یا نہ اور حقارت انگیز معاملہ کرے۔

غلاموں کا سلامتی تحفظ

اس عام تعلیم کے علاوہ خاص غلاموں کے لیے الگ اور جداگانہ تعلیمات بھی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ غلام تمہارے بھائی ہیں اُن کے ساتھ برادرانہ معاملہ کرو۔

معرور بن سوید سے روایت ہے کہ ہم مقام ربذہ میں حضرت ابوذر غفاری کے پاس حاضر ہوئے تو دیکھا کہ ان پر ایک چادر ہے۔ اور اسی طرح کی ایک چادر ان کا غلام اوڑھے ہوئے ہے۔ ہم نے کہا کہ اگر آپ اپنے غلام کی چادر بھی خود ہی استعمال کر لیتے تو پورا ایک لباس (حُلہ) ہو جاتا۔ اور اس کو کوئی اور کپڑا پہنا دیتے۔ آپ نے فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے، فرماتے تھے:-

اخوانکم جعلهم الله تحت ایدیکم	تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں جن کو خداوند تعالیٰ نے تمہارے
فمن کان اخوه تحت یدیه فلیطعمه	قبضہ میں کر دیا ہے پس جس کا بھائی اُس کے قبضہ میں ہو
مما یاکل ولیلبسه مما یلبس ولا	اُسے چاہیے کہ جو خود کھائے وہ اُسے کھلائے، جو خود پہنے وہ
یکلفه ما یغلبه فان کلفه ما یغلبه	اُس کو پہنائے اور اُس کو ایسے کام کی زحمت نہ دے جو اُس کے
فلیعنه [1]	لیے ناقابل برداشت ہو اور اگر دے تو چاہیے کہ خود بھی اُسکی امداد کرے۔

بعض روایتوں میں الفاظ یہ ہیں۔

ھٰٓؤلاء اخوانکم وخولکم — یہ تمہارے بھائی بھی ہیں اور خادم بھی۔

قاضی بیضاوی نے وقل للمومنات الیٰ قوله وما ملکت ایمانهن کی تفسیر کے ماتحت لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ کے پاس ایک غلام کو لیکر تشریف لائے جو آپ نے اُن کو ہبہ کر دیا تھا۔ اس وقت حضرت فاطمہ کے پاس اتنا چھوٹا کپڑا تھا کہ وہ اُس سے سر ڈھانکتی تھیں تو دونوں پیر کُھل جاتے تھے اور دونوں پاؤں چھپاتی تھیں تو

---

[1] ابوداؤد، نسائی، ابن ملوک و مسند احمد و بخاری و مسلم۔

سر کھلا رہتا تھا۔ یہ دیکھ کر آنحضرت نے فرمایا۔

لیس علیک بأس انما ھو ابوک کوئی مضائقہ نہیں یہ شخص تو تمہارا باپ ہے

آپ نے دیکھا! اس غلام کو تعظیماً کس کا باپ کہا جا رہا ہے؟ سیدہ فاطمہ زہراؓ کا جو عرب کی سب سے زیادہ شریف و نجیب خاتون ہیں، اور جو سید العرب والعجم کی لاڈلی اور چہیتی بیٹی ہیں اور پھر اس غلام کو باپ کس نے کہا؟ خود اس ذات گرامی نے جو خاتونِ جنت کا پدر بزرگوار تھا، اور جو ارشاد و ہدایت کے موئے قلم سے تاریخ عالم کے نقش و نگار کو درست اور تہذیب و اخلاق کے مٹے ہوئے نشانوں کو اجاگر کر رہا تھا۔ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ الف الف تحیۃ وسلام۔

غلام کو غلام مت کہو

غلام اپنے آقا کو رب کہے یا آقا اپنے غلام کو عبدی کہہ کر پکارے تو اس سے عُجب غرور کی بو آتی ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اسی لیے آپ فرماتے ہیں۔

لا یقولن احدکم عبدی وامتی ولا یقولن المملوک ربی وربتی ولیقل المالک فتای وفتاتی ولیقل المملوک سیدی وسیدتی فانکم المملوکون والرب اللہ عز وجل[1]	تم میں سے کوئی "میرا غلام" یا "میری باندی" نہ کہے اور نہ غلام "میرا رب" (پروردگار) اپنے مالک کو "میرے فتےٰ" "میری فتاۃ"[2] کہنا چاہیے، اور غلام کو چاہیے کہ "میرا سردار" یا "سردارنی" کہے کیونکہ تم سب مملوک ہو، اور رب تو سب کا اللہ تعالیٰ ہے —

[1] ابوداؤد۔ باب لا یقول المملوک ربی و ربتی

[2] عربی زبان میں لڑکے کو فتی اور لڑکی کو فتاۃ عموماً محبت کے وقت کہتے ہیں اور دوسری طرف سیدہ، سید بالعموم ایک دوسرے کو تعظیماً و تکریماً کہتے ہیں۔

اسلام میں غلاموں کے لیے جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں اُن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلام کا تخیل غلام کے متعلق یہ ہے کہ وہ حق ولایت نور کھتا نہیں اور اس کے علاوہ جتنے حقوق انسانی ہیں اُن سب کا وہ حقدار رہتا ہے چنانچہ حافظ ابن قیم فرماتے ہیں :-

فَاِنَّ السَّیِّدَ حَقُّہٗ فِیْ مَالِیَّۃِ الْعَبْدِ لَا فِیْ اِنْسَانِیَّتِہٖ ۔ اعلام لموقعین ج ۱ ص ۲۵ — سید کو غلام کی صرف مالیت میں حق ہے۔ اُس کی انسانیت میں نہیں۔

غلام کے لیے الفاظ مستعملہ

غلام کے لیے جو الفاظ بزبانِ اسلام بولے جاتے ہیں یہ ہیں :-

مولیٰ :- علامہ ابن اثیر نے نہایہ میں اس لفظ کے اتنے معانی بتائے ہیں رب، مالک، سردار، انعام کرنے والا، آزاد کرنے والا، مدد کرنے والا، محبت کرنے والا، تابعدار، پردیسی، چچا زاد بھائی، حلیف، ہم معاملہ، داماد، آزاد کیا ہوا غلام۔ وہ جس پر انعام کیا گیا ہو۔ (ج ۴ ص ۲۴۶)

فتیٰ :- اصلی معنی نوجوان ہیں غلام اور آزاد دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اس لفظ میں یک گونہ نرمی اور محبت پائی جاتی ہے۔

خادِمٌ :- خدمت کرنے والا۔ سنن ابو داؤد باب فی حق المملوک کے ماتحت جو احادیث درج ہیں اُن میں سے اکثر میں غلام کے لیے خادم کا لفظ بولا گیا ہے جس سے اُس کی معنوی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔ خدمت جس طرح غلام اپنے آقا کی کرتا ہے شاگرد اُستاد کی بیٹا باپ کی اور مرید اپنے مرشد کی کرتا ہے۔

عَبْدٌ :۔ صرف یہ ایک لفظ ایسا ہے جو حُر کے بالمقابل بولا جاتا ہے لیکن اوّل تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ سے غلام کو پکارنے اور بلانے سے ہی منع کر دیا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ عبد کو اللہ کی طرف مضاف کر کے احرار پر بھی بولتے ہیں۔

جَارِیہ :۔ اصل معنیٰ نوجوان لڑکی ہیں۔ باندیوں کے لیے یہ لفظ کثرت سے بولا جاتا ہے لیکن شریف اور نوجوان لڑکیوں پر بھی اس کا اطلاق ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے۔

فتاۃ :۔ اس کا حال بالکل "فتیٰ" کا سا ہے۔

اَمَۃٌ :۔ باندی۔ یہ عبد کا مؤنث ہے، اور اسلام میں اپنی باندی کو اَمتی کہہ کر بلانے سے منع کیا گیا ہے۔

یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ اُس نے غلاموں اور باندیوں کے لیے جو الفاظ بولنے پسند کیے ہیں اُن میں سے کسی سے غلام کی حسبی حقارت مترشح نہیں ہوتی اور یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غلام سب مسلمانوں سے الگ کوئی نیچ ذات ہے۔ اس کے برخلاف ہندوؤں میں شودر ایک الگ نیچ ذات ہے جس کا اطلاق کسی غیر شودر پر اس کی توہین کا سبب ہے۔ انگریزی میں غلام کو **Slave** کہتے ہیں جس سے ایک بالکل الگ ذلیل طبقہ کا تصور پیدا ہوتا ہے۔[1]

---

[1] علامہ طنطاوی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ سلاف روس کے ایک مجموعہ قبائل کو کہتے ہیں۔ افرنگی نخاس ان لوگوں کو پکڑ پکڑ کے لیجاتے اور غلام بنا کر بیچ دیتے تھے۔ شروع شروع میں انہیں قبائل کے لوگ بکثرت لائے جاتے تھے یعنی سفید رو غلام، عربی میں اس کو معرب کر کے صقلبی کہنے لگے جس کی جمع صقالبہ ہے اسی سے فرنسیسی یا Esclave اور

(بقیہ برصفحہ ۱۰۲)

سلام کی اس پیدا کی ہوئی ذہنیت کا ہی نتیجہ تھا کہ حضرتِ عمر ایسا جلیل القدر خلیفہ بلال حبشی کو "مولانا"، "ہمارے آقا" کہہ کر پکارتا تھا، اور کہا کرتا تھا کہ "ہمارے آقا (حضرت ابوبکر) نے ہمارے آقا (بلال) کو آزاد کر دیا۔ سلمانؓ ایک فارسی النسل غلام تھے۔ غزوۂ خندق میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس دس گز کی حدود مقرر کر دیں تو سلمانؓ کے متعلق انصار اور مہاجرین دونوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ انصار کہتے تھے کہ سلمان ہمارے ساتھ رہینگے، اور مہاجر کہتے تھے کہ انہیں ہم اپنے ساتھ رکھینگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا سلمان تو ہمارے خاندان کا ایک فرد ہے (محمد ص ۲۸)

اب اس کے ساتھ ہی یہ بھی پیشِ نظر رکھیے کہ یہ تعلیم مساوات اور غلاموں سی برابری کا معاملہ کرنے کی تلقین اس زمانہ میں فرمائی جا رہی ہے جبکہ عرب اور اس کے باہر غلاموں کے ساتھ نہایت ذلت انگیز اور محقرانہ معاملہ کیا جاتا تھا۔ ذیل میں ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ عین ظہورِ اسلام کے زمانہ میں غلاموں کی کیا حیثیت تھی۔

سنہ ۶۱۱ء میں ہرقل کی تخت نشینی کے تھوڑے عرصہ بعد جب اس کی بیوی یوڈوکسیا کا انتقال ہوا اور اس کا جنازہ قبرستان کی طرف لیجایا گیا تو اتفاقاً ایک باندی نے جنازہ کے ساتھ چلتے چلتے زمین پر تھوک دیا۔ اس قصور میں وہ فوراً گرفتار کر لی گئی اور اس کے قتل کا حکم صادر ہو گیا[۲]۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۰۱) اور جرمنی میں Eshlave اور انگریزی میں Slave بولا جاتا ہے۔ (تفسیر الجواہر ج ۲ ص ۱۵۶)

[۱] بخاری باب مولی القوم

[۲] Byzantine empire, P 99

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل

اوپر گذر چکا ہے کہ عرب کے لوگ جنگ میں غلام اور باندی حاصل کرنے کے کتنے شوقین تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طرزِ عمل سے اُن کے اس شوق کو بہت کم کیا کالعدم کر دیا۔ غزوات پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ نے اکثر و بیشتر مواقع پر اسیرانِ جنگ کے ساتھ من و فدا کا معاملہ کیا

غزوۂ بدر

غزواتِ نبوی میں غزوۂ بدر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں متعدد جلیل القدر صحابہ شہید ہو گئے تھے جن کا آپ کو بڑا رنج و ملال تھا۔ لیکن اس کے باوجود جو کفار میدانِ جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے آپ نے اُن سے بہت رفق و لین اور لطف و مدارات کا معاملہ کیا:

آنحضرتؐ نے اُن کو اپنے اصحاب میں تقسیم کر دیا تھا، ابوعزیز بن عمیر جو اس جنگ میں مشرکین کا علمبردار تھا کہتا ہے کہ میں انصار کے ایک گروہ میں تھا۔ یہ لوگ بدر سے مجھ کو ساتھ لائے تھے۔ انصار جب اپنا شام کا اور صبح کا کھانا لاتے تھے تو خود کھجور پر گزارہ کرتے تھے اور مجھے روٹی کھلاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔[1]

نضر بن الحارث العبدری اور عقبہ بن ابی معیط اسلام کی دشمنی میں سب سے پیش پیش تھے اور اُن کا وجود ملک کے امن و امان کے لیے سخت خطرہ کا باعث تھا۔ اس بناء پر آپ نے اُن کو تو قتل کرا دیا، اور اُن کے علاوہ جتنے قیدی تھے اُن میں سے بعض کو معاوضہ لے کر اور

---

[1] تاریخ الاسلام السیاسی۔ ج ۱ ص ۲۳۴۔

بعض کو بغیر معاوضہ ہی رہا کر دیا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن قیدیوں کی بلامعاوضہ رہائی کا حکم دیا تھا اُن میں ابو عزہ عمرو الجحمی بھی تھا جو عرب کا مشہور شاعر تھا اور آنحضرت کی شان میں انتہا درجہ کی گستاخانہ نظمیں لکھ لکھ کر آپ کو اذیت پہنچاتا تھا۔

غزوۂ حُنین

غزوۂ حُنین میں چھ ہزار قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ آپ نے اُن سب کو مقامِ جعرانہ میں بڑی حفاظت کے ساتھ رکھا دیا۔ اور اس بات کا انتظار کرتے رہے کہ اُن کے اعزا و اقربا، اُن کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے آپ کے پاس آئیں ابھی آپ نے کوئی قطعی حکم نہیں فرمایا تھا کہ قبیلۂ ہوازن کے چودہ آدمی زہیر بن صُرد کی زیرِ سرکردگی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قیدیوں کو آزاد کر دینے کی درخواست کی۔ اسی وفد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی چچا ابو برقان بھی تھے۔ آپ نے وفد کی درخواست پر فرمایا کہ مجھ کو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے لیکن میں تمام مسلمانوں سے ان کے لیے سفارش کرتا ہوں مہاجرین و انصار بولے "ہمارا حصہ بھی حاضر ہے"۔ اس طرح چھ ہزار قیدی یک لخت و یک قلم آزاد تھے۔ (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۴۹۵)

غزوۂ بنی المصطلق

اس غزوہ میں چھ سو قیدی گرفتار ہو کر آئے، اُن میں عرب کے ایک سردار حارث کی بیٹی حضرت جویریہ بھی تھیں جو ثابت بن قیس کے حصہ میں آئی تھیں اُنھوں نے ثابت سے کہا کہ مکاتبت کر لو یعنی مجھ سے کچھ روپیہ لے کر مجھ کو آزاد کر دو۔ ثابت نے اُسے منظور کر لیا۔ لیکن حضرت جویریہ کے پاس روپیہ نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آپ نے فرمایا۔ اگر میں تمہاری طرف سے زرِ مکاتبت ادا کر کے تم کو اپنی زوجیت

میں سے لوں تو اس میں تمہاری کیا رائے ہے۔ جویریہ نے اس کو پسند کیا اور آپ نے اُن سے نکاح کر لیا۔ اس نکاح کا اثر یہ ہوا کہ تمام اسیرانِ جنگ دفعۃً آزاد کر دیے گئے مسلمانوں نے کہا کہ جس خاندان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کی ہو وہ غلام نہیں بن سکتا۔

فتح مکہ | فتح مکہ کی جنگ میں بھی یہی ہوا۔ فتح کے بعد جب قریش کے بڑے بڑے سردار جو آپ کے جانی دشمن رہے تھے اور جنہوں نے ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا دوسرے کفار نابکار کے ساتھ گرفتار ہو کر حضور کی خدمت اقدس میں پیش ہوئے تو آپ نے ان سب کو معاف کر دیا، اور کسی کو غلام یا باندی نہیں بنایا۔ وحشی بن حرب جس نے آنحضرت کے نہایت محبوب چچا حضرت حمزہ کو شہید کیا، عتبہ کی بیٹی ہندہ جو فرط غضب و جوش انتقام سے بے قابو ہو کر حضرت حمزہ کا کلیجہ نکال کر چبا گئی تھی، ابوجہل کا بیٹا عکرمہ جو خود بھی بڑا دشمن اسلام تھا۔ ان کے علاوہ عبداللہ بن ابی سرح، سارہ اور کعب بن زہیر جو اسلام دشمنی میں سرخیل اہل کفر و شرک تھے یہ سب رحمتِ عالم کی رحمتِ جان بخشی سے شادکام ہوئے۔

غزوۂ طائف | ۸ھ میں آپ نے اپنی فوج کے ساتھ طائف کا محاصرہ کیا اور مشرکین کے جتنے غلام آپ کے پاس آئے آپ نے سب کو آزاد کر دیا۔

حضرت ابنِ عباس کے الفاظ یہ ہیں:۔

اعتق صلی اللہ علیہ وسلم یوم الطائف ... طائف کے دن مشرکوں کے جتنے غلام حضور کے پاس

لہ ابوداؤد کتاب العتاق۔

كُلُّ من خرج اليه من رقيق المشركين آئے آپ نے سب کو آزاد کر دیا۔
اور صرف اُن کے آزاد کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ آن آزاد شدہ غلاموں سے ایک ایک کو ایک ایک مسلمان کے سپرد کر دیا کہ وہ اُس کے اخراجات کا متحمل ہو۔ وَدفع كُلَّ رجل منهم الى رجلٍ مِن المسلمين يمونه چنانچہ ابوبکرہ عمرو بن سعید کو۔ ارزق خالد بن سعید کو وردان ابان بن سعید کو، بنال عثمان بن عفان کو، یسار سعد بن عبادہ کو اور ابراہیم اسید بن حضر کو سپرد کیے گئے اور اُن کے متعلق مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ انہیں قرآنِ مجید پڑھائیں اور سُنن کی تعلیم دیں۔

پھر جب ثقیف کے لوگ مسلمان ہو گئے تو اُن کے زعماء نے چاہا کہ ان آزاد کردہ غلاموں کو اُن کی غلامی میں واپس دیدیا جائے لیکن حضرت رسالتماب نے فرمایا:۔
أُولٰئِكَ عُتَقَاءُ اللهِ لا سبيل اليهم یہ اللہ کے آزاد کردہ ہیں اب ان پر کوئی زور نہیں چل سکتا۔

حضرت انس سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ مکہ کے چالیس آدمیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ پر فجر کی نماز کے وقت حملہ کیا۔ آنحضرت نے اُن کو گرفتار کر لیا، اور پھر آزاد کر دیا[2]۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجد کی طرف ایک لشکر روانہ کیا۔ یہ واپس آیا تو قبیلۂ بنو حنیفہ کا ایک شخص جس کا نام ثمامۃ بن اثال تھا اپنے ساتھ گرفتار کر کے لایا۔ ثمامہ اہل یمامہ کا سردار تھا صحابہ نے اُس کو ایک

[1] زرقانی شرح لمواہب اللدنیہ للقسطلانی ج ۳ ص ۳۷ [2] احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذی

ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو ثمامہ کو دیکھ کر فرمانے لگے، ثمامہ بول! تیرے پاس کیا ہے؟ اُس نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو اختیار ہے، اگر آپ قتل کرینگے تو ایک ایسے شخص کو قتل کرینگے جو واجب الدم ہے، اور اگر آپ احسان کرینگے تو ایک ایسے شخص کے ساتھ احسان کرینگے جو آپ کا شکر گزار رہیگا۔ اس کے علاوہ اگر آپ مال چاہتے ہیں تو کہیے جتنا مال آپ طلب کرینگے دے دیا جائیگا آپ نے حکم دیا، "ثمامہ کو رہا کر دیا جائے"۔ آزاد ہونے کے بعد پھر مسجد کے قریب ایک نخلستان تھا، وہاں آیا، غسل کیا اور مسجد میں داخل ہو کر کلمۂ توحید پڑھا اور مشرف باسلام ہوا[1]۔

صلح حدیبیہ میں ستر قیدی ہاتھ آئے۔ آپ نے اُن کو بھی بغیر کسی معاوضہ اور شرط کے آزاد کر دیا[2]۔

سنہ ۶ھ میں آپ نے زید بن حارثہ کی زیر سرکردگی چالیس آدمیوں کی ایک جماعت جموم کی طرف روانہ کی جس نے قبیلہ مزینہ کی ایک عورت حلیمہ اور اُس کے شوہر کو گرفتار کر کے آپ کی خدمت میں حاضر کیا۔ آپ نے میاں بیوی دونوں کو آزاد کر دیا[3]۔

اسی سنہ کے ماہ جمادی الاخریٰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کی زیر قیادت ایک اور لشکر حسمیٰ کی طرف روانہ کیا، اور اُس نے بھی متعدد لوگوں کو گرفتار کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو ان لوگوں کے مال واپس کرا دیے۔ اور قیدیوں کو رہائی کا حکم دے دیا[4]۔

---

[1] یہ روایت متفق علیہ ہے دیکھو نیل الاوطار [2] اصح السیر ۹۸ [3] ابن سعد جلد ۲ ص ۱، [4] ابن اثیر ج ۲ ص ۸۰

سلمۃ بن اکوع کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو چند آدمیوں کے ساتھ بنوفزارہ کے مقابلہ میں بھیجا۔ قتل و قتال میں مسلمانوں نے بنوفزارہ کی ایک عورت اور اُس کے ساتھ اُس کی ایک بیٹی کو جو عرب کی حسین لڑکیوں میں سے تھی گرفتار کیا۔ ابوبکر نے وہ لڑکی سلمۃ بن اکوع کو دیدی۔ سلمۃ اُس کو لیے ہوئے مدینہ آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی آپ نے فرمایا۔ سلمۃ! یہ لڑکی تو مجھے دیدے۔ سلمہ اُس وقت تو خاموش ہو گئے، لیکن دوسرے دن حاضر ہو کر وہ جاریہ آپ کو ہبہ کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے مسلمان قیدیوں کا فدیہ بنا کر مکہ بھیجدیا اور اس طرح وہ آزاد ہو گئی۔[1]

اس طرح کے واقعات کثیر ہیں اُن سب کا ذکر باعث طوالت ہوگا۔ حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام غزوات و سریات پر نظر ڈالنے سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے اکثر و بیشتر مواقع پر مختلف عنوانات سے اسیرانِ جنگ کو غلام نہیں بنایا۔ اور اُن کو رہا کر دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض موقعوں پر استرقاق کبھی عمل میں آیا ہے لیکن اُس کی وجہ وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں یعنی اُس عہد کا عام دستور اور رسم استرقاق کو یک قلم مٹا دینے پر لوگوں کا رضامند نہ ہونا۔

حضرت عمرؓ کا طرزِ عمل حضرت عمر جو شریعت کے رمزداں تھے اس نکتہ کو سمجھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے عہد میں اس رواج میں زبردست اصلاح کی۔ مولانا شبلی الفاروق میں لکھتے ہیں کہ "حضرت عمرؓ نے اگرچہ غلامی کو معدوم نہیں کیا اور شاید اگر کرنا بھی چاہتے تو نہیں کر سکتے تھے۔

[1] ابن اثیر ج ۲ ص ۷۹۔

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اُنھوں نے مختلف طریقوں سے اس رواج کو کم کر دیا اور جس قدر قائم رکھا اس خوبی سے رکھا کہ غلامی غلامی نہیں بلکہ برادری اور ہمسری رہ گئی۔

عرب سے غلامی کا خاتمہ

حضرت عمرؓ نے عنانِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی حکم دیا کہ حضرت ابوبکر کے عہد میں قبائل مرتدہ کے جو لوگ لونڈی غلام بنائے گئے تھے سب آزاد کر دیے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ اصول قائم کر دیا کہ اہل عرب کبھی غلام نہیں بنائے جا سکتے[1]۔

عہدِ جاہلیت کے غلاموں کی آزادی

اس کے علاوہ وہ لوگ جو عہدِ جاہلیت میں گرفتار کر کے غلام بنا لیے گئے تھے اور اُنھوں نے زمانۂ اسلام کو پایا تھا حضرت عمر نے اُن کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی کہ وہ اپنی قیمت اپنے مولی کو ادا کر دیں ورآزاد ہو جائیں یعنی آقا خواہ راضی ہو یا نہ ہو بہرحال غلام مکاتب سمجھا جائیگا اور بدل کتابت ادا کر کے آزاد ہو جائیگا[2]۔

ذمی غلام نہیں ہو سکتا

امام بخاری نے ایک باب کا ترجمہ باندھا ہے لا یُسْتَرَقُّ اهل الذمة یعنی ذمی لوگوں کو غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ اس ترجمہ کے ماتحت ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا "میں ذمی کے متعلق اللہ اور اُس کے رسول کے ذمہ کو یاد دلاتا ہوں" حافظ ابن حجر نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اگر ذمی عہد شکنی کریں، اور اُن سے جنگ ہو تب بھی اُن کو غلام نہیں بنایا جا سکتا[3]۔

ام ولد کی بیع

حضرتِ عمر کے عہد سے پہلے ام ولد کی یعنی وہ باندی جس کے بطن سے اُس کے

---

[1] الفاروق [2] نہایہ ابن اثیر ج ۳ ص ۶۸ [3] فتح الباری ج ۵ ص ۱۲۷۔

تو وہ بچہ پیدا ہوا ہو، بیع و شرا ہوتی تھی لیکن آپ نے اپنے عہد خلافت میں اس کو بالکل بند کر دیا۔ جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر کے اس حکم کے بعد ہم سب نے امہات الاولاد کی بیع و شرا سے توبہ کرلی[۱]۔ اس کی تفصیلی بحث آگے آئیگی۔

عبد سے مکاتبت کرنا واجب ہے

حضرت عمرؓ نے غلامی کا خاتمہ کرنے کی دوسری تدبیر یہ کی کہ قرآن مجید میں غلاموں کے متعلق جو حکم دیا گیا ہے کہ فَکَاتِبُوْھُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْھِمْ خَیْرًا۔ غلاموں سے مکاتبت کرلو اگر تم اُن میں بھلائی جانتے ہو۔ تو حضرت عمر فرماتے تھے کہ کاتبوھم میں صیغۂ امر وجوب کے لیے ہے۔

جنگ کی فتوحات کے وقت حضرت عمر کا عام طرز عمل

پھر سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ حضرت عمر کے عہد میمنت مہد میں عراق و شام اور مصر کے بڑے بڑے علاقے فتح ہوئے اور ان جنگوں میں جو لوگ گرفتار کیے گئے اُن کی تعداد لاکھوں سے متجاوز تھی لیکن ایک دو جگہوں کے علاوہ کہیں پتہ نہیں چلتا کہ آپ نے اسیرانِ جنگ کو غلام بنایا ہو۔

شام کے شہروں میں سے بُصریٰ، فِحل، حمص، دمشق، عسقلان، انطاکیہ اور طبریہ فتح ہوئے جہاں عیسائی رہتے تھے۔ اور مسلمانوں سے بڑے زور شور سے لڑے تھے لیکن ان میں غلامی کا بہت کم پتہ چلتا ہے۔ اکثر مقامات پر یہی ہوا ہے کہ دشمنوں نے مسلمانوں کو غالب ہوتے ہوئے دیکھا تو فوراً صلح کرلی، اور مسلمانوں نے اُن کو جان و مال کی امان دے دی۔

---

[۱] ابوداؤد باب فی عتق امہاتِ الاولاد

شام کے علاقوں میں غالباً صرف قیساریہ ایک شہر ہے جہاں واقدی کی روایت کے مطابق چار ہزار آدمی غلام بنائے گئے حضرت معاویہ نے ان لوگوں کو حضرت عمر کے پاس بھیجا تو آپ نے انہیں انصار کے یتیم بچوں پر تقسیم کر دیا۔ اور بعض کو مسلمانوں نے مختلف خدمات مثلاً کتابت وغیرہ پر مقرر کر دیا۔[۱]

صامغان، دراباذ، جندیسابور، ورشیراز میں جو معاہدہ ہوا تھا اُس میں صاف الفاظ یہ تھے

لا یقتلوا ولا یسبوا ولا یمنعوا طریقا یسلکونہ — اُن کو نہ قتل کیا جائیگا، نہ وہ باندی غلام بنائے جائینگے اور نہ اُس راہ سے روکے جائینگے جس پر وہ چل رہے ہوں۔

حضرت عمرو بن العاص کے صاحبزادے عبداللہ کی روایت ہے کہ مصر کا معاملہ لوگوں پر مشتبہ ہے۔ کوئی کہتا ہے بزور شمشیر فتح ہوا تھا اور کسی کا خیال ہے کہ صلحاً فتح کیا گیا تھا اصل یہ ہے کہ اہل مصر نے مسلمانوں کو غالب آتے ہوئے دیکھا تو مصالحت کی درخواست کی۔ چنانچہ عمرو ابن العاص نے جو صلحنامہ تحریر فرمایا اُس کے الفاظ یہ تھے:-

لا تباع نسائهم وابنائهم ولا تسبوا وان تقر اموالهم وکنوزهم فی ایدیهم[۲] — اُن کی عورتوں اور بیٹوں کو نہ بیچا جائیگا، اور نہ اُن کو باندی غلام بنایا جائیگا، اور اُن کے اموال اور خزانے اُن کے قبضہ میں ہی چھوڑ دیے جائینگے۔

مصر کے بعض دیہات کے آدمی جو مسلمانوں سے لڑے تھے غلام بنا کر مدینہ بھیجے گئے تو حضرت عمر نے اُن کو واپس کر دیا اور انہیں ذمی بنا لیا۔ بلاذری کی عبارت یہ ہے۔

---

[۱] فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ مصر ص ۱۴۵۔ [۲] فتوح البلدان ص ۲۲۲ [۳] فتوح البلدان ص ۲۲۳۔

فوقع سباءھم بالمدینۃ فردھم عمر بن الخطاب وصیّرھم وجماعۃ القبط اھلَ ذِمّۃٍ — اُن کے قیدی مدینہ میں آئے تو حضرت عمر بن الخطاب نے اُن کو لوٹا دیا، اور انہیں قبطیوں کو ذمّی کر لیا۔

(فتوح البلدان ص۲۲۲)

عراق و شام کے بعض علاقے بزور شمشیر فتح ہوئے تو اسلامی فوج نے اصرار کیا کہ باشندوں کو غلام بنا لیا جائے۔ اور زمین کو تقسیم کر دیا جائے حضرت بلال اور عبدالرحمٰن بن عوف اس پارٹی کے لیڈر تھے لیکن حضرت عثمان، طلحہ، عبداللہ بن عمر، اور انصار کے تمام اکابر اس پالیسی کے خلاف تھے خود حضرت عمر سخت مخالف تھے آپ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا "میری رائے یہ ہے کہ زمین کو اس کے غیر مسلم باشندوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دوں۔ ان کی زمین پر خراج اور اُن کی گردنوں پر جزیہ مقرر کر دوں اور اس طرح یہ زمین مسلمانوں کے سپاہیوں، بال بچوں اور آئندہ نسلوں کے لیے فے کے حکم میں ہو جائے۔ اب کیا آپ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ان غلاموں کو لوگوں کی ذاتی مِلک بنا دیا جائے۔ کیا آپ کے نزدیک شام، الجزیرہ، کوفہ، بصرہ اور مصر جیسے بڑے بڑے صوبوں کو تقسیم کر دینا ضروری ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو پھر لوگوں کے وظائف اور غرباء کے روزینے کہاں سے آئینگے؟"[1]

مہلب بن ابی صفرہ کہتے ہیں کہ ہم نے مناذر[2] کا محاصرہ کیا اور وہاں کے لوگوں کو گرفتار کر کے لونڈی غلام بنا لیا۔ حضرت عمر کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے لکھا۔

ان مناذر کقریۃٍ من قری السواد — حقیقت میں مناذر سواد کے دیہات کی طرح ہے۔ اس لیے تم

۱؎ کتاب الخراج امام ابی یوسف مطبوعہ مصر ص ۲۳ [illegible] ۔ وفتوح البلدان ص [illegible]

۲؎ خوزستان کا ایک علاقہ ہے۔ اس کے دو حصے ہیں [illegible] اور دوسرا [illegible] کہلاتا ہے۔

فَرُدُّوا عَلَيْهِمْ مَا اَصَبْتُمْ (فتوح البلدان ۳۰۶) نے جو کچھ لیا ہے اُسے واپس کردو۔

پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ مناذر کے لوگ مجوسی یعنی آتش پرست تھے لیکن اس کے باوجود حضرتِ عمرؓ نے ان کے ساتھ اہل کتاب کا سا معاملہ کیا۔ اور اُن کو ذمی بنا کر رکھا۔ مناذر کے گورنر کے نام حضرت عمرؓ نے جو فرمان ارسال کیا تھا اُس میں یہ صاف لکھا ہوا تھا:۔

خذ ممّن قِبلك من المجوس الجزية فان	تمہاری طرف جو مجوسی ہیں اُن سے جزیہ لو کیونکہ
رسول اللهِ صلى الله عليه وسلم اخذ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوسیوں سے
الجزية من مجوسِ هجر (کتاب الخراج مطبوعہ مصر ۱۲۹)	جزیہ لیا تھا۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد حضرت عمرؓ کے طرزِ عمل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غلام بنانے کی رسم کو کبھی بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا، اور اس کو رفع کرنے کے لیے تدریجی عمل اصلاح کے مطابق جو تدبیر ہو سکتی تھی اُس سے دریغ نہیں کیا گیا۔

وسائلِ حُریت و آزادی

اب دیکھو کہ جو لوگ اباحتِ استرقاق سے فائدہ اُٹھا کر باندی غلام رکھتے ہیں اور اس سے احتراز نہیں کرتے اُن کو کس کس طرح ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ باندیوں اور غلاموں کو آزاد کریں۔

افضل قربات | اس سلسلہ میں ایک عام اور مشہور حدیث ہے کہ:۔

من اعتق نسمۃً اعتق اللّٰہ لکل عضوٍ — جو شخص کسی ایک نفس کو آزاد کریگا۔ اللہ تعالیٰ اُس کے ہر ہر عضو کو

منہا عضوًا من النار (متفق علیہ من حدیث ابی ہریرۃ) — عبد معتق کے ہر ہر عضو کے بدلے میں دوزخ سے آزاد کریگا۔

بعض روایتوں میں اس کے ساتھ حتّٰی فرجہٗ بفرجہٖ کے لفظوں کا بھی اضافہ ہے اور اسی بناء پر فقہاء نے کہا ہے کہ مرد کو غلام اور عورت کو باندی آزاد کرنی چاہیے لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ فقہاء کا یہ ارشاد محض حدیث کے ظاہری الفاظ کی رعایت پر مبنی ہے۔ ورنہ مقصد یہ نہیں ہے کہ مرد باندی کو اور عورت غلام کو آزاد کرینگے تو انہیں کم ثواب ملیگا۔

علامہ حسین آفندی نے اپنی کتاب رسالۂ حمیدیہ میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد توسین میں لکھا ہے۔

کذا فی عقود الجواہر المنیفۃ عن حمادٍ عن ابراہیم قال وھذا حکمہٗ حکم المرفوع۔ ص ۱۳۱[1]۔ — ایسے ہی عقود الجواہر المنیفہ میں حماد سے اور اُنہوں نے ابراہیم سے روایت کی ہے اور فرمایا ہے کہ اس کا حکم حدیث مرفوع کا سا ہے۔

قرآن مجید کی سورۂ بقرہ میں جہاں ایمان اور اعمال صالحہ کو بیان کیا گیا ہے غلام کے آزاد کرنے کو نماز روزہ سے مقدم رکھا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ — لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے کہ جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر، اور فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور مال کی محبت کے باوجود اُس کو خرچ کرے رشتہ داروں پر یتیموں پر محتاجوں اور مسافروں پر

[1] اس کے بعد ہم نے خود کتاب مذکور کی مراجعت کی۔

وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّکٰوةَ۔ اور مانگنے والوں پر اور نیز خرچ کرے گردنیں چھڑانے پر اور نماز کو قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے

فِی الرِّقَابِ کا مطلب یہ ہے کہ جہاں اور بڑے بڑے عمل ہیں اُن میں ایک بڑا عمل نیک یہ بھی ہے کہ مال غلاموں کو آزادی دلانے میں خرچ کیا جائے۔ خواہ اُس کی صورت یہ ہو کہ عبد مکاتب (یعنی وہ غلام جس سے اُس کے آقا نے کچھ روپیہ ادا کرنے کے بعد آزاد کردینے کا وعدہ کیا ہے) کو بدل کتابت ادا کرنے میں مدد دی جائے۔ یا کوئی شخص اسیر ہے اُس کا زر فدیہ ادا کرکے اُسے آزاد کرالیا جائے۔ اور ایک تیسری صورت یہ ہے کہ غلام اس نیت سے خریدے جائیں کہ اُن کو آزاد کردیا جائیگا۔[1]

پھر سورۂ بلد میں یوں ارشاد ہے:۔

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ ۔ فَكُّ رَقَبَةٍ اور تم کو کس نے بتایا ہے کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ چھڑانا گردن کا اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ یا بھوک کے دن میں کسی بھوکے کو کھانا کھلانا۔

حضرت براءؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ والا مرتبت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ مجھ کو کوئی ایسا عمل بتا دیجیے جو جنت میں داخل کردے۔ آپ نے فرمایا۔

اَعْتِقِ النَّسَمَةَ وَفُكَّ الرَّقَبَةَ تو غلام آزاد کرا اور گردن چھڑا۔

اعرابی نے پوچھا: کیا "عتقِ نسمہ" اور "فکِ رقبہ" دونوں ایک نہیں ہیں۔ آپ نے

---

[1] روح المعانی ج ۲ ص ۴۱۔ "فی الرقاب" کے "فی" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس مال کا مالک غلاموں کو نہیں بنایا جائیگا بلکہ اُن کی گلوخلاصی میں اس کو صرف کیا جائیگا۔

فرمایا: نہیں، عتق نسمہ تو یہ ہے کہ تم خود کوئی غلام آزاد کرو اور فکّ رقبہ یہ ہے کہ کسی غلام کی گلو خلاصی میں اُس کی مدد کرو[1]۔

ان آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی بناء پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ غلام کو آزاد کرنا تمام صدقات و مبرات سے افضل ہے[2]۔ علامہ عبدالوہاب شعرانی اس مسئلہ کو لکھ کر فرماتے ہیں کہ یہ وہ مسئلہ ہے جس کو میں نے مسائل متفق علیہا میں سے پایا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید کی سورۂ بقرہ میں غلام کے آزاد کرنے کا ذکر نماز روزہ سے اور سورۂ بلد میں مساکین کو کھانا کھلانے سے مقدم لایا گیا ہے۔ محض تقدیم فی الذکر فضیلت کی دلیل نہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وجوہِ فضیلت میں سے ضرور ہے[3]۔

ان ترغیباتِ عتق پر سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود عامل تھے۔ اور آپ کے بعد صحابہ میں جو جتنا متمول ہوتا تھا اُسی قدر غلام زیادہ آزاد کرتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موالی آپ کے موالی میں زید بن حارثہ آپؐ کے محبوب ترین غلام تھے۔ یہاں تک کہ لوگ ان کو آپؐ کا لے پالک بیٹا کہتے تھے۔ آپؐ نے اِن کو آزاد کیا اور اپنی چچازاد بہن زینب سے ان کا نکاح کر دیا۔

ثوبان آپ نے ان کو بھی آزاد کر دیا تھا لیکن خانۂ رسالت کی جاروب کشی ان کے جسم میں اس درجہ سرائت کر گئی تھی کہ آزاد ہونے کے بعد بھی اس در کو نہ چھوڑا۔

ابو رافع ان کے نام میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں اسلم، اور بعض کا خیال ہے کہ ان کا

---

[1] یہ حدیث امام احمد، ابن حبان، ابن مردویہ اور بیہقی سب نے روایت کی ہے۔
[2] کتاب المیزان لعبدالوہاب الشعرانی۔ ج ۲۔ ص ۲۰۷۔ [3] روح المعانی ج ۲ ص ۴۲۔

نام ابراہیم تھا۔ عباس بن عبدالمطلب کے غلام تھے حضور کو ہبہ کر دیا، اور آپ نے اُنہیں آزادی عطا فرمادی۔

سلمانؓ فارسی | کنیت ابو عبداللہ تھی۔ اصبہان کے قریہ رامہرمز میں رہتے تھے قبیلۂ کلب کے بعض لوگوں نے ان کو گرفتار کر لیا جن سے وادی القریٰ کے قرب وجوار میں ایک یہودی نے ان کو خرید لیا۔ سلمانؓ نے اس سے مکاتبت کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض دوسرے بزرگوں نے ان کی اعانت کی اور یہ آزاد ہو گئے۔

ابوکبشہ | ابوکبشہ کنیت، اور نام سلیم تھا مکہ کے موالی میں سے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا۔

ابوضمیرہ | ایران کے بادشاہ بشتاسپ کی اولاد میں سے تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی خرید کر آزاد کر دیا۔

یسار | یونانی تھا، کسی غزوہ میں حضور کو مل گیا، آپؐ نے اس کو بھی آزاد کر دیا۔

جب آپؐ طائف کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، چار غلام آپ کے پاس آئے آپؐ نے اُن سب کو آزاد کر دیا۔ اُن میں ایک غلام کا نام ابوبکرہ تھا۔ لوگوں نے کہا بھی کہ یہ غلام غلامی کی مصیبت سے تنگ آکر بھاگ آئے ہیں لیکن آپؐ نے اِن کی بات نہ مانی اور ان چاروں غلاموں کو آزادی دے دی۔

رُویفع | مدینہ کے لوگوں میں تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی خرید کر آزاد کر دیا تھا[1]

---

[1] ان واقعات کے لیے دیکھو تاریخ کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۱۱۹ و تاریخ طبری۔

ریحانہ کا واقعہ | تاریخ سے صرف دو باندیوں کے متعلق پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اُن سے تسرّی کی تھی۔ ایک ماریہ قبطیہ ہیں جن کو مقوقس نے آپ کے پاس بہ طور ہدیہ بھیجا تھا۔ آپ کے صاحبزادے ابراہیم انہی سے پیدا ہوئے تھے۔

دوسری جاریہ کا نام ریحانہ بنت عمرو بن خنافہ ہے لیکن ان کے متعلق بڑا اختلاف ہے عام تاریخوں میں تو یہی مذکور ہے کہ غزوۂ بنو قریظہ میں جو عورتیں گرفتار ہو کر آئی تھیں اُن میں ایک یہ بھی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے لیے منتخب فرمالیا، اور چاہا کہ آزاد کر کے اُن سے نکاح کرلیں، لیکن ریحانہ نے کہا کہ میرے اور آپ کے دونوں کے لیے آسانی اسی میں ہے کہ میں آپ کی مِلکِ یمین رہوں، لیکن مشہور مُورخ عماد الدین ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخ البدایۃ والنہایۃ میں متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ریحانہ نے پہلے پہل تو یہودی مذہب پر ہی قائم رہنے کا ارادہ کیا اور ممکن ہے کہ اسی بنا پر اُنھوں نے آنحضرت سے نکاح نہ کرنا چاہا ہو لیکن کچھ عرصہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے اور اسلامی تعلیمات کو دیکھنے اور سمجھنے کے باعث اُنھوں نے اسلام قبول کرلیا اور جناب رسالتمآب نے آزاد کر کے اُن سے نکاح کرلیا۔ چنانچہ ان کے ساتھ بالکل ازواج مطہرات کا سا برتاؤ ہوتا تھا۔ ابن کثیر نے خود ریحانہ کے الفاظ نقل کیے ہیں۔

وکان یُقَسِّمُ لی کما یقسم لنسائہ — آنحضرت مجھ کو ازواج مطہرات کی طرح حصہ دیتے تھے

وضرب علیَّ الحجاب — اور مجھ سے پردہ بھی کراتے تھے۔

اور صرف یہی نہیں، بلکہ آپ نے ان کا مہر بھی وہی مقرر کیا جو اور ازواج مقدسات

کا تھا یعنی بارہ اوقیہ[1]۔

صاحب زرقانی نے ابنِ سعد کی جو روایت نقل کی ہے اُس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ریحانہ سے نکاح کرلیا تھا[2]۔ رہا روایتوں کا اختلاف تو چونکہ اصل واقعہ میں دونوں چیزیں موجود ہیں یعنی شروع شروع میں ریحانہ نے واقعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کرنے پر رضامندی کا اظہار نہیں کیا اور اخیر میں راضی ہوگئیں، اس بنا پر دونوں روایتوں میں بڑی آسانی کے ساتھ تطبیق دی جاسکتی ہے۔ اِس سے قطع نظر درایت اور قیاس بھی واقعۂ نکاح کی تائید کرتے ہیں جیسا کہ روایتوں سے ظاہر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ریحانہ سے محبت تھی اور وہ جنگ بنو قریظہ میں گرفتار ہوکر آئی تھیں۔ حضرت جویریہ اور صفیہ کے ساتھ بھی اسی طرح کے واقعات پیش آئے تھے۔ ان روایات کے پیشِ نظر کہا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عادتِ مبارکہ کے مطابق ریحانہ پر اسلام پیش کیا ہوگا۔ ریحانہ کو اپنے پہلے متوفی شوہر سے محبت تھی اس لیے اُنھوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کردیا لیکن چند روز کی معیت کے بعد جب آفتابِ رسالت کی پاکیزہ شعاعوں نے یاس و ناامیدی کی ظلمتوں کو مٹا کر ولولۂ اُمید کی روشنی سے معمور کردیا۔ تو وہ بخوشی اسلام لے آئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنھیں آزاد کرکے اپنے حرمِ ازدواج میں قبول فرمالیا۔

ہمارے خیال میں صحیح یہی ہے۔ جن راویوں نے نکاح نہ ہونے کی روایت بیان کی

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۴ ص ۹۰ و ۳۰۸۔ [2] زرقانی ج ۳ ص ۳۱۱۔

ہے اُن کو صرف ابتدائی واقعات کا ہی علم ہو سکا۔ اس کے برعکس نکاح کی جو روایتیں ہیں وہ خود جناب ریحانہ سے منقول ہیں۔ اب صرف ایک حضرت ماریہ رہ جاتی ہیں جن سے آپ نے تسری کی تھی۔

یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جنگ میں عرب کی خوبصورت اور امیروں کی بیٹیاں گرفتار ہو کر آتی تھیں۔ اور اگر آپ چاہتے تو اُن سب کے ساتھ تسری کر سکتے تھے لیکن آپ نے اس کو گوارا نہیں کیا۔ یا تو اُن کو بالکل ہی آزاد کر دیا اور یا اُن کو آزاد کر کے اُن سے نکاح کر لیا۔ جیسا کہ حضرتِ صفیہ اور جویریہ کے واقعات میں ہوا۔ ریحانہ کے متعلق آپ پڑھ ہی چکے کہ آپ اُن سے نکاح کرنا چاہتے تھے لیکن وہ خود اس کے لیے رضامند نہیں ہوئیں تو آپ نے بھی اس پر کچھ زیادہ اصرار نہیں کیا۔ رہیں حضرتِ ماریہ تو ظاہر ہے کہ اُن کو نہ آپ نے کسی جنگ میں گرفتار کیا تھا، اور نہ آپ نے خود اُن کو کسی سے خریدا تھا۔ بلکہ مقوقس نے بطور ہدیہ اُنہیں آپ کے پاس بھیجا تھا۔ غرض یہ ہے کہ آپ کے طرزِ عمل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے استرقاق اور تسری کو صرف اباحتِ وقتی کی حد تک باقی رکھا ہے۔ ورنہ اگر آپ کلیۃً اس سے اجتناب کرتے تو استرقاق قطعی طور پر حرام ہو جاتا جو کہ اُس وقت ملک کی معاشرت اور وہاں کے سیاسی و اقتصادی احوال کے پیش نظر قرینِ مصلحت نہ تھا، جیسا کہ بعض احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز تراویح بہت مرغوب تھی لیکن اس کے باوجود آپ نے اُس پر مداومت محض اس خیال سے نہیں کی کہ کہیں وہ امت پر فرض نہ ہو جائے۔

صحابہ کا عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے اتباع میں صحابۂ کرام بھی اپنی اپنی حیثیت اور مقدرت کے مطابق غلام خرید خرید کر آزاد کرتے تھے۔ اور اس کو بہت زیادہ کارِ ثواب جانتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق مالدار تھے۔ اس لیے آپ نے غلام اور باندی محض آزاد کرنے کے لیے کثرت سے خریدیں۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔

بلال بن رَباح اُمیہ بن خلف کے غلام تھے۔ اسلام لائے تو اُمیہ ان پر طرح طرح کے مظالم کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اُنہیں جلتی ریت پر لِٹا دیتا اور سینہ پر ایک بھاری پتھر رکھ دیتا تھا لیکن شبستانِ نبوت کی شمع جاں فروز کا یہ پروانہ ان سختیوں سے کیا ڈرتا وہ اُس وقت بھی اَحَدٌ اَحَدٌ پکارتا رہتا تھا۔ حضرت ابوبکر نے یہ حالت دیکھی تو بلبلا اُٹھے اور اپنے کافر غلام کے بدلے میں بلال کو لے کر آزاد کر دیا۔

عامر بن فہیر طفیل بن عبداللہ ازدی کے غلام تھے۔ اسلام قبول کرنے کے باعث ان پر بڑے بڑے سنگین مظالم ہوتے تھے۔ حضرت ابوبکر نے پوری قیمت ادا کر کے ان کو خرید لیا۔ اور آزاد کر دیا۔ حضرت عامر پر اس احسان کا یہ اثر ہوا کہ آزادی کے بعد بھی مدت العمر صدیق اکبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ اور آپ کی بکریاں چراتے رہے۔

ابوفکیہ بلال کی طرح یہ بھی اُمیہ بن خلف کے غلام تھے۔ اُمیہ ان کے پاؤں میں رسّی باندھ کر کھینچتا ہوا جلتی بھوبل پر لے گیا۔ پڑے جھلس رہے تھے کہ جعل نامی ایک شخص اُدھر آنکلا اُمیہ نے اُس کی طرف اشارہ کر کے ابوفکیہ سے پوچھا "تمہارا خدا ہے کہ نہیں؟ ابوفکیہ بولے کہ میرا، تیرا اور اس کا تینوں کا خدا ایک ہے۔ اور وہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔ اُمیہ نے یہ سنتے ہی

نہایت سختی سے ان کا گلا گھونٹا۔ اُمیّہ کا بھائی اُبی کھڑا دور سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا اور کہتا جاتا تھا" ہاں اور زور سے جب تک کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خود آکر اسے اپنے جادو سے نہ چھڑائیں نہ چھوڑنا" اُمیّہ نے اپنے بھائی کے بڑھاوے سُنکر اس زور سے گلا گھونٹا کہ دونوں کو اُن کے مرنے کا یقین ہوگیا، اور وہ مردہ جان کر اُنہیں تنہا چھوڑ چلنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو اُن میں جان باقی تھی۔ ارادہ کیا کہ تازہ دم ہو کر پھر زدو کوب کریں، اتفاقاً حضرتِ ابوبکر کا اُدھر سے گزر ہوا۔ ابو فکیہ کی اس مظلومیت کو دیکھ کر دل پسیج اُٹھا۔ فوراً ان ظالموں سے خرید اور آزاد کر دیا۔

زنیرہ | اس کی نسبت بعضوں کا خیال ہے کہ بنی عدی کی اور بعض کہتے ہیں کہ بنی مخزوم کی لونڈی تھی۔ ابوجہل اس پر سخت سے سخت مظالم کرتا تھا، یہاں تک کہ اُس کی دونوں آنکھیں جاتی رہیں۔ ابوجہل یہ دیکھ کر بولا" اب تو تجھ پر لات و عزیٰ کی مار پڑی!" زنیرہ نے کہا کہ لات و عزیٰ کو تو اپنے پوجنے والوں کی بھی خبر نہیں ہے، یہ سب تقدیر سماوی ہے اور خدا کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ پھر مجھے دوبارہ آنکھیں عطا فرما دے، خدا کی شان، ایسا ہی ہوا، صبح کو اٹھی تو دونوں آنکھیں روشن تھیں۔ حضرت ابوبکر نے اس کو بھی خرید کر لوجہ اللہ آزاد کر دیا۔

لبینہ | یہ بنی مول بن حبیب یعنی حضرت عمر کے گھرانہ کی جاریہ تھی۔ حضرت عمر کے مسلمان ہونے سے قبل مشرف باسلام ہو چکی تھی۔ حضرت عمر اس پر جبر و تشدد کرتے اور جب مارتے مارتے بے دم کر دیتے تو چھوڑ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ جب تک عاجز نہ کر لونگا، نہ چھوڑونگا۔ وہ جواب

دیتی اگر تم اسلام نہ لائے تو خدا تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کریگا۔ حضرت ابوبکر کو اس کی مظلومیت پر رحم آیا، اور مول لے کر آزاد کر دیا۔

نہدیہ | بنو عبدالدار کی ایک عورت کے قبضہ میں تھی، وہ اُس پر سختیاں کرتی اور کہتی تھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یاروں میں سے کسی نے اگر تجھ کو خرید کر لیا تو خیر۔ ورنہ میں تجھ کو ہرگز نجات نہ دونگی۔ حضرت ابوبکر نے یہ سُنا تو اُس کو بھی خرید کر آزاد کر دیا۔

اُم عُبَیس | بنی زہرہ کی لونڈی تھی۔ اسود بن عبدیغوث اس پر طرح طرح کے ظلم کرتا تھا صدیق اکبر نے اس کو بھی خرید کر کے آزاد کر دیا۔ حضرت ابوبکر کی عادت تھی کہ ہمیشہ ضعیف و کمزور غلاموں کو خرید خرید کر آزاد کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے والد ابو قحافہ نے کہا اگر آپ کو غلام آزاد کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو بجائے اپاہج اور کمزور غلاموں کے خوب مضبوط و توانا غلام کیوں آزاد نہیں کرتے جو جنگ یا کسی اور اعانت کے موقع پر کام آئیں۔ آپ نے جواب دیا کہ میں جن غلاموں کو آزاد کرتا ہوں اگرچہ وہ دنیا میں کمزور و ناتواں ہیں لیکن یہی لوگ میرے لیے قیامت میں طاقت و قوت کا باعث ہونگے[1]۔

حضرت عثمان | حضرت ابوبکر کی طرح حضرتِ عثمان ذوالنورین بھی مالدار صحابہ میں سے تھے چنانچہ آپ بھی کثرت سے غلام آزاد کرتے تھے، آپ کے حالات میں لکھا ہے کہ ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کرنا آپ کا عام معمول تھا[2]۔ اور بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ آپ نے فرمایا تھا کہ جو غلام خشوع و خضوع سے نماز ادا کریگا میں اُس کو آزاد کر دونگا آپ اس عہد پر سختی سے

---

[1] ثانی اثنین۔ [2] حیاۃِ اسلام و دیگر کتب [3] استیعاب

کاربند تھے[1]

ہشام اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حکیم بن حزام نے عہدِ جاہلیت میں سَو غلاموں کو آزاد کیا اور سو اونٹ بھر کر خیرات کی تھی۔ پھر اسلام لانے کے بعد بھی انہوں نے سَو غلام آزاد کیے اور سو اونٹ بھر کر خیرات کیے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں جن چیزوں کو عہد جاہلیت میں اجر و ثواب کے لیے کرتا تھا اُن کی نسبت حضور کا کیا ارشاد ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اَسْلَمْتَ عَلٰی مَا سَلَفَ لَکَ مِنْ خَیْرٍ جو چیزیں تم سے بھلائی کی گذر چکی ہیں تم اُن پر اسلام لائے ہو۔ (بخاری باب عتق المشرک)

ایک مرتبہ امام زین العابدین نے یہ حدیث سُنی کہ جو شخص کسی غلام کو آزاد کریگا اُس کا ہر ہر عضو اس غلام کے ہر ہر عضو کے بدلے میں بخش دیا جائیگا۔ آپ نے اُسی وقت اپنے غلام مطرف کو جسے دس ہزار درہم میں خریدا تھا بُلا کر آزاد کر دیا۔[2]

غلاموں کو آزاد کرنے کا مزید شوق دلانے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ جتنا زیادہ قیمتی اور پسندیدہ غلام آزاد کیا جائیگا، اتنا ہی ثواب زیادہ ہوگا۔ حضرت ابوذر نے پوچھا "اَیُّ الرقاب افضلُ" "کیسے غلام کو آزاد کرنا زیادہ ثواب کا باعث ہے؟" فرمایا:- اغلاھا ثمناً وانفسہا عند اھلہا۔ یعنی وہ جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو مالک کو زیادہ پسند ہو۔[3]

---

[1] استیعاب - [2] الجہاد فی الاسلام ص ۲۰۴ - [3] نیل الاوطار ج ۶ کتاب العتق

مسلم وغیر مسلم کا عدم امتیاز

غلام کے آزاد کرنے کا جو ثواب بیان کیا گیا ہے اُس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ صرف تھوڑی بہت کمی بیشی کا فرق ہے۔ ترغیب عتق کی احادیث نقل کرنے کے بعد قاضی شوکانی فرماتے ہیں۔

ولاخلاف اَنَّ مُعتِقَ الرقبۃِ الکافرۃ مُثابٌ علی العتقِ[1] — اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کافر غلام کا آزاد کرنے والے کو بھی آزاد کرنے کا ثواب دیا جائیگا۔

اور امام مالک نے اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ میں فرمایا ہے۔

ولا باس اَن یُّعتِقَ النصرانی و الیہودیَّ والمجوسی تطوعًا۔ — اور اس میں کچھ حرج نہیں ہے کہ نصرانی، یہودی یا کسی مجوسی کو اجر و ثواب کے لیے آزاد کیا جائے۔

گناہوں کے کفارہ میں غلام آزاد کرنا

غلام کو آزاد کرنے کی ان ترغیبات کے بعد دیکھیے کہ متعدد گناہوں کے کفارہ میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ وہ لوگ جو برضا و رغبت غلام آزاد نہیں کرتے، اس دباؤ میں آکر غلام آزاد کرنے پر آمادہ ہوجائیں۔ ان گناہوں میں بعض تو وہ ہیں جن کے کفارہ میں غلام آزاد کرنا مستحب اور اولیٰ ہی ہے، اور بعض وہ ہیں جن کے کفارہ میں غلام آزاد کرنا نہ صرف مستحب بلکہ واجب اور ضروری ہے۔

قتل خطا

اگر کوئی کسی مسلمان کو خطاءً قتل کردے تو اُس پر ایک غلام کا آزاد کرنا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں ہے:۔

وَمَن قَتَلَ مُؤمِنًا خطأً فتحریرُ رقبۃٍ — اور اگر کوئی کسی مسلمان کو خطاءً قتل کردے تو اُس پر واجب ہے،

---

[1] نیل الاوطار ج ۶ کتاب العتق ص ۱۹۹۔

مؤمنۃٍ ودیۃ مسلمۃٌ اِلیٰ اَھلہٖ اِلّآ اَنْ یَّصَّدَّقُوْا۔ کہ ایک مومن غلام کو آزاد کرے" اور مقتول کے ورثہ کو دیت دے مگر اُس وقت جبکہ وہ معاف کردیں۔

پھر مسلمان ہی کی تخصیص نہیں بلکہ کسی ذمی یا معاہد کو اگر خطاً قتل کردیا گیا ہے تو اُس کا کفارہ بھی یہی ہے، چنانچہ اس آیت کے بعد میں ارشاد ہوتا ہے :-

فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَھْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ اور اگر وہ کسی ایسی قوم سے ہو جو تمہاری دشمن ہے مگر مومن تو اس کے قتل پر بھی ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا واجب ہے اور اگر وہ ایسی قوم سے ہو جس میں اور تم میں کوئی معاہدہ ہو تو مقتول کے ورثہ کو دیت ادا کرنی ضروری ہوگی اور ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔

کفارۂ ظہار اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات مثلاً ماں بہن میں سے کسی ایک کے ساتھ تشبیہ دے کر اپنے اوپر حرام کرلے تو اس کو شریعتِ اسلام کی اصطلاح میں ظہار کہتے ہیں اور اس کا حکم یہ ہے کہ ظہار کرنے والا شوہر اگر اپنے قول کو واپس لینا چاہے تو اُس کا حکم یہ ہے کہ جب تک کفارۂ ظہار ادا نہیں کریگا اُس کی بیوی اُس کے لیے حلال نہیں ہوگی اور کفارہ میں تین چیزیں ہیں۔ ایک غلام آزاد کرے، ساٹھ دن تک برابر روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ ان تینوں میں غلام کے آزاد کرنے کو مقدم رکھا گیا ہے یعنی جو شخص ایک غلام آزاد کرسکتا ہے اُس کے لیے جائز نہیں کہ کفارۂ ظہار کسی اور صورت سے ادا کرے۔ قرآن مجید میں ہے :-

وَالَّذِیْنَ یُظٰہِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِہِمْ ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ط ذٰلِکُمْ تُوْعَظُوْنَ بِہٖ ط وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝

اور جو لوگ ماں کہہ بیٹھیں اپنی عورتوں کو پھر اپنے قول کو واپس لینا چاہیں تو اُن کو چاہیے کہ ایک دوسرے کو چھونے سے قبل ایک غلام کو آزاد کریں اس سے تم کو نصیحت ہوگی اور اللہ تعالیٰ اُن چیزوں کی خبر رکھتا ہے جن پر تم عمل کرتے ہو۔

یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ آیت ظہار میں "رقبہ" کا لفظ مطلق آیا ہے مومنہ کی قید سے مقید نہیں ہے۔ اِس بنا پر علما احناف نے کہا ہے کہ اگر کسی غیر مسلم غلام کو بھی آزاد کر دیا گیا تو ظہار کا کفارہ ادا ہو جائیگا اور بیوی شوہر کے لیے حلال ہو جائیگی۔

کفارۂ یمین | اگر کوئی شخص کسی بات کی قسم کھالے اور پھر اُس کو توڑنا چاہے یا جان بوجھ کر توڑدی تو اُس کو قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا، اور وہ یہ ہے کہ متوسط درجہ کا کھانا دس مسکینوں کو کھلائے۔ یا اُن کو کپڑے بنا کر دے، اور یا ایک غلام آزاد کرے " قرآنِ مجید میں ارشاد ہے۔

لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ فَکَفَّارَتُہٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَۃِ مَسٰکِیْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَھْلِیْکُمْ اَوْ کِسْوَتُہُمْ اَوْ تَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ ۔

تمہاری جو قسمیں لغو ہیں اللہ ان پر تم سے مواخذہ نہیں کریگا مگر ہاں اُن قسموں پر مواخذہ ہوگا جو تم نے آئندہ کے لیے منعقد کی ہیں اُس کا کفارہ دس مسکینوں کو متوسط درجہ کا کھانا کھلانا، یا اُن کو کپڑے بنانا، یا ایک غلام آزاد کرنا ہے۔

کفارۂ افسادِ صوم | کوئی شخص قصداً وعمداً روزہ فاسد کرے تو اُس کا کفارہ بھی کفارۂ ظہار کی طرح یہی ہے کہ غلام آزاد کر دے۔ اس کی مقدرت نہ ہو تو ساٹھ دن کے روزے پیہم اور

مسلسل رکھے، اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو اُس کو چاہیے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رمضان میں روزہ قصداً افطار کر لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس شخص کے متعلق مندرجۂ بالا احکام فرمائے۔

معمولی گناہوں کا کفارہ	ان گناہوں کے علاوہ بعض معمولی معمولی گناہوں کے ارتکاب پر بھی غلام کو بطور کفارہ آزاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے:۔

من لطم مملوکہٗ او ضربہٗ فکفارتہٗ ان یعتقہٗ [1] — جس کسی شخص نے اپنے غلام کے طمانچہ مارا یا اُس کو زدوکوب کیا تو اُس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اس کو آزاد کرے۔

ابن المنکدر کہتے ہیں کہ ایک شخص اپنے غلام کو مار رہا تھا، اور غلام کہتا جاتا تھا کہ خدا کے لیے رحم کر، خدا کے لیے رحم کر، لیکن اُس نے پھر بھی معاف نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام کی چیخ پکار سُنی تو آپ اُس کی طرف تشریف لائے، مارنے والے نے آنحضرت کو دیکھتے ہی ہاتھ روک لیا۔ آپ نے فرمایا۔ "غلام نے تجھ کو خدا کی دُہائی دی تو نے پھر بھی نہ مانا لیکن تو نے جب مجھ کو آتے دیکھا تو اپنا ہاتھ روک لیا۔ اس شخص نے کہا "یا رسول یہ غلام خدا کے لیے آزاد ہے"۔ ارشاد ہوا کہ اگر تو ایسا نہ کرتا تو دوزخ کی آگ تجھ کو بھسم کر دیتی۔

سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت غلام آزاد کرنا	سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت جس طرح نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے غلاموں کو آزاد کرنے کے متعلق بھی ارشاد فرمایا گیا ہے۔ حضرت ابوبکر

کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ سے روایت ہے۔

اَمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالعتاقۃ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ سورج گرہن کے

[1] ابوداؤد مطبوعۂ مصر۔ ج ۲ ص ۳۴۲۔

فی کسوف الشمس [1] وقت غلام آزاد کیا جائے۔

اسی طرح کی ایک اور حدیث حضرتِ اسمائے روایت ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔

کُنَّا نُؤمر عند الخسوفِ بالعتاقۃ ہم کو حکم دیا جاتا تھا کہ چاند گرہن کے وقت غلام آزاد کریں [2]

ہزل وجِد کی مساوات | پھر یہ دیکھو کہ غلام کو آزاد ہونے کے لیے اس کی ہی ضرورت نہیں کہ آزاد کرنے کے الفاظ عمداً و قصداً کہے جائیں۔ بلکہ اگر مذاق میں بھی یہ الفاظ کہہ دیے گئے ہیں تو غلام آزاد ہو جائیگا۔ حدیث میں ہے۔

ثلاثۃٌ جِدُّھُنَّ جِدٌّ وَھزلُھُنَّ جِدٌّ الطلاق والعتاق والنکاح۔ تین چیزیں ایسی ہیں جن میں مذاق ہیں اور واقعۃً کہنا دونوں برابر ہیں۔ طلاق، آزاد کرنا، اور نکاح کرنا۔

کسی کی طرف سے غلام آزاد کرنا | سعد بن عبادہ جو قبیلۂ خزرج کے سردار تھے اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ میری ماں عمرہ بنت مسعود کا انتقال ہو گیا۔ اور میں اُس وقت غزوۂ اُحد و دومۃ الجندل میں آپ کے ساتھ شریک تھا۔ اب میں اُس کی طرف سے کوئی غلام آزاد کردوں تو اُس کو اس کا اجر ملیگا یا نہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا ہاں [3]

حضرت عائشہ کے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی وفات ہوئی تو بہن کو بیحد صدمہ ہوا اور بھائی کی طرف سے بہتیرے غلام (رِقاباً کثیرۃً) آزاد کیے۔ واثلہ بن الاسقع سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ تبوک میں شریک تھے۔ ہم نے آپس میں ذکر کیا کہ ہمارا فلاں دوست مرگیا۔ آنحضرت نے فرمایا اُس کی طرف سے غلام آزاد کردو۔ اللہ تعالیٰ

[1] بخاری باب ما یستحب من العتاقۃ فی الکسوف [2] بخاری باب مذکور [3] موطا امام مالک باب ما لا یجوز من العتق فی الرقاب الواجبۃ

غلام کے ہر عضو کے بدلہ میں اُس کا ہر عضو بخشد یگا۔[1]

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ وسلم نے حضرت ابوالہیثم انصاری کو ایک غلام عنایت فرمایا، اور ہدایت کی "اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا" ان کی بیوی نے کہا "تم سے یہ نہ ہوسکیگا بہتر یہ ہے کہ اس کو آزاد کردو" چنانچہ اُنہوں نے آزاد کردیا۔[2]

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری کو ایک غلام عنایت فرمایا اور ہدایت کی کہ اُس کے ساتھ نیکی کا معاملہ کرنا۔ اُنہوں نے نیکی کا برتاؤ یہ کیا کہ اُسے آزاد ہی کردیا۔[3]

حضرت ابوہریرہ اسلام قبول کرنے کی غرض سے آئے تو اُن کے ہمراہ اُن کا غلام بھی تھا۔ اتفاق سے راستہ میں وہ کہیں رہ گیا۔ مگر جب ابوہریرہ خدمت نبوی میں حاضر تھے تو وہ غلام بھی آموجود ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابوہریرہؓ! لو یہ تمہارا غلام ہے"۔ وہ بولے "آپ گواہ رہیے کہ یہ آزاد ہے"۔[4]

الغرض روایات و آثار کا استقصاء کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تعلیماتِ اسلام کی اصل اسپرٹ سے متاثر ہوکر صحابۂ کرام کس قدر کثرت سے غلام اور باندیاں آزاد کرتے تھے۔ نواب صدیق حسن خاں نے بلوغ المرام کی شرح میں نجم الوہاج سے ایک فہرست نقل کی ہے جس کی روسے صحابۂ کرام کے آزاد کردہ غلاموں کی مجموعی تعداد اُنتالیس ہزار دو سو اُنسٹھ تک پہنچتی ہے۔

---

[1] زرقانی باب عتق الحی من المیت۔ [2] ترمذی ابواب الزہد۔ ص ۳۹۱۔ [3] ادب المفرد باب العفو عن الخادم
[4] بخاری باب اذا قال لعبدہ ہو للہ ونوی العتق والاشہاد فی العتق۔

چنانچہ اُن صحابہ کے نام اور اُن کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد حسب ذیل ہے :-

حضرت عائشہ رض	۶۹
حضرت حکیم بن حزام رض	۱۰۰
حضرت عثمان رض	۲۰
حضرت عبدالرحمٰن رض بن عوف	۳۰۰۰۰
حضرت عباس	۷۰
حضرت عبداللہ بن عمر	۱۰۰۰
حضرت ذوالکلاع حمیری	۸۰۰۰ (صرف ایک دن میں)

اس کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد تریسٹھ لکھی ہے۔ اور حضرت ابوبکر کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد اگرچہ ٹھیک نہیں بتائی لیکن لکھا ہے کہ اُنہوں نے بکثرت غلام آزاد کیے[1]۔

ہمارا خیال ہے کہ صاحبِ نجم الوہاج کی بیان کی ہوئی یہ تعداد اصل تعداد سے کم ہے کیونکہ اس فہرست میں اُن کثیر التعداد صحابۂ کرام کے نام نہیں ہیں جن کے غلام کو آزاد کرنے کے جزئی واقعات روایات و آثار کے وسیع ذخیرہ میں بکثرت دستیاب ہوتے ہیں مثلاً حضرت ابوہریرہ، حضرت ابوذر، حضرت زبیر، حضرت ابن عباس وغیرہم۔

---

[1] فتح العلام شرح بلوغ المرام طبع میری کتاب العتق ص ۲۲۲ - بلوغ المرام کی دوسری شرح سبل السلام میں بھی یہ فہرست اسی تفصیل سے منقول ہے۔

غلاموں کے لیے آزاد ہونے کی مختلف تدبیریں

یہاں تک غلام کو آزاد کرنے کی جو ترغیبات بیان کی گئی ہیں اُن سے واضح ہوگا کہ اسلام نے کس کس طرح اپنے پیروؤں کو غلام باندی کے آزاد کرنے پر اُکسایا اور اُبھارا ہے لیکن اگر ان کے باوجود آقا اس کارِ ثواب پر آمادہ نہ ہو تو اسلام نے خود غلاموں کو ایسے مواقع عنایت کیے ہیں جن سے کام لے کر وہ آزاد ہو سکتے ہیں۔

مکاتبت

جس طرح شریعت اسلام میں عورتوں کے لیے خلع کا حق رکھا گیا ہے کہ اگر وہ اپنے شوہروں کے ساتھ رہنا پسند نہ کریں اور شوہر اُنہیں طلاق دینے پر رضامند نہ ہوں تو وہ حقِ خلع سے کام لے کر اپنے تئیں اس قید و بند سے آزاد کرا سکتی ہیں۔ اسی طرح غلاموں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ اگر وہ غلام رہنا گوارا نہیں کرتے تو اُنہیں حق ہے کہ اپنے آقا سے مکاتبت کر لیں مکاتبت کی صورت بالکل خلع کی سی ہے۔ یعنی یہ کہ غلام خود یا اُس کا آقا اُس سے کہے کہ وہ اتنا روپیہ کما کر آقا کو ادا کر دے، اور اس کے بدلہ میں وہ اُسے آزاد کر دیگا۔ قرآنِ مجید میں اس کا بیان اس طرح کیا گیا ہے :۔

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ	اور وہ تمہارے باندی غلام جو تم سے مکاتبت کرنی چاہتے ہیں
اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ	تم اگر اُن میں بھلائی دیکھتے ہو تو اُن سے مکاتبت کر لو اور اُن
خَيْرًا وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ	کو اللہ کے اُس مال میں سے دو جو اُس نے تم کو دیا ہے۔

"خیر" سے مُراد کمانے کی قدرت اور روپیہ پیدا کر سکنے کی اہلیت ہے کہ اگر تم اُن غلاموں میں کسبِ مال کی استعداد و صلاحیت پاتے ہو تو اُن کی خواہش کے مطابق اُن سے مکاتبت کر لو۔ یہاں یہ بات فراموش نہ ہونی چاہیے کہ کاتبوا صیغۂ امر ہے۔ اور امر جن معانی کے لیے آتا

ہے اُن میں سے کسی ایک معنیٰ کو متعین کر لینے کے لیے کوئی قرینہ بھی نہیں ہے۔ اس لیے قاعدہ کے مطابق یہ صیغۂ امر وجوب کے لیے ہوگا۔ تو اب معنی یہ ہو گئے کہ اگر غلام تم سے مکاتبت کی خواہش کرتا ہے اور تم جانتے ہو کہ وہ کسب مال کی صلاحیت واستعداد سے بھی محروم نہیں ہے تو اُس وقت تم پر واجب ہے کہ غلام سے مکاتبت کر لو اور اُس کی درخواست کو مسترد نہ کرو، پھر آگے دیکھیے ارشاد ہوتا ہے وَآتُوهُمْ مِن مَّالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ اور ان غلاموں کو اللہ کے اُس مال میں سے دو جو اُس نے تم کو دیا ہے۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ بدلِ کتابت ادا کرنے میں تمام مسلمانوں کو غلام کی امداد واعانت کرنی چاہیے۔ یہاں تک کہ خود مالک کو بھی بدلِ کتابت کو کم کر کے یا کسی اور طرح اس کارِ خیر و ثواب میں شرکت کرنی چاہیے۔ یہاں بھی "آتوا" صیغۂ امر ہے۔ اس سے وجوب نہیں تو کم از کم اس حکم کی اہمیت تو ثابت ہوتی ہے۔

اور مسائل کی طرح یہ آیت بھی اختلافِ آراء سے نہ بچی بعض علماء نے "فکاتبوھم" اور "وآتوھم" اِن دونوں صیغہائے امر کو مجرد عن القرائن دیکھ کر فرمایا کہ دونوں جگہ امر وجوب کے لیے ہے لیکن اکثر علماء کا خیال ہے کہ صیغۂ اول استحباب کے لیے ہے اور دوسرا صیغہ وجوب کے لیے ہے۔ صحیح بخاری میں اس آیت کے ذکر کے بعد ہے کہ روح ابنِ جریج سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے عطاء سے پوچھا کہ اگر مجھ کو معلوم ہو جائے کہ غلام کے پاس مال ہے تو کیا میرے لیے ضروری ہے کہ میں غلام سے مکاتبت کر لوں۔ عطاء نے فرمایا "میں تو اس کو واجب ہی سمجھتا ہوں" عمرو بن دینار فرماتے ہیں کہ میں نے عطاء سے دریافت کیا کہ آپ خود

یہ رائے رکھتے ہیں یا کسی سے اسے نقل کرتے ہیں"۔ فرمایا "میں کسی سے نقل نہیں کرتا بلکہ خود میری اپنی یہ رائے ہے" پھر اُنھوں نے موسیٰ بن انس کی روایت سے بتایا کہ سیرین (محمد بن سیرین مشہور تابعی کے والد ماجد) نے انس سے مکاتبت کی درخواست کی اور یہ بہت مالدار تھے، انس نے انکار کردیا۔ سیرین سیدھے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پورا ماجرا کہہ سُنایا۔ حضرت عمرؓ نے انس کو بلا کر فرمایا کہ سیرین سے مکاتبت کرلو۔ اُنھوں نے نہ مانا۔ حضرت عمرؓ کو غصہ آگیا۔ آپ نے انس کو دُرّے مارے اور یہ آیت پڑھی "فکاتبوھم ان علمتم فیھم خیرا" اب انس راضی ہوگئے اور اُنھوں نے مکاتبت کرلی۔

مکاتب کی امداد تمام مسلمانوں پر واجب ہے

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے عبد مکاتب کی امداد میں تمام مسلمانوں کو شریک ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے جہاں اور مصارف بیان کیے گئے ہیں، اُنھی میں بڑی اہمیت کے ساتھ مکاتب کی امداد کرنے کو بھی بتایا گیا ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ۔

صدقات صرف فقیروں، مسکینوں، اور زکوٰۃ وصول کرنے والوں اور اُن لوگوں کے لیے ہیں جن کے تالیف قلب کی ضرورت ہو اور غلاموں کی گردنوں کو غلاصی دینے میں۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ

پس نہیں گھسا وہ شدائد میں اور تجھ کو نہیں بتایا کہ وہ شدائد کیا ہیں؟ وہ اہم باتیں غلام کی گلو خلاصی کرانی یا کسی فقرزدہ یتیم کو بھوک کے دن کھانا کھلانا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور آیت میں جہاں عزیز و قریب، دور کے اور پاس کے پڑوسی اور مسافروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کا امر فرمایا گیا ہے، ساتھ ہی غلاموں اور باندیوں کو آزاد ہونے میں مدد دینے کی بھی ترغیب دی گئی ہے۔

پھر بدلِ کتابت ادا کرنے کے بعد اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ آقا اپنی زبان سے آزاد کرنے کے کلمات ادا ہی کرے۔ بلکہ اس رقم کے ادا ہوتے ہی وہ آزاد ہو جائیگا جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں بالعموم مذکور ہے۔ اس کے علاوہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر آقا نے غلام کے بدلِ کتابت ادا کرنے سے پہلے کسی ایسے گناہ کا ارتکاب کر لیا جس کے کفارہ میں غلام آزاد کرنا ضروری ہے تو اُس کی پاداش میں یہ عبدِ مکاتب بھی آزاد ہو سکتا ہے۔ امام مالک ثوری، اور امام شافعی کا مذہب یہی ہے۔ یہی حال اُس باندی یا غلام کا ہے جس کو اس کے آقا نے مدبر کر دیا ہو۔ یعنی اُس کی آزادی کو اپنی موت پر معلق کر دیا ہو[1]۔

اب غور کرو قرآنِ مجید میں جس طرح غلام کو مکاتب بننے کا حق دیا گیا ہے اور پھر اُس پر آقاؤں کو غلام کی پیشکش کے قبول کرنے کا اور عام مسلمانوں کو اموالِ زکوٰۃ سے بدلِ کتابت کی ادائیگی میں امداد کرنے کا جو حکم فرمایا گیا ہے اگر پیروانِ اسلام اس پر ٹھیک ٹھیک عمل کرتے تو کیا کہیں ایک جگہ بھی غلامی کا وجود باقی رہ سکتا تھا۔ پول انگلینڈ کا متعصب مصنف ہے لیکن اس کے باوجود اُس کو بھی یہ کہے بغیر چارہ نہ رہا۔

"اگر غلاموں کے تمام ممالک اُن ترغیبات پر عمل کرتے جو پیغمبرِ اسلام نے غلاموں کو آزاد

[1] فتح الباری باب عتق المدبر و اُم الولد۔

کرنے کے متعلق بیان کی ہیں تو کوئی شبہ نہیں کہ تھوڑے دنوں میں ہی غلامی کا خاتمہ ہو جاتا۔[1]

مُدَبَّر | بعض لوگ ہوتے ہیں کہ اپنی خانگی یا معاشی ضرورتوں کے باعث غلام کو آزاد کرنا نہیں چاہتے۔ تو ایسے لوگوں کے لیے اسلام نے سہولت یہ رکھی ہے کہ غلام کی آزادی کے لیے "تدبیر" کی راہ پیدا کر دی ہے۔ اس ترکیب سے اُن کی اپنی ضرورتوں میں کوئی حرج بھی واقع نہیں ہوگا اور غلام کو آزاد کرنے کے تھوڑے بہت ثواب سے بھی محروم نہیں رہینگے۔

تدبیر کا حکم | کتابت کی طرح تدبیر سے بھی شرط کے تحقق کے بعد غلام لازماً آزاد ہو جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ غلام سے آقا کہے کہ "تو میری موت کے بعد آزاد ہے" یا اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے کوئی اور جملہ بولے۔ وہ غلام جس سے یہ کہا جاتا ہے مُدَبَّر ہو جاتا ہے۔ اور اُس کا حکم یہ ہے کہ آقا کے مرتے ہی غلام آزاد ہو جائیگا۔ بظاہر دیکھا جائے تو تدبیر بھی ایک طرح کی وصیت ہے لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ وصیت کو واپس لے لینا اور اُس سے رجوع کر لینا جائز ہے لیکن تدبیر کو واپس نہیں لیا جا سکتا۔ چنانچہ غلام کو مُدبر کرنے کے بعد آقا اُس کو نہ اپنی زندگی میں فروخت کر سکتا ہے اور نہ کسی کو بطور ہبہ و بخشش دے سکتا ہے۔

اگر کسی شخص نے اپنے غلام کو خطاب کر کے کہا کہ "تو میری موت کے بعد آزاد ہے" اور پھر اُس نے کہا کہ میری نیت تو اس جملہ سے غلام کو مدبر کرنا نہ تھا تو اس صورت میں بعض علماء فرماتے ہیں کہ اُس نے نیت خواہ کچھ ہی کی ہو الفاظ تدبیر کے معنیٰ کو ضرور حامل ہیں اور

---

[1] Studies in Mohmmadanism. P.357

غلاموں کی آزادی میں بیش از بیش سہولتیں پیدا کرنا اسلام کے مقاصد مہمہ میں سے بھی ہے۔ اس لیے اس شخص کی نیت کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائیگا، اور غلام مُدَبَّر ہو جائیگا بعض علماء نے لفظوں کی صرف معنوی حیثیت کو ملحوظ رکھا ہے اور کہا ہے کہ جب الفاظ تدبیر کے علاوہ کسی دوسرے معنیٰ کا بھی احتمال رکھتے ہیں تو قائل کی تصدیق کی جائیگی اور اُس کی نیت کے مطابق اُس پر حکم لگا دیا جائیگا۔

مُدَبَّر کے متعلق ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنے غلام کے ایک حصّہ کو مُدَبَّر کر دیا ہے تو صرف وہی حصّہ نہیں بلکہ پورا غلام مدبّر ہو جائیگا۔ کیونکہ طلاق اور نکاح کی طرح عتق بھی تجزی کو قبول نہیں کرتا ہے۔

اُمِّ وَلد اصطلاح شرع میں اُمِّ وَلَد اُس جاریہ کو کہتے ہیں جس کے بطن سے اُس کے مولیٰ کے لیے بچہ پیدا ہوا ہو۔ اس کا حکم بھی مُدَبَّر کی طرح یہ ہے کہ آقا کے مرتے ہی آزاد ہو جائیگی۔ اور جس طرح مُدبر کی بیع ناجائز تھی اُم ولد کو بیچنا بھی ناجائز ہے۔ اور نہ اُس کو بطور ہبہ کسی کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے۔ امام مالک نے حضرتِ عمر کی حدیث نقل کی ہے۔

اَیُّمَا وَلِیدَۃٍ وَلَدَتْ مِنْ سَیِّدِھَا	جس باندی کے اُس کے آقا سے بچہ پیدا ہو جائے تو وہ نہ اُس کو
فَاِنَّہٗ لَا یَبِیعُھَا وَلَا یَھَبُھَا ولا یورثھا	بیچ سکتا ہے، نہ ہبہ کر سکتا ہے اور نہ وراثت میں کسی کو دے
وھو یستمتع منھا فاذا مات فھی	سکتا ہے۔ البتہ وہ خود اُس سے تمتع کر سکتا ہے۔ اُس کے مرنے
حُـرَّۃٌ	پر باندی آزاد ہو جائیگی۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے:۔

اَعْتَقَهَا وَلَدُهَا — اُس باندی کو تو اُس کے بچہ نے آزاد کر دیا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ حضرتِ عمر کے عہد میمنت مہد سے قبل ام ولد کی بیع و شراء ہوتی تھی لیکن آپ نے اپنے عہدِ خلافت میں اُس کو قطعاً مسدود کر دیا۔ جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کے زمانہ میں اُمہات الاولاد کی بیع کر دیتے تھے لیکن جب حضرتِ عمر کا زمانہ آیا تو آپ نے سختی کے ساتھ اس کی ممانعت کر دی اور پھر ہم سب نے اس سے توبہ کر لی[1]۔

لیکن اصل یہ ہے کہ اُم ولد کی بیع و شراء خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد حضرت ابوبکر کے زمانہ میں بھی جائز نہیں تھی، اور اگر تھی تو شروع شروع میں ہوگی۔ آخر عمر میں آپؐ نے اس کی ممانعت کر دی تھی۔ حضرت ابنِ عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:۔

اَنَّهٗ نَهٰی عَنْ بَیْعِ اُمَّهَاتِ الْاَوْلَادِ وَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امہات الاولاد کی بیع سے
قَالَ لَا یُبَعْنَ وَلَا یُوْهَبْنَ وَلَا یُوْرَثْنَ	منع فرمایا اور فرمایا کہ ان کو نہ بیچا جائے، نہ ان کو ہبہ میں دیا
یَسْتَمْتِعُ بِهَا السَّیِّدُ مَا دَامَ حَیًّا وَاِذَا	جائے، اور نہ ان کو وراثت میں منتقل کیا جائے۔ آقا
مَاتَ فَهِیَ حُرَّةٌ[2]	جب تک زندہ رہے ام ولد سے تمتع کرتا رہے اور جب مر جائے تو وہ آزاد ہے

اسی روایت کو دارقطنی نے ایک اور طریقہ سے یعنی عن ابن عمر عن عمر روایت کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور روایت ہے جس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ خطاب بن

---

[1] ابوداؤد باب فی عتق امہات الاولاد۔ [2] موطا امام مالک، دارقطنی، نیل الاوطار

صالح اپنی ماں سے روایت کرتے ہیں کہ اُن سے سلامہ بنتِ معقل نے کہا کہ میں حباب بن عمرو کی باندی تھی اور اُس سے میرے ایک لڑکا بھی تھا۔ ایک مرتبہ اُس کی بیوی نے کہا کہ "حباب پر جو قرض تھا اب تو اُس کے بدلہ میں بیچی جائیگی" سلامہ کہتی ہے کہ میں یہ سُن کر فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور آپ کو پورا واقعہ سُنایا۔ آپ نے دریافت کیا کہ حباب بن عمرو کے ترکہ کا مالک کون ہے؟ لوگوں نے کہا اُس کا بھائی ابوالیسر کعب بن عمرو ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو بلا کر فرمایا "تم اُس کو نہ بیچو اور آزاد کردو۔ اور جب کبھی تم کسی غلام کے متعلق سنو کہ وہ میرے پاس آگیا ہے تو تم میرے پاس آؤ میں تم کو عوض دیدونگا۔ چنانچہ ان لوگوں نے یہی کیا۔[۱]

اِن دونوں روایتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ام ولد کی بیع و شراء خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ممنوع تھی۔ امام احمد اور ابن ماجہ نے ایک روایت بیان کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

ايما امراةٍ ولدت من سيدها فهي معتقة عن دُبرٍ منه او قال مِن بَعْدِهٖ ۔	جس باندی کے اُس کے سردار سے بچہ پیدا ہو وہ اُس کے مرتے ہی آزاد ہو جائیگی۔ راوی کو شبہ ہے کہ آپ نے عن دبر منہ فرمایا یا من بعدہٖ۔

یہ حدیث بھی اس پر صاف دلالت کرتی ہے کہ ام ولد کا حکم بالکل مُدبّر کا سا ہے یعنی جس طرح اُس کی خرید و فروخت نہیں ہوسکتی، اس کی بیع و شراء بھی جائز نہیں۔

---

[۱] مسند امام احمد بن حنبل۔

اب رہی حضرت جابرؓ کی روایت، تو اُس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت کا مفہوم صرف اسی قدر ہے کہ بعض صحابہ امہات الاولاد کی بیع کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت دنیا میں تشریف رکھتے تھے۔ اس سے ہرگز یہ کہیں معلوم نہیں ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کے ایک دو واقعات کا علم ہوا تھا اور اُس کے باوجود آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا۔ چنانچہ امام بیہقی فرماتے ہیں۔

وَلَيْسَ فِي شَيْءٍ مِن الطرقِ اَنَّ النبي صلى الله عليه وَاٰلِهٖ وسلم اطَّلع عَلٰى ذٰلِكَ يعني بيع امهاتِ الاولاد و اَقَرَّهُمْ عَلَيْهِ[1]	کسی طریقہ سے بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان واقعات یعنی امہات الاولاد کی بیع کا علم ہوا ہو اور آپ نے اُن کو اس پر باقی رکھا ہو۔

یہی حضرتِ ابوبکرؓ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا زمانۂ خلافت صرف دو برس چند ماہ تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لیجاتے ہی عرب کی اندرونی حالت اس درجہ پُرآشوب ہوگئی تھی کہ حضرت ابوبکر کی تمام توجہ اسی پر مرکوز ہوگئی اور آپ کو اس کی قطعاً فرصت ہی نہیں ہوئی کہ ام ولد کی بیع ایسے جزئی امور کی طرف توجہ کرتے۔ پھر جب حضرت عمر کا مبارک زمانۂ خلافت آیا تو آپ نے جہاں اور بہتیری ایسی چیزوں کے متعلق اپنا قطعی حکم صادر فرمایا جن کا معاملہ کسی قدر مبہم تھا۔ اُم ولد کی بیع کی نسبت بھی اپنا فیصلہ صادر فرمادیا۔ لیکن اس کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ حضرتِ عمرؓ نے اپنے اجتہاد سے کوئی ایسا حکم دیا تھا جو آنحضرت

---

[1] بحوالہ نیل الاوطار للشوکانی۔ ج ۶ ص ۲۲۳۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف تھا۔ حضرتِ عمر کسی حکم نبوت کی توضیح و تشریح تو کر سکتے تھے اُس کی مخالفت کس طرح کر سکتے تھے۔

فقہا میں ام ولد کی بیع سے متعلق شدید اختلاف ہے۔ یہاں تک کہ علامہ ابن کثیر نے اس پر مستقل ایک کتاب ہی تصنیف کردی ہے لیکن عام رجحان عدم جواز کی طرف ہی معلوم ہوتا ہے۔ بقول قاضی شوکانی کے اگر اُن روایات کو صحیح مان لیا جائے جو اُم ولد کی آزادی کا حکم لگاتی ہیں (اور ان کو کم و بیش تمام علما صحیح تسلیم کرتے ہیں) تو پھر یہ مسئلہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ ام ولد کی بیع جائز ہے یا نہیں۔

ام ولد ہونے کے لیے بچہ کا صحیح و سالم ہونا شرط نہیں

پھر ام ولد ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ بچہ صحیح و سالم اور تندرست ہی پیدا ہو۔ بلکہ اگر بچہ مردہ پیدا ہوا ہے یا اسقاط ہو گیا ہے تب بھی باندی اُم ولد ہو جائیگی۔ کنز العمال باب الاستیلاد میں ہے:۔

اُمُّ الولدِ حُرَّۃٌ وان کانَ سِقطًا ۔ اُم ولد آزاد ہے اگرچہ بچہ ساقط ہو گیا ہو۔

باندی سے عزل کی مذمت

اب ایک طرف یہ حکم دیکھیے کہ باندی کے بطن سے بچہ پیدا ہوتے ہی اُس کی ماں ام ولد بنجاتی ہے، جس کا حکم آپ کو معلوم ہو گیا۔ اور دوسری طرف اس کو بیش نظر رکھیے کہ باندی سے عزل کرنے کی مذمت کی گئی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت ممانعت فرمائی ہے۔ ابو سعید سے روایت ہے کہ انصار میں سے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ باندیاں ہمارے ہاتھ لگتی ہیں، اور ہم چاہتے ہیں کہ اُن کو بیچ کر قیمتیں وصول کریں۔ تو عزل کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے؟ آپ نے فرمایا "کیا

واقعی تم لوگ ایسا کرتے ہو؟ نہیں، ایسا ہرگز مت کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس نفس کے لیے پیدا ہونا مقدر کردیا ہے، وہ ضرور پیدا ہوگا۔[1]

اِن دونوں باتوں پر ادنیٰ توجہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام نے باندی کو شہوت رانی کا ذریعہ قرار نہیں دیا۔ اور تدریجی طور پر اُس کو آزادی سے کس قدر قریب کرنا چاہا ہے۔

اولی قربیٰ کی غلامی

اولی قربیٰ میں سے اگر کوئی شخص کسی کا مالک ہوجائے تو وہ فوراً آزاد ہوجائیگا حضرت سَمُرۃ بن جندب سے مرفوعًا منقول ہے۔

مَنْ مَلَكَ ذَا رَحِمٍ مَحْرَمٍ فَهُوَ حُرٌّ[2] جو شخص کسی ذو رحم محرم کا مالک ہوجائے تو وہ آزاد ہو جائیگا۔

آزادی میں مزید سہولتیں

شریعتِ اسلام نے آزادی کو اصل سمجھا ہے، اور یہ تسلیم کیا ہے کہ ہر انسان خواہ وہ کسی بڑے خاندان سے ہو یا چھوٹے گھرانے سے، مسلم ہو یا غیر مسلم، کالے رنگ کا ہو یا گورا، خوبصورت ہو یا بدصورت، سب انسانی اعتبار سے بالکل ایک ہیں۔ شرف و تفوق کی حیثیت سے اُن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کے برعکس غلامی کو محض ایک عارضی چیز سمجھا ہے، اور مختلف طریقوں سے کوشش کی ہے کہ یہ ننگ و عار کا داغ انسانیت کے دامن سے ہمیشہ کے لیے معدوم ہوجائے۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے جتنے طریقے ہوسکتے تھے اُن سب کو اختیار کرلیا گیا ہے۔ مکاتبت، تدبیر، ام ولد ہوکر آزاد ہوجانا، کسی ذی رحم محرم کا مملوک ہوتے ہی آزاد ہوجانا، اسی کوشش کی جُدا

---

[1] بخاری باب بیع الرقیق۔ [2] مسند احمد، ترمذی و ابوداؤد۔

جُداگڑیاں ہیں۔ ان کے علاوہ فقہ میں بعض ایسی جزئیات ملتی ہیں جن سے اس منشار کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً

(۱) ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کسی شخص کے قبضہ میں ایک عاقل بالغ نوجوان لڑکا ہو اور وہ دعویٰ کرے کہ یہ لڑکا میرا غلام ہے۔ اور لڑکا اُس کی تکذیب کرے، تو اب اس صورت میں لڑکے سے قسم لی جائیگی اور اگر اُس نے قسم کھالی تو آزاد ہو جائیگا۔ نزاعی معاملات میں اسلام کی اصل یہ ہے کہ مدعی سے بینہ طلب کیا جاتا ہے اور وہ اس سے عاجز ہوتا ہے تو منکر سے قسم لے کر اُس کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے، حدیث میں ہے:۔

البینۃ علی المدعی والیمین علیٰ من انکر۔	بینہ (گواہ کا پیش کرنا) مدعی کے ذمہ ہے اور قسم اُن لوگوں پر واجب ہے جو انکار کردیں۔

لیکن آپ نے دیکھا کہ اس مسئلہ میں مدعی سے کوئی بینہ طلب نہیں کیا جاتا۔ بلکہ محض مدعیٰ علیہ یعنی لڑکے سے قسم لے کر اُس کے حق میں فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام غلامی کے رواج کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، یا آہستہ آہستہ اور بہانے بہانے سے اُسے معدوم کر دینا چاہتا ہے۔

(۲) فقہار کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اگر دو شخصوں کو جن میں سے ایک مسلمان ہو اور دوسرا کافر، ایک لاوارث بچہ کہیں پڑا ہو ملے، اور مسلمان اُس کی نسبت دعوےٰ کرے کہ وہ اُس کا غلام ہے۔ اور کافر کہے کہ اُس کا بیٹا ہے، تو اس صورت میں فیصلہ کافر کے حق میں ہوگا، نہ کہ مسلمان کے حق میں، اور وجہ یہ ہے کہ اگر وہ بچہ مسلمان کو دیا جائے تو غلام ہوگا۔

حالانکہ انسان کے لیے اصل آزادی ہے۔

خیال کیجیے کیا اسلام کی حریت پروری، رواداری اور انسانیت نوازی کی اس سے زیادہ کوئی روشن مثال ہو سکتی ہے۔ اس فیصلۂ بالا کے مطابق ایک بچہ کافر کے قبضہ میں جا رہا ہے جو غالبًا اپنے ماحول کے اعتبار سے غیر مسلم ہی ہوگا۔ مسلمان کو سراسر نقصان ہو رہا ہے لیکن اسلام کو پاس حریت اس قدر ہے کہ اُسے مسلمانوں کی مردم شماری میں ایک شخص کے کم ہونے کا کوئی ملال ہی نہیں ہے۔

(۳) ایک غلام میں کئی آدمی شریک ہیں۔ ایک شخص اپنا حصہ آزاد کرتا ہے۔ اس صورت میں فتویٰ یہ ہے کہ صرف وہ حصہ ہی نہیں بلکہ پورا غلام آزاد ہو جائیگا۔ پھر اگر وہ آزاد کرنے والا شخص مالدار ہے تو اس پر دوسرے شریکوں کو اُن کے حصوں کا تاوان ادا کرنا ضروری ہوگا۔ ورنہ وہ غلام خود اپنی قیمت کے بقدر سعی و کسب کریگا، اور اُس کے ادا کرنے کے بعد آزاد ہو جائیگا۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَنْ اعتق نصیبًا او شِقْصًا فی مملوك فخلاصہ علیہ فی مالِہ ان کان لہٗ مالٌ والّا قُوِّمَ علیہ فاستسعی بہٖ غیر مشقوقٍ عَلَیْہٖ [1]

جس شخص نے کسی غلام میں اپنا حصہ آزاد کر دیا پس اگر وہ مالدار ہے۔ تو اُس پر واجب ہے کہ اپنے شریکوں کے حصوں کے بقدر مال ادا کرکے اُس کو رہا کر دے۔ ورنہ اُس کی قیمت مقرر کرلی جائے اور اُس غلام سے بغیر کسی شدید مشقت کے اُس کے لیے سعی کرائی جائے۔

---

[1] ابو داؤد باب فی العتق علی الشرطِ۔

دارالکفر سے نکل کر اگر غلام دارالاسلام میں داخل ہو جائیں تو وہ سب آزاد ہو جائینگے اور اسلامی حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ اُس کو نافذ کرے۔

پہلے گزر چکا ہے کہ صلح حدیبیہ سے قبل چند غلام بھاگ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگئے۔ اُن کے آقاؤں نے آپ کو لکھا کہ یہ لوگ آپ کے دین کی وجہ سے نہیں بلکہ غلامی سے بھاگ کر آپ کے پاس آگئے ہیں لوگوں نے حضور سے کہا کہ ان کو واپس کر دیجیے لیکن آپ خفا ہو گئے، اور واپس کرنے سے انکار فرما دیا۔[1]

آزاد ہونے کے بعد آپ پڑھ آئے ہیں کہ دوسرے مذاہب میں غلام آزاد ہونے کے بعد بھی تقریبًا غلام ہی رہتا تھا۔ یہاں تک کہ ہندوؤں کی مذہبی تعلیمات کی رو سے ایک برہمن کو پورا حق تھا کہ وہ کسی برہمن کے آزاد کیے ہوئے غلام کو بغیر کسی وجہ کے اپنا غلام بنالے لیکن اسلام کے احکام اس طرح کی تعلیم کے بالکل خلاف ہیں۔ اسلام میں ایک غلام آزاد ہونے کے بعد مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے۔ نکاح، طلاق، لین دین، معاشرت، سیاست غرض کسی چیز میں کسی حیثیت سے بھی وہ آزاد سے کم نہیں ہوتا۔ امام مالک فرماتے ہیں:۔

مَنْ اَعْتَقَ عَبْدًا لَہٗ فَبَتَّ عِتْقُہٗ حتی تجوز شَہَادَتُہٗ وتتم حُرمَتُہٗ ویثبتُ میراثُہٗ فلیس لسَیِّدِہٖ ان یشترط علیہ مثل ما یشترط علی عبدہٖ من مَالٍ اوخدمۃٍ و	جس شخص نے اپنے غلام کو آزاد کر دیا اُس کی آزادی قطعی ہو جائیگی، یہاں تک کہ اُس کی شہادت بھی جائز ہے اور اُس کی پوری عزت کی جائیگی اور اُس کی میراث ثابت ہوگی۔ اور اُس کے آقا کو یہ حق نہیں ہوگا کہ مال یا خدمت ان میں سے کسی چیز کی اُس پر

[1] ابوداؤد و ترمذی۔

لا یحمل علیہ شیئاً من الرّقّ [1]   کوئی شرط لگائے اور اُس پر غلامی کسی طرح بھی محمول نہیں ہوگی۔

علامہ زرقانی آخر فقرہ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "لا تجریہ شیٔ من احکامہ" یعنی اُس پر غلامی کا کوئی حکم بھی جاری نہیں ہوگا۔ اور اس کے لیے اُن کا استدلال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کوئی شخص کسی عبد شریک میں سے اپنے حصّہ کو آزاد کردے تو بقیہ حصص کی قیمت ایک مرد عادل طے کریگا۔ اور آزاد کرنے والے کو اُن کی وہ قیمت ادا کرنی ہوگی پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکمیل عتق کا اتنا اہتمام ہے کہ غلام کے ایک حصّہ کے آزاد ہونے پر آپ تمام غلام کے ہی آزاد ہونے کا حکم دے رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ اب پورا غلام آزاد ہوگا تو مکمل طور پر آزاد ہوگا۔ اور بقول امام مالک کے اس شان سے آزاد ہوگا کہ لا یخلطہ شیٔ من الرق۔ غلامی کی کوئی چیز بھی اُس سے مخلوط نہیں ہوگی۔

ولاء | آزاد ہونے کے بعد غلام اور اُس کے آقا کا تعلق یک لخت منقطع کردینا ایک نازیبا سی بات معلوم ہوتی ہے۔ غلام ایک عرصہ تک اپنے آقا کے یہاں رہ چکا ہوتا ہے۔ کچھ دنوں ایک جگہ ساتھ رہنے سے یوں بھی انسیت اور محبت ہوجاتی ہے۔ اور پھر غلام تو ایک فیملی ممبر کی حیثیت سے رہتا تھا اُس کو آقا سے اور اُس کے گھر والوں سے گہرا تعلق اور رابطہ محبت ہوجاتا تھا، اور پھر دوسری طرف آزاد ہونے کے بعد غلام کو دارالاسلام میں بالکل ایک اجنبی کی حیثیت سے رہنا پڑتا، جہاں نہ کوئی اُس کا رشتہ دار ہے جو وقت پر اُس کی امداد و اعانت کرسکے۔ اور جس کے تعلق سے اُس کو شہر میں اپنی غربت و اجنبیت محسوس نہ ہو۔ اور پھر دوسری بات

[1] موطأ امام مالک و زرقانی باب الشرط فی العتق۔

یہ ہے کہ اُس زمانہ میں اہل عرب کی زندگی قبائلی تھی، انفرادی نہیں یعنی کسی دوسرے ملک کا کوئی شخص ان لوگوں میں بود و باش اختیار کرتا تھا تو اُسے بھی اپنے آپ کو کسی نہ کسی قبیلہ سے وابستہ کرنا پڑتا تھا جس کو عربی میں "محالفت" کہتے ہیں۔ کسی قبیلہ کا حلیف بنے بغیر رہنا عرب کی زندگی میں سخت دشوار تھا۔ عراق کے شہر کوفہ و بصرہ میں فارس کے نومسلم مسلمانوں کے ساتھ آباد ہونے شروع ہوئے تو اُن میں سے بعض بنی زہرہ کے حلیف ہو گئے اور بعض نے قبیلہ نزار کے ساتھ محالفت کر لی۔ قادسیہ میں رستم کے ساتھ چار ہزار فوجیوں کی جو جمعیت تھی اور جس کو "جند شہنشاہ" شاہی لشکر کہتے تھے اُنھوں نے جب مسلمانوں سے امن مانگا، تو اُس کی شرائط میں جہاں اور الفاظ تھے یہ بھی شرط تھی: "و یحالفوا مَن احبّوا" یعنی ہم لوگ عرب کے جس قبیلے سے چاہینگے محالفت کرینگے۔[1]

پس ان حالات میں اسلام کس طرح یہ گوارا کر سکتا تھا کہ آزاد کردہ غلام کو یوں ہی لاوارث اور عالم کس مپرسی میں چھوڑ دیا جائے؟ چنانچہ عبد اور مولیٰ کے تعلق کو ایک مخصوص طریقہ سے آزاد ہونے کے بعد بھی باقی رکھا گیا ہے جس کو شریعت کی اصطلاح میں "ولاء" کہتے ہیں۔ اِس تعلق کی بنا پر ہی آزاد کردہ غلام کو اُس کے آقا کے خاندان کے ساتھ وابستہ رکھا جاتا ہے۔ زید بن حارثہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے۔ آپ نے اُن کو آزاد کر دیا تو اس کے بعد وہ برابر "زید بن حارثہ مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

زنباع کا قصہ مشہور ہے اُن کے غلام نے ایک جرم کا ارتکاب کر لیا، جس پر برافروختہ ہو کر

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۲۸۸۔

انہوں نے غلام کی ناک کاٹ لی۔ غلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت لے کر حاضر ہوا، آپ نے زنباع سے پوچھا "تم نے ایسا کیوں کیا؟" انہوں نے پورا واقعہ بیان کر دیا۔ آپ نے غلام سے فرمایا "جا تو آزاد ہے" غلام بولا "اب میرا کفیل کون ہوگا؟" آپ نے ارشاد فرمایا "اللہ اور اُس کا رسول تیرے کفیل (مولیٰ) ہیں"۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو یہ غلام حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا، اور جو آنحضرتؐ کی وصیت تھی وہ بیان کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "ہاں! تجھ کو نان نفقہ دیا جائیگا، اور تیرے بال بچوں کو بھی" پھر جب حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کا عہد آیا، تو غلام نے آپ سے بھی وہی کہا۔ حضرت عمر نے فرمایا "بیشک! اب تو کہاں رہنے کا ارادہ کرتا ہے"۔ غلام بولا "مصر کا" حضرت عمرؓ نے گورنر مصر کو لکھ دیا کہ تم اس غلام کو ایک زمین دیدو تاکہ یہ اُس کے پھل کھا سکے"۔

ولاء کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ آزاد ہونے کے بعد باندی بے وارث رہ جاتی تھی اور شریف خاندان کا کوئی آدمی اُس سے نکاح کرنے میں پس و پیش کرتا تھا لیکن جب اُس کو یہ معلوم ہوتا کہ باندی کا تعلق ایک معزز قبیلہ سے ہے تو اُس کو نکاح کرنے میں پھر کوئی تامّل نہ ہوتا۔

اس ولاء کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ غلام کی وفات کے بعد اُس کا سابق آقا بھی میراث کا مالک ہوتا تھا۔ عہدِ جاہلیت میں بعض لوگ ولاء کو بیچ دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ سائب خاثر کے ترجمہ میں اغانی میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن جعفر نے اُن کا ولاء اُن کے آقاؤں سے خرید کر لیا تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مُعتِق اور مُعتَق کے تعلق کو باقی رکھنے کے لیے ولاء کے بیچنے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ بریرہ مکاتبہ تھیں حضرت عائشہ کے پاس آئیں اور کہا کہ آپ مجھ کو خرید لیجیے اور پھر آزاد کر دیجیے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا "اچھا" پھر بریرہ بولیں "مگر میری مالک شرط یہ کرتے ہیں کہ میرا ولاء انہی کو ملیگا" حضرت عائشہؓ نے جواب دیا "تو پھر مجھ کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے" اس گفتگو کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سُن لیا اور حضرت عائشہ سے فرمایا "تم کوئی پروا نہ کرو۔ بریرہ کو خرید لو اور آزاد کر دو اُس کا جو ولاء ہوگا وہ تم کو ہی ملیگا، خواہ وہ لوگ کیسی ہی کوئی شرط لگائیں"۔ اس موقعہ پر امام بخاری اور مسلم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں :-

الولاء لمن اعتق وان اشترطوا مائۃ شرط — ولاء آزاد کرنے والے ہی کو ملیگا خواہ وہ لوگ سو شرطیں لگائیں

ایک دوسری روایت میں ہے :-

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع الولاء — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیع الولاء سے منع فرمایا ہے۔

ولاء کے تعلق کی پختگی کے متعلق آپ فرماتے ہیں :-

الولاء لحمۃ کلحمۃ النسب — ولاء کا تعلق نسب کے تعلق کی طرح مضبوط ہے

یہ ولاء کا تعلق کس قدر قوی اور موثر ہوتا تھا؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ حضرت ابن عباس کی روایت کے مطابق ایک شخص کا انتقال ہوگیا اور اُس نے کچھ سامان بطور ترکہ چھوڑا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا "کیا اس متوفی کا کوئی وارث ہے؟" لوگوں نے کہا "نہیں، البتہ ہاں صرف ایک غلام ہے جس کو اس نے آزاد کر دیا تھا"۔ یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس آزاد کردہ غلام کو ہی میراث دلادی۔[1]

[1] ابوداؤد کتاب الفرائض باب فی میراث ذوی الارحام

غلام کے حقوق

اب غلام کے حقوق پر ایک نظر ڈالتے جائیے۔ پہلے آپ پڑھ چکے ہیں کہ دوسری قومیں غلاموں کے ساتھ کیسا وحشیانہ برتاؤ کرتی تھیں۔ اب اُن کو پیش نظر رکھ کر ملاحظہ کیجیے کہ اسلام نے غلام کو کن کن حقوق سے نوازا ہے۔ انسانی اعتبار سے ایک انسان کے جتنے حقوق ہوسکتے ہیں مثلاً جان کا محفوظ ہونا، حدودِ شریعت میں رفتار و گفتار کی آزادی، نکاح و طلاق کے معاملہ میں آزادی، تحصیلِ علم و کمال میں آزادی۔ یہ سب حقوق اسلام نے غلام کو عطا فرمائے ہیں۔

غلام کا قصاص ایک انسان کے لیے سب سے زیادہ قیمتی اور عزیز اُس کی جان ہے، مگر غیر مسلم اقوامِ متمدنہ کے نزدیک غلام کی جان جانوروں کی جان سے زیادہ قیمتی نہ تھی وہ اگر قتل کردیا جاتا تو کہیں اُس کی داد فریاد نہیں ہوسکتی تھی۔ اسلام کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ اُس نے اس معاملہ میں غلام اور حُر دونوں کو بالکل برابر رکھا ہے۔ اور جس طرح حُر کا قاتل مباح الدم ہے، اور واجب القصاص، غلام کا قاتل بھی خواہ کوئی حُر ہو یا غلام گردن زدنی ہے۔ قرآن مجید میں صاف طور پر ارشاد ہے۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ اور ہم نے اُن پر فرض کردیا کہ نفس کے بدلے میں نفس دیا جائے۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى تم پر خون کا بدلہ خون لینا فرض کردیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

اَلْعَمَدُ قَوَدٌ — قصداً قتل کردینے میں قصاص لیا جائے

ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے۔

المسلمون تتکافأ دِمَاءُهُمْ[2] — مسلمان مسلمان سب کے خون برابر ہیں۔

دیکھو قرآن مجید کی دونوں آیتیں اور یہ دونوں حدیثیں مفہوم کے اعتبار سے عام ہیں یعنی اِن سے جس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ حُر کا قصاص حُر اور عبد دونوں سے لیا جا سکتا ہے ٹھیک اسی طرح یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عبد کے قصاص میں حر اور عبد دونوں کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ اس عموم مفہوم ہی کی بناء پر تمام فقہاءِ احناف کا اجماع ہے کہ

يُقْتَلُ الْحُرُّ بِالعبدِ والعبدُ بِالْحُرِّ[3] — حُر کو عبد کے بدلے میں اور عبد کو حر کے بدلے میں قتل کردیا جائے

صاحبِ کشاف نے نقل کیا ہے کہ سعید بن المسیب، امام شعبی، نخعی، قتادہ، اور سفیان ثوری، اور امام ابوحنیفہ، اور اُن کے تمام اصحاب کا مسلک یہی تھا۔ مذکورۂ بالا دو آیتوں کے علاوہ قرآن مجید میں خود اس کی بھی تصریح ہے کہ جو کوئی کسی پر ظلم کریگا، اُس سے بدلہ لیا جائیگا۔ یہ حکم بھی عام ہے۔ حُر اور عبد کی کوئی تخصیص نہیں، ارشاد ہے:۔

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ — جس نے تم پر زیادتی کی ہو، تم بھی اُس پر اتنی ہی زیادتی کرد

بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ — جتنی کہ اُس نے تم پر کی ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا گیا ہے۔

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بِهٖ — اور اگر تم عذاب دو تو جتنا تم کو عذاب دیا گیا ہے اُتنا ہی تم دو۔

---

[1] احکام القرآن ج ۱۔ ص ۱۵۷۔ [3] احکام القرآن جلد اوّل۔ ص ۱۵۷۔

ایک اور آیت ہے۔

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا۔ (اور جو آدمی ظلماً قتل کیا جائے، ہم نے اُس کے وارث کو اختیار دیا ہے (کہ اگر قصاص لینا چاہے تو لے سکتا ہے)

ان آیات کے عموم مفہوم سے صاف ظاہر ہے کہ عبد کا قصاص حر سے بھی لیا جائیگا۔ اور اس کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے جو خاص عبد سے متعلق ہیں۔

حضرت سمرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَنْ قَتَلَ عَبْدَہٗ قَتَلْنَاہٗ وَمَنْ جَدَعَ اَنْفَہٗ جَدَعْنَاہٗ — جو اپنے غلام کو قتل کریگا ہم اُس کو قتل کرینگے اور جو اپنے غلام کی ناک کاٹیگا ہم اُس کی ناک کاٹینگے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے۔

مَنْ خَصّٰی عَبْدَہٗ خَصَیْنَاہٗ — جو اپنے غلام کو خصی کریگا۔ ہم اُس کو خصی کرینگے۔

ابوداؤد میں جس باب کے ماتحت یہ دونوں حدیثیں درج ہیں۔ انہی کے ساتھ ایک یہ روایت بھی ہے کہ ایک شخص نے اپنے غلام کو اپنی ایک جاریہ کے ساتھ زنا کرتے ہوئے دیکھا، غصہ میں آکر اُس کو خصی کر ڈالا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ نے اُس شخص کو طلب فرمایا، مگر وہ نہیں ملا۔ اس پر آنحضرتؐ نے غلام سے فرمایا "جا تو آزاد ہے" غلام نے پوچھا میری مدد کس کس پر فرض ہے؟ ارشاد ہوا "ہر مسلمان پر"

اعتراض و جواب | امام شافعی اور امام احمد بن حنبل جو حر سے عبد کا قصاص لینے کے مخالف ہیں، اُن کا استدلال قرآن مجید کی اس آیت سے ہے:۔

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى.

اے ایمان والو تم پر مقتولین کا قصاص لینا فرض کر دیا گیا ہے آزاد بدلہ میں آزاد کے اور غلام بدلہ میں غلام کے اور عورت بدلہ میں عورت کے۔

ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ حر کا بدلہ حر سے اور عبد کا عبد سے لیا جائے۔ اس کا مفہوم مخالف یہ ہوا کہ عبد کا بدلہ حر سے نہیں لیا جا سکتا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ آیت قصاص کے آغاز میں اگرچہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ کا مفہوم عام ہے لیکن آیت کا آخری حصہ اس کے لیے مخصص ہے۔

ہم جواب میں کہتے ہیں کہ اگر آپ مفہوم مخالف کو معتبر مانتے ہیں تو پھر ہر جگہ معتبر ہونا چاہیے الحر بالحر والعبد بالعبد کا اگر مفہوم یہ ہے کہ حُر حر ہی کے بدلہ میں اور عبد عبد ہی کے بدلہ میں قتل کیا جا سکتا ہے۔ اور مفہوم مخالف کے اعتبار سے حُر عبد کے بدلہ میں قتل نہیں ہو سکتا تو پھر اسی طرح اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ کا مفہوم یہ ہوگا کہ حُر صرف حر کے قصاص میں قتل کیا جائیگا نہ کہ عبد کے قصاص میں۔ اور العبد بالعبد کا مفہوم یہ ہوگا کہ عبد صرف عبد کے بدلہ میں قتل کیا جائیگا نہ کہ حُر کے قصاص میں۔ اور آگے فرمایا گیا ہے الانثیٰ بالانثیٰ تو اس کا مفہوم بھی یہ ہوگا کہ عورت صرف عورت کے بدلہ میں قتل کی جائیگی نہ کہ مرد کے بدلہ میں۔ حالانکہ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل یہ دونوں حضرات بھی دوسرے ائمہ کی طرح اس پر متفق ہیں کہ عبد سے جس طرح عبد کا قصاص لیا جاتا ہے عبد سے حُر کا، اور عورت سے مرد کا قصاص بھی لیا جا سکتا ہے، پس جب آپ العبد بالعبد و الانثیٰ بالانثیٰ میں مفہوم مخالف کا اعتبار نہیں کرتے تو الحر بالحر

میں اس کا کیوں اعتبار کرتے ہیں، حالانکہ آیت کا ابتدائی حصہ یعنی "کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ" اپنے مفہوم کے اعتبار سے عام ہے اور بطور ایک حکم کلی کے ہے۔ اور پھر قرآن مجید کی دوسری آیتیں وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ اور وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ اس عموم کے موید ہیں اور ان میں قصاص کے متعلق حُر اور عبد کی کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے۔ اِن آیات کے بعد احادیث کو دیکھیے تو اُن سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حُر اور عبد دونوں کے خون کی قیمت برابر ہے۔ اور اس بنا پر عبد کا قصاص حُر سے لیا جائیگا۔ ابوداؤد کی جو روایت اوپر گزر چکی ہے اُس میں تو یہاں تک تصریح ہے کہ عبد کا قصاص صرف حُر سے ہی نہیں بلکہ اگر کوئی مالک اپنے غلام کو قتل کر دیگا تو غلام کے قصاص میں خود وہ بھی قتل کر دیا جائیگا۔ جیسا کہ مَنْ قَتَلَ عَبْدَهٗ قَتَلْنَاهُ کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔

اور پھر عبد و حُر کی یہ مساوات جان کے معاملہ میں ہی نہیں بلکہ اعضاء و جوارح میں بھی ہے جیسا کہ مَنْ جَدَعَ اَنْفَهٗ جَدَعْنَاهُ اور مَنْ خَصٰی عَبْدَهٗ خَصَيْنَاهُ سے سمجھ میں آتا ہے۔

رہی حضرات شوافع کی دوسری دلیل یعنی یہ کہ آیت کا آخری حصہ اُس کے ابتدائی حصہ کے لیے مخصص ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مواقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ آیت میں ایک حکم عام بیان کیا گیا ہے لیکن پھر بعد میں اُس پر جو حکم متفرع ہوتا ہے وہ باعتبار مفہوم نہیں بلکہ اُس عام کے کسی فرد خاص کے لیے ہے مثلاً مطلقہ عورتوں کی عدت کے بیان میں ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ   اور عورتیں جن کو اُن کے شوہروں نے طلاق دیدی ہے تین

قُرُوْءٍ — حیضوں تک عدت میں بیٹھیں۔

ملاحظہ کیجیے، یہاں مُطَلَّقٰت کا لفظ عام ہے۔ اُن عورتوں کو بھی شامل ہے جن کو اُن کے شوہروں نے تین طلاقیں دی ہیں۔ اور اُن کو بھی جنہیں تین سے کم طلاقیں دی گئی ہیں۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ — اور جب یہ عورتیں اپنی مدتِ عدت کو پورا کر لیں تو تم (اے شوہرو!)

بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ — یا تو اُنہیں احسان کے ساتھ روک لو اور یا احسان کے ساتھ جانے دو

اس کے بعد ہے:-

وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ — اور ان مطلقہ عورتوں کے شوہر عدت کے اندر اندر اپنی مطلقہ عورتوں کو واپس

ذٰلِكَ — لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔

ظاہر ہے کہ آیت کے یہ دونوں آخری ٹکڑے صرف اُن مطلقہ عورتوں کے لیے ہیں جن کو اُن کے شوہروں نے تین طلاقیں دے کر مطلقہ مغلظہ نہیں کیا ہے۔ اب دیکھیے مُطَلَّقٰت کا لفظ عام ہے۔ اور اُس پر از راہ عطف جو چیز محمول کی گئی ہے۔ وہ اگرچہ خاص ہے، لیکن اُس کے خصوص کا اثر مطلقات کے عموم پر نہیں پڑتا۔ وہ اب بھی اپنے عموم پر باقی ہے اسی طرح کُتِبَ علیکم القصاص میں بطور عموم جو حکم بیان کیا گیا ہے۔ وہ بہرحال اپنے عموم پر باقی رہیگا۔ اور الحُرُّ بِالحُرِّ میں جو حکم خاص ہے، اُس کے لیے مخصص نہیں ہوگا۔ علی الخصوص اُس وقت جبکہ اُس کے عموم کی تائید دوسری آیات و احادیث سے بھی ہو رہی ہو۔ اسی بناء پر قاضی بیضاوی (جو خود شافعی المذہب ہیں) اپنی تفسیر میں اس آیت کے ماتحت لکھتے ہیں

وَلَا تَدُلُّ عَلیٰ اَن لَّا یُقْتَلَ الْحُرُّ بِالْعَبْدِ اور آیت اس پر دلالت نہیں کرتی کہ حُر کو عبد کے بدلے میں
وَالذَّکَرُ بِالْاُنْثیٰ کَمَا لَا تَدُلُّ عَلیٰ اور مرد کو عورت کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائیگا جس طرح
عَکْسِہٖ[1] کہ اس کے عکس پر دلالت نہیں کرتی ہے۔

قاضی صاحب کی مُراد یہ ہے کہ اس آیت سے تو صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حُر کو حُر کے بدلے میں اور عبد کو عبد کے بدلے میں اور عورت کو عورت کے بدلہ میں قتل کیا جائے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ حُر کو عبد کے عوض، عورت کو مرد کے عوض اور غلام کو حر کے عوض قتل کیا جا سکتا ہے یا نہیں تو اس آیت سے نفیاً یا اثباتاً اس سے متعلق کوئی حکم مستنبط نہیں ہوتا۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر اس آیت میں حکم تخصیص کے لیے نہیں ہے تو قصاص کا حکم "کُتِبَ علیکم القصاص فی القتلیٰ" میں بیان ہو ہی چکا تھا۔ اب اس فرمانے کی ضرورت کیا تھی؟

اس آیت کا شانِ نزول معلوم کرنے کے بعد اس سوال کا جواب خود بخود مل جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ عہدِ جاہلیت میں عرب کے دو قبیلوں میں (بعض کے نزدیک اوس و خزرج اور بعض کے خیال میں قُرَیْظہ اور نُضَیر تھے) باہمی سخت لڑائی تھی اور اس سلسلہ میں ایک کے خون دوسرے کے ذمہ واجب الادا تھے۔ ان میں سے ایک قبیلہ نے جو زیادہ طاقتور تھا دوسرے قبیلے سے مطالبہ کیا کہ ہم اپنے غلاموں کے بدلے تمہارے احرار اور اپنی عورتوں کے بدلے میں مرد قتل کرینگے۔ اسلام آیا تو ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حکم بنایا۔ اور اس

---

[1] بیضاوی مطبوعہ مصر۔ ص ۳۸

معاملہ میں آپ سے فیصلہ طلب کیا۔ تو آپ پر یہ آیت نازل ہوئی[1] جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا کوئی حُر مارا گیا ہے تو اُس کے قصاص میں حُر کو ماردو اور غلام قتل کیا گیا ہے تو اُس کا قصاص غلام سے لو، مگر یہ کیا ظلم ہے کہ مارا جاتا ہے تمہارا غلام اور تم کہتے ہو کہ ہم تمہارے حُر کو قتل کرینگے۔ ماری جاتی ہے تمہاری ایک عورت اور تمہارا مطالبہ ہے ایک مرد کو قتل کرنے کا۔ حالانکہ اصل قاتل کا پتہ نہیں ہے، چنانچہ اس آیت کے اخیر میں ہے۔

وَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ اور جو لوگ اس کے بعد حد سے تجاوز کرینگے اُن کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حُر حُر سب برابر ہیں اور اسی طرح عبد عبد سب برابر ہیں خواہ وہ تمہارے قبیلہ کے ہوں، یا کسی غیر کے پس یہ سمجھنا کہ تمہارے عبد کے خون کی مکافات دوسرے قبیلے کے حُر کے خون سے ہوگی، سراسر غلط ہے۔ یہ اللہ کے حدود ہیں، جو ان سے تجاوز کریگا عذاب پائیگا۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ یہاں ایک شبہ یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام کو قتل کردے تو فقہ شافعی کا کیا ذکر! فقہ حنفی کی رو سے بھی اُس پر قصاص نہیں آتا۔ بلکہ صرف دیت کا ادا کرنا کافی ہوتا ہے تو جب آقا حُر ہونے کے باوجود نفس خون کے معاملہ میں عبد سے فائق نہیں ہے تو اُس سے قصاص کیوں نہیں لیا جاتا۔

جواب یہ ہے کہ عبد پر ہی کیا موقوف ہے، اگر یہ شخص اپنے فرزند ارجمند کو بھی قتل کر دیتا تو اس سے قصاص نہ لیا جاتا۔ اصل یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے:۔

---

[1] احکام القرآن ج ۱۔ ص ۱۵۶۔

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا۔ اور جو آدمی کہ مظلومیت کے ساتھ قتل کیا جائے ہم نے اُس کے سرپرست کے لیے قصاص لینے کا حق رکھا ہے۔

اب وہ فقہا جو اس بات کے قائل ہیں کہ آقا سے اُس کے غلام کا قصاص نہیں لیا جا سکتا۔ فرماتے ہیں کہ عبد مقتول کا ولی تو خود یہ مولیٰ ہی تھا، اور اسی نے قتل کیا ہے، اب قصاص لے تو کون؟ مگر ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فقہاء کا ایک گروہ اس کا ہی قائل ہے کہ عبد کا قصاص اُس کے آقا سے لیا جائیگا۔ اور اُن کا استدلال آیاتِ قصاص کے عموم مفہوم سے ہے[1]۔

غلام کی شہادت

شہادت کا معاملہ کچھ کم اہم نہیں ہے۔ گواہی اُنہی کی معتبر ہوتی ہے جو صاحب عقل و ہوش ہوں، اور جن کا قول دوسروں کے حق میں اعتبار کے قابل و لائق سمجھا جائے کسی شخص کی شہادت کا معتبر ہونا اُس کی معاشرتی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔ رومیوں کے نزدیک غلام کو سوسائٹی میں حقیر و ذلیل سمجھا جاتا تھا، اس بناء پر وہ غلام کی شہادت کا اعتبار بھی نہیں کرتے تھے لیکن اسلام نے اس کے باوجود کہ اس کے اصولِ قبول شہادت بہت سخت ہیں غلام کی شہادت کو معتبر مانا ہے۔

حضرت انس بن مالک سے غلاموں اور باندیوں کی شہادت کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا: "غلام کی شہادت جائز ہے، بشرطیکہ وہ عادل ہو[2]"۔ اور یہی نہیں بلکہ فرمایا:

مَا عَلِمْتُ اَحَدًا رَدَّ شَهَادَةَ الْعَبْدِ[3] مجھ کو کوئی شخص ایسا نہیں ملا جس نے غلام کی گواہی کو رد کر دیا ہو۔

---

[1] احکام القرآن ج ۱ ص ۱۵۹۔ [2] بخاری باب شہادۃ الاماء والعبید۔ [3] القیاس فی الشرع الاسلامی۔

پھر آگے چل کر اس میں اختلاف ہے کہ غلام کی گواہی خود اُس کے سید کے لیے بھی جائز ہے یا نہیں حسن اور ابراہیم اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور ابن سیرین اس کا اعتبار نہیں کرتے حضرت شُریح سے غلاموں کی شہادت کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا۔ کُلُّکُمْ بنوعبیدٍ و اِماءٍ یعنی تم سب غلاموں اور باندیوں کی اولاد ہو۔ ابن سکن نے فرمایا: کلکم عُبیدٌ و اِماءٌ۔ تم سب غلام اور باندی ہو۔ حافظ ابنِ حجر نے فتح الباری میں عمار الذہبی کے طریق سے ابن ابی شیبہ کی جو روایت نقل کی ہے۔ اُس میں حضرت شریح کے الفاظ اور بھی زیادہ صاف اور واضح ہو گئے ہیں۔ صورت واقعہ یہ ہوئی کہ ایک غلام نے کسی معاملہ میں حضرت شریح کے سامنے شہادت دی تو آپ نے اُس کو معتبر قرار دیا۔ کسی نے اعتراض کیا کہ یہ تو غلام ہے! آپ نے جواب میں فرمایا: کُلُّنَا عُبَیدٌ وَّ اُمُّنَا حَوَّآءُ (ہم سب غلام ہیں اور ہماری ماں حوا ہیں[۳])۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں عقبہ بن الحارث کی ایک روایت بیان کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ عقبہ نے ایک عورت اُم یحییٰ بنت ابی اِہاب سے نکاح کیا تھا کہ ایک سیاہ فام باندی آئی اور کہنے لگی "میں نے تو تم دونوں کو دودھ پلایا ہے"۔ عُقبہ کہتے ہیں "میں نے اس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ نے پہلے تو اعراض فرمایا۔ میں نے پھر دوبارہ ذکر کیا، تو ارشاد ہوا: "تمہارا نکاح کیونکر درست رہ سکتا ہے جبکہ اُس باندی نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے" اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ کو حکم دیا کہ اپنی بیوی کو چھوڑ دیں

---

[۳] فتح الباری ج ۵ طبع جدید ص ۳۰۴۔

اس روایت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ غلاموں اور باندیوں کی گواہی معتبر ہے۔ ورنہ فسادِ نکاح ایسے اہم معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک سیاہ فام باندی کی گواہی کا اعتبار کیوں کرتے اور پھر اعتبار بھی کیسا! کسی اور گواہ کو آپ طلب نہیں فرماتے، اور اسی ایک باندی کے کہنے پر شوہر کو بیوی سے الگ ہو جانے کا حکم فرماتے ہیں۔

حافظ ابنِ تیمیہ نے شہادتِ عبد کے جواز پر القیاس فی الشرع الاسلامی میں بہت پرزور تقریر کی ہے۔ اس تقریر سے صرف مسئلۂ شہادت پر ہی نہیں، بلکہ غلام کی اسلامی شخصیت وحیثیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے ہم ذیل میں اُس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں:۔

"اگر کسی ایک فقیہ نے کہا ہے کہ غلام کی گواہی کا اعتبار نہیں ہے تو اُس سے شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام پر الزام نہیں آتا۔ اور نہ اُس کا قول اللہ اور رسول کے فرمان کے بالمقابل ہمارے لیے حجت ہو سکتا ہے۔ اس طرح کی بات کہنی شارع پر کھلا ہوا بہتان ہے حضرت شارع کی طرف سے ایک حرف بھی ایسا نہیں آیا جس میں فرمایا گیا ہو کہ غلاموں کی گواہی کا اعتبار نہ کرو۔ اس کے برعکس کتاب اللہ، سُنت رسول اللہ اور اجماع صحابہ اور میزان عدل یہ سب اس پر دلالت کرتے ہیں کہ غلام کی شہادت اُن تمام اُمور میں مُعتبر ہونی چاہیے جن میں حُر کی شہادت مقبول ہوتی ہے۔ غلام مومن ہے۔ اس بنا پر وہ اللہ کے قول واستشھدوا شھیدین من رجالکم میں داخل ہوگا۔ جس طرح وہ ما کان محمد ابا احدٍ من رجالکم کے تحت میں داخل ہے۔ اور یہ غلام عادل بھی ہے

اس لیے نص اور اجماع کے مطابق وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ کے ماتحت داخل ہوگا۔ جس طرح وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول ویحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ کے ماتحت داخل ہے، اسی طرح یہ داخل ہے اللہ تعالیٰ کے قول وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ اور وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ اور یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ کے ماتحت جس طرح وہ تمام اوامر ونواہی کے ماتحت شامل و داخل ہے۔ اور یہ داخل ہے اللہ تعالیٰ کے قول فَاِنْ شَهِدَ ذَوَا عَدْلٍ فَصُوْمُوْا وَاَفْطِرُوْا کے تحت میں بھی پس یہ کہنا کہ شارع نے عبد کی شہادت کو نامنظور کیا ہے اور اُس کا اعتبار نہیں کیا شہادت بلا علم ہے[۱]

حافظ ابن تیمیہ نے شہادتِ عبد پر بحث کرتے ہوئے چند ایسی باتیں لکھ دی ہیں جن سے عبد کی اسلامی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی لیے ہم نے امام عالی مقام کی تقریر کا سد ھدسی قدر تفصیل کے ساتھ درج کر دیا ہے۔

غنیمت میں غلاموں کی مساوات احرار کے ساتھ

جس طرح شہادت کے معاملہ میں غلام احرار کے مساوی ہیں، مالِ غنیمت کی تقسیم میں بھی اُن کو احرار کی برابر رکھا گیا ہے۔ قرآن مجید میں غنیمت سے تعلق جتنی آیات آئی ہیں اُن میں کہیں حُر اور عبد کی تفریق نہیں ہے۔ اسی بنا پر حضرت ابوبکرؓ بیت المال سے جو وظائف تقسیم کرتے تھے اُن میں بھی آزاد اور غلام کا کوئی امتیاز نہیں تھا مشہور مؤرخ ابن اثیر اپنی تاریخ "الکامل" میں لکھتے ہیں:۔

وَکَانَ یُسَوِّی فِی قِسْمَتِہٖ بَیْنَ السَّابِقِین — حضرت ابوبکر بیت المال کی تقسیم میں برابری کرتے تھے سابقین

---

[۱] القیاس فی الشرع الاسلامی ص ۱۲۸، ۱۲۹۔

الاولین والمتاخرین فی الاسلام وبین — اولین اور اسلام قبول کرنے کے اعتبار سے متاخرین میں اور
الحرّ والعبد والذکر والانثیٰ[1] — آزاد میں اور غلام میں، اور مرد میں اور عورت میں۔

حضرتِ عائشہ فرماتی ہیں:۔

کان ابی یقسم للحرّ وللعبد[2] — میرے باپ غلام اور آزاد دونوں کے لیے تقسیم کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے دیوان (دفتر) کے مرتب ہو جانے کے بعد جب عطیات و وظائف کی تعیین کی، تو آپ نے پہلی اُن مہاجرین و انصار کے اسمائے گرامی سے کی جو بدر میں شریک ہوئے تھے اور ان میں سے ہر ایک کے لیے فی کس پانچ ہزار درہم مقرر کیے اور اس میں ان حضرات کے حلفا اور موالی سب برابر تھے۔

بلاذری کی ایک روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

فرض عمر لاھل بدر عربھم وموالیھم — حضرتِ عمرؓ نے اہل بدر کے عرب اور اُن کے موالی کے لیے
فی خمسۃ الاف وقال لافضلنھم — پانچ ہزار سالانہ کا عطیہ مقرر کیا۔ اور فرمایا کہ میں ان لوگوں کو اُن
علی من سواھم[3] — کے ماسوا دوسروں پر فضیلت دونگا

ایک اور روایت میں الفاظ یہ ہیں:۔

وعن عمر فریضۃ کل صریح وحلیف ومولیٰ شھد بدرًا فلم یفضل احدًا علی احد۔

ایک جماعت نے حضرت عمر کے پاس آ کر اُن کے کسی گورنر کی شکایت کی اور کہا کہ وہ عرب کو تو دیتا ہے مگر موالی کو چھوڑ جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے عامل کو لکھا کہ کسی انسان کے شریر ہونے کے

[1] تاریخ ابن اثیر ج ۲ ص ۱۶۲ [2] ابوداؤد کتاب الخراج باب فی قسم الفیٔ [3] فتوح البلدان ص ۴۵۵ [4] ایضاً ص ۴۶۰

لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو تحقیر کی نظر سے دیکھے[۱]۔

روایات بالا میں موالی کا لفظ آیا۔ اس لیے ممکن ہے آپ کو شبہ ہو کہ اس سے مُراد غلام نہیں بلکہ یا تو عجمی مراد ہیں جن کو عرب ازراہِ تمسخر "موالی" کہہ دیا کرتے تھے یا آزاد کردہ غلام مراد ہیں۔ اس بنا پر ہم ذیل میں ایک اور روایت نقل کرتے ہیں جس سے بصراحت احرار و عبید کی مساوات ظاہر ہوتی ہے۔

"حضرت عمرؓ نے ایک جریب غلہ (جو یا گیہوں) کو پیسنے کا حکم دیا۔ اس کی روٹی پکوائی اور زیتون کے تیل کے ساتھ اُس کو ٹھنڈا کیا گیا، پھر تیس آدمیوں کو بلایا اور اُن کو صبح کا کھانا کھلوایا اور واپس کر دیا۔ شام کے وقت پھر ایسا ہی کیا، اور فرمایا کہ ایک آدمی کو دو جریب

---

[۱] فتوح البلدان ص ۴۶۲۔ عربی زبان میں مولیٰ کا لفظ مختلف اور متضاد معانی کے لیے آتا ہے۔ اس کے معنی ہیں:۔ غلام، آزاد کردہ غلام، آزاد کرنے والا، چچا زاد بھائی، بلاذری کی جو روایات اوپر نقل ہوئی ہیں اُن میں مولیٰ یا موالی کے الفاظ آئے ہیں جس کے معنی غلام اور آزاد کردہ غلام دونوں ہو سکتے ہیں لیکن "صریح" یا "عرب" کے الفاظ سے متبادر ہوتا ہے کہ یہاں مولیٰ سے مُراد غلام نہیں بلکہ آزاد کردہ غلام ہیں۔

ہمارے لیے اس صورت میں بھی یہ روایات مفید مطلب ہیں۔ کیونکہ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ غلامی انسان کی ذاتی شرافت و نجابت میں کوئی نقص پیدا نہیں کرتی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے احرارِ جنگ بدر اور موالی کو ایک درجہ میں رکھا، اور اس اعتبار سے یہ موالی دوسرے احرار سے فائق رہے۔

البتہ ایک اور روایت ہے جس میں مملوک کا لفظ صاف طور پر آیا ہے:۔

عن الحسن بن محمدٍ اَنَّ ثلاثۃ مملوکین لبنی عفان شھدوا بدرًا فکان عُمَر یُعطی کُلَّ انسانٍ منھم کل سنۃٍ ثلاثۃ آلافِ دراھم۔	حسن بن محمد سے روایت ہے کہ بنو عفان کے تین غلام بدر میں شریک ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ ان میں سے ہر ایک کو تین ہزار درہم سالانہ دیتے تھے۔

اگر موالی سے مُراد آزاد کردہ غلام، اور روایت بالا میں مملوک سے مُراد غلام ہے تو ان دونوں کے عطیات میں فرق کی وجہ ظاہر ہے۔ آزاد کردہ غلام کو خود کسبِ معاش کرنا پڑتا ہے، اور غلام کے تمام اخراجات اُس کے آقا (بقیہ برصفحہ ۱۶۴)

. زوار کافی ہیں۔ چنانچہ آپ لوگوں کو، مرد، عورت، اور غلام سب کو دو جریب ماہوار دیتے تھے[1]

حضرت عمرؓ نے اہل عوالی کی مردم شماری کرائی، اور اُن کے وظیفے مقرر کیے۔ اِس کے علاوہ آپ کا معمول تھا، ہفتہ کے روز عوالی جاتے، اور جو ازکار رفتہ غلام نظر آتا، اُس کا ٹکس معاف کر دیتے ایک روایت میں اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ ہیں:-

"حضرت عمر نے فرمایا، میں نے ہر نفس مسلمہ کے لیے ہر مہینہ میں دُو مد (ایک پیمانہ) گیہوں، اور دُو قسط[2] زیتون کے، اور دو قسط سرکہ کے مقرر کر دیے ہیں۔ تو اس پر ایک شخص نے کہا "والعبد؟" یعنی کیا غلام کو بھی اتنا ہی ملیگا۔ آپ نے فرمایا "نعم والعبد" ہاں اور غلام کو بھی[3]

غلاموں کا نکاح | انسانیت کے حقوق میں ایک بڑا حق شادی بیاہ کا ہے۔ اسلام سے پہلے لوگ اپنے آرام و آسائش کی خاطر غلاموں اور باندیوں کو شادی کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ رومن امپائر تہذیب و تمدن کے اعتبار سے امم قدیمہ میں امتیاز خاص رکھتی ہے لیکن اُس کے ہاں بھی غلام قانونی طور پر شادی کا حقدار نہیں تھا[4] قرآن مجید میں ہے:-

وانکحوا الایامٰی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم	تم اپنی غیر شادی شدہ عورتوں اور اپنے نیک غلاموں اور باندیوں کا نکاح کرو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۳) کے ذمہ ہوتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے تقسیم وظائف کے وقت احرار اور موالی (آزاد کردہ غلام) کو کس طرح برابر رکھا اور پھر جو مملوک تھے آپ نے اُن کو بھی حصہ دیا اور اس کا خیال نہیں کیا کہ اُن کا نان نفقہ تو دوسروں کے ذمہ ہے، اور وظیفہ دیا بھی تو کتنا؟ احرار کے وظیفہ کے نصف سے زائد۔

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۵۶۵ [2] ایک قسط نصف صاع کا ہوتا ہے یعنی تقریباً پونے دو سیر کا

[3] فتوح البلدان بلاذری ص ۴۶۶۔

[4] انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس باب سلیوری

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں :-

وفیہ دلیل علیٰ وجوب تزویج — اور اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ غلام

المولیۃ والمملوک[1] — اور باندی کا نکاح کرنا واجب ہے۔

عرب میں کچھ لوگ ایسے تھے جو غلاموں کا بیاہ کر دیتے تھے۔ مگر پھر جب چاہتے میاں بیوی میں تفریق بھی کرا دیتے تھے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ عہد نبوت میں پیش آیا۔ غلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ آپ نے منبر پر خطبہ دیا اور فرمایا "لوگو! کیوں غلاموں کا نکاح کر کے اُن میں تفریق کراتے ہو نکاح و طلاق کا حق صرف شوہر کو ہے[2]۔

غلام آزاد عورتوں سے شادی کر سکتا ہے

پھر غلام کے لیے یہ قید نہیں کہ وہ صرف باندی سے نکاح کرے۔ بلکہ حرہ اور شریف عورت سے بھی نکاح کر سکتا ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کا نکاح اپنی پھوپی زاد بہن زینب بنت جحش سے کیا تھا۔ اور جب دونوں میں نباہ نہ ہوئی اور نوبت طلاق تک پہنچی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اُن سے نکاح کر لیا۔ یہ واقعہ قرآن مجید میں بھی مذکور ہے۔

اسی طرح شریف اور حُر مرد باندیوں یا آزاد شدہ عورتوں کے ساتھ شادی کر سکتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ شریف و نجیب کون ہو سکتا ہے۔ خود آپ نے حضرت جویریہ سے نکاح کیا جو ثابت بن قیس کی جاریہ تھیں۔ جویریہ نے ثابت سے مکاتبت کر لی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے بدل کتابت ادا کیا، اور آزاد ہونے کے بعد

[1] تفسیر بیضاوی مطبوعہ مصر۔ ص ۲۰۵ [2] سُنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق

ان کو شرفِ زوجیت عطا فرمایا۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک غلام نے بنو بیاضہ کے کسی خاندان میں رشتہ کرنا چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو پسند فرمایا، اور خاندان کے لوگوں سے فرمایا کہ اس رشتہ کو منظور کرلیں۔ انہوں نے کہا "یا رسول اللہ! آپ ہم کو حکم کرتے ہیں کہ اپنی بیٹیوں کے نکاح غلاموں سے کردیں؟" اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ۔	اے لوگو ہم نے تم کو مردوں اور عورتوں سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف گروہوں اور قبیلوں پر اس لیے تقسیم کیا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچانو۔ تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مستحقِ کرامت وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو تحقیق اللہ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

اس آیت کا شانِ نزول ایک یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہوکر اذان دیں۔ حارث بن ہشام اور عتاب بن اسید سُن کر غضبناک ہوگئے، اور کہنے لگے "کیا یہ غلام حبشی سقفِ کعبہ پر کھڑا ہوکر اذان دیگا؟ اس پر آیت بالا نازل ہوئی۔[1]

روم میں عام طور پر دستور تھا کہ جب کسی غلام کی لڑکی بیاہی جاتی تو اُس کی پہلی شب آقا کے پاس بسر ہوتی تھی۔ مسٹر سید امیر علی لکھتے ہیں کہ اس شرمناک ظلم سے عیسائی بشپ تک

[1] تاریخ الاسلام السیاسی۔ ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن۔ ص ۲۲۸۔

نہ چوکتے تھے[1]۔ یہ اس قدر شرمناک بات ہے کہ اسلام تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ عہدِ جاہلیت میں لوگ باندیوں سے کسب کراتے تھے۔ قرآن مجید میں اس کی حرمت کو بہ صراحت بیان فرمایا گیا:۔

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ	تم اپنی جواری کو زنا پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاکدامنی کی
إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا[2]	خواہش کریں۔

اور صرف یہی نہیں کہ آقا کو باندی یا غلام کا نکاح کرنا ضروری ہے بلکہ صحیح حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی باندی کو اچھی تعلیم و تربیت دے اور پھر اُس کو آزاد کر کے خود اُس سے نکاح کرلے تو اُس کو دُو اجر ملتے ہیں[3]۔

غلام کتنی عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے

غلام کتنی عورتوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے؟ امام مالک کا ارشاد تو اس مسئلہ میں یہ ہے کہ حر کی طرح عبد بھی چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے۔ اور استدلال یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ فرمایا گیا ہے۔ اُس میں خطاب عام ہے آزادوں اور غلاموں سب کو شامل ہے[4]۔

---

[1] Spirit of Islam p. 224

[2] إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا ان لوگوں کو عار دلانے کے لیے فرمایا گیا ہے یعنی یہ کیسے شرم کی بات ہے کہ تمہاری باندیاں تو پاکدامن رہنے کا ارادہ کریں اور تم احرار و شرفا ہوتے ہوئے اُن کو زنا ایسے شرمناک فعل پر مجبور کرو۔ ورنہ مفہوم مخالف کے اعتبار سے مُراد یہ نہیں ہے کہ اگر وہ عفت کے ساتھ رہنے کی خواہش نہ کریں تو تم اُن کو زنا پر مجبور کر سکتے ہو کہ یہ چیز تو اسلام کے نزدیک کسی حالت میں بھی قابلِ برداشت نہیں ہے۔

[3] سنن ابو داؤد و صحیح بخاری وغیرہ باب تعلیم الجاریۃ۔

[4] موطا امام مالک باب نکاح العبد۔

امامِ شافعی، امام ابوحنیفہ اور چند دوسرے بزرگ اس کے خلاف ہیں۔ اُن کے نزدیک غلام صرف دو عورتوں سے ہی نکاح کرسکتا ہے لیکن اُس کی وجہ جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے یہ ہے کہ غلام دوسرے کے بس میں ہونے کے باعث چار عورتوں کے نان ونفقہ کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔

غلام نصیحت کرسکتا ہے

غیر مسلم قوموں میں غلام کی مجال نہ تھی کہ اپنے مولیٰ کے کسی فعل پر نکتہ چینی کرسکے خواہ وہ کتنی ہی جائز اور درست ہو اگر کسی غلام سے کبھی ایسی کوئی حرکت سرزد ہوجاتی تو غ‍ ‍ب پر انسانی زندگی کی تمام نعمتیں ہی حرام کردیجاتی تھیں لیکن اسلام نے فکری وقولی آزادی [illegible] سے اہل عالم کو نوازا ہے اس سے غلام کو بھی محروم نہیں رکھا گیا۔ اُسے حق ہے کہ وہ بغیر کسی خوف وہراس کے اپنے آقا کے فعل پر نکتہ چینی کرے، اور ایسا کرنا اُس کے لیے جائز ہی نہیں بلکہ اجر وثواب کا سبب ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اِنَّ العَبْدَ اِذا نَصَحَ لِسَیِّدِہٖ وَاَحْسَنَ عِبَادَۃَ اللہِ فَلَہٗ اَجْرُہٗ مَرَّتَیْنِ [۱]	غلام اپنے آقا کو نصیحت کرے اور اللہ کی عبادت بھی اچھی طرح سے بجا لائے تو اُس کو دوہرا اجر ملتا ہے۔

ابورافع کو جب آزاد کیا گیا تو وہ رو پڑے۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو کہا "پہلے میرے لیے دو اجر تھے، اب ایک ہی رہ گیا[۲]۔ حضرت ابوہریرہ فرماتے تھے "اگر جہاد فی سبیل اللہ اور حج اور ماں کی اطاعت نہ ہوتی تو میں مملوک ہو کر مرنے کو پسند کرتا[۳]۔

[۱] ابوداؤد والادب المفرد باب اِذَا نَصَحَ العبد لسیدہٖ [۲] الاسلام روح المدنیۃ صـ۱۵۴ [۳] الادب المفرد باب من احب ان یکون عبدًا صـ۴۳

غلام کا کھانا | طعام کے اعتبار سے بھی غلام کو کسی فروتر مرتبہ پر نہیں رکھا گیا ہے بلکہ حکم دیا گیا ہے کہ جو آقا کھائے وہی اپنے غلام کو کھلائے۔ حضرت ابوذر سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

من لائمکم من مملوکیکم فاطعموہ مما تاکلون — تمہارا جو غلام منشار کے مطابق ہو اُس کو جو تم کھاتے ہو وہی کھلاؤ

واکسوہ مما تلبسون ومن لا یلائمکم منہم — اور جو تم پہنتے ہو وہی پہناؤ، اور جو غلام منشا کے مطابق نہ ہو

فبیعوہ ولا تعذبوا خلق اللہ[1] — اُس کو بیچ دو، اور اللہ کے بندوں کو عذاب نہ دو۔

ایک اور موقع پر زیادہ موثر الفاظ میں فرمایا گیا ہے۔

اَرِقَّاءُ کم ارقاء کم اطعموھم مما تاکلون — تمہارے غلام تمہارے ہیں ان کو وہی کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو

واکسوھم مما تلبسون (ابن سعد) — اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔

حضرت عثمان رضؓ نے عام طور سے یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ جو باندی کوئی پیشہ نہیں جانتی تھی اور جو غلام کم عمر ہیں، اُن کو روپیہ کمانے کی تکلیف نہ دیجائے لیکن اس کے ساتھ اُن کو کھانا عمدہ دیا جائے[2]

پھر اس پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ غلام کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاؤ اور اگر وہ ساتھ نہ بیٹھے تو کم از کم ایک لقمہ اپنے ہاتھ سے اُسے دیدو۔ کیونکہ اُس نے تم کو آگ کی گرمی سے بچایا ہے۔

ابو محذورہ کہتے ہیں " میں حضرت عمر کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ حضرت صفوان بن اُمیہ ایک بڑا طباق لیے ہوئے آئے جس کو چند آدمی اُٹھائے ہوئے تھے اُنھوں نے یہ طباق حضرت

---

[1] ابوداؤد باب فی حق المملوک۔ [2] موطأ امام مالک کتاب الجامع باب الامر بالرفق بالمملوک۔

عمرؓ کے سامنے رکھ دیا، آپ نے مسکینوں کو، اور وہ لوگ جو آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اُن کے غلاموں کو بلایا، اور سب نے مل کر حضرت عمر کے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر آپ نے فرمایا:-

لحی اللّٰہُ قوماً یرغبونَ عن ارقائھم ان یا کلوا معَھُم [1] — اللہ اُن لوگوں پر لعنت کرے جو اپنے غلاموں کے ساتھ کھانا کھانے سے اعراض کرتے ہیں۔

غلام کا لباس | یہی برابری لباس کے معاملہ میں بھی ملحوظ رکھی گئی ہے جیسا کہ احادیث بالا سے واضح ہوتا ہے۔ صحابۂ کرام نے اس حکم نبوی کی تعمیل کس طرح کی؟ اس کا اندازہ چند واقعاتِ ذیل سے ہوگا۔

حضرتِ عبداللہ بن عمرؓ اپنی لڑکیوں کی طرح اپنی باندیوں کو بھی سنہرے زیورات پہناتے تھے[2]۔ ایک دفعہ کچھ لوگ ان سے ملاقات کرنے آگئے دیکھا کہ ان کے غلام کے گلے میں سونے کا طوق پڑا ہوا ہے، ایک دوسرے کی جانب تعجب سے دیکھنے لگا، ارشاد ہوا "تمہاری نگاہ برائیوں ہی پر پڑتی ہے[3]"۔

ایک مرتبہ حضرت ابوالیسر دو مختلف قسم کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اور اُسی طرح کے کپڑے اُن کے غلام کے جسم پر تھے۔ ایک شخص نے کہا کہ اگر آپ دونوں ایک ایک کپڑا آپس میں بدل لیتے تو ہر ایک کے بدن پر ایک ایک ہمرنگ جوڑا ہو جاتا۔ فرمایا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ غلاموں کو وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو" مطلب یہ تھا کہ اگر میرے اور غلام کے جسم پر ایک ایک رنگ کا لباس ہوتا تو مساوات کس طرح باقی رہ سکتی تھی[4]۔

---

[1] الادب المفرد۔ باب ہل یجلس خادمہ اذا اکل ص ۳۲۔ [2] موطا امام مالک، کتاب الزکوٰۃ [3] ادب المفرد باب فضول النظر [4] ادب المفرد۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آپ نے اپنے غلام کو چند درہم دیے کہ وہ اُن سے مختلف قیمت کے دو کپڑے خرید لائے۔ کپڑے آئے تو اُن میں بناوٹ کے اعتبار سے جو زیادہ باریک اور قیمتاً زیادہ گراں تھا وہ آپ نے غلام کو دیدیا، اور جو اُس سے گھٹیا تھا خود اپنے لیے رکھ لیا، اور پھر غلام سے خطاب کر کے فرمایا "تو اچھے کپڑے کا بہ نسبت میرے زیادہ مستحق ہے۔ کیونکہ تو جوان ہے اور تجمل پسند کرتا ہے۔ اور میں تو بڈھا ہو چکا ہوں[۱]۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایک انسان کے گنہگار ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اُن لوگوں کو جو اُس کے قبضہ میں ہیں اپنا کھانا نہ کھلائے[۲]۔

معرور بن سوید سے روایت ہے کہ میں نے حضرت ابوذرؓ کو ربذہ میں دیکھا کہ اُن کے اوپر ایک موٹی چادر ہے، اور اُن کا غلام بھی ایک ایسی ہی چادر اوڑھے ہوئے ہے۔ ایک جماعت نے کہا کہ اے ابوذرؓ آپ دوسری چادر کو بھی جو آپ نے غلام کو دے رکھی ہے، اپنی چادر کے ساتھ ملا لیتے تو آپ کے لیے ایک لباس مکمل (حلہ) ہو جاتا، اور رہا غلام اُسے کوئی اور کپڑا دیدیتے ابوذرؓ نے فرمایا "میں نے ایک شخص جس کی ماں عجمی تھی اُس کو ایک مرتبہ گالی دی تھی کہ ناگہاں میں نے دیکھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے ہیں۔ اس شخص نے حضور سے میری شکایت کردی، آپ نے فرمایا "اے ابوذر تو ایک ایسا شخص ہے جس میں جاہلیت کی خو بو اب تک پائی جاتی ہے، اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا۔

---

[۱] تاریخ الاسلام السیاسی ج ۱ ص ۳۴۴ [۲] نیل الاوطار ج ۷

انھم اخوانکم فضلکم اللّٰہ علیھم فمن لم یلائمکم فبیعوہ ولا تعذبوا خلق اللّٰہ۔ (ابو داؤد باب حق المملوک)	یہ غلام تمہارے بھائی ہیں جن پر اللہ نے تم کو فضیلت دی ہے پس جو غلام تمہاری طبیعت سے مناسبت نہ رکھتا ہو اس کو بیچ دو اور اللہ کے بندوں کو عذاب مت دو۔

ایک روایت میں آپ کے الفاظ گرامی یہ ہیں۔

اخوانکم جعلھم اللّٰہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدیہ فلیطعمہ مما یاکل ولیکسُہ مما یلبس ولا یکلفہ ما یغلبہ فان کلفہ ما یغلبہ فلیعنہ (ابو داؤد باب حق المملوک الادب المفرد)	غلام تمہارے بھائی ہیں جن کو اللہ نے تمہارے قبضہ میں کر دیا ہے پس جس کا بھائی اس کے قبضہ میں ہو اس کو چاہیے کہ جو خود کھاتا ہے اس کو بھی کھلائے اور جو خود پہنتا ہے وہی اس کو پہنائے۔ اور اس کو ایسے کام کی تکلیف نہ دے جو اس پر شاق ہو، اور اگر دے تو اس کی اعانت کرے۔

غلاموں کے ساتھ عام حسن معاشرت

قرآن مجید میں جن جن لوگوں کے ساتھ حسن معاشرت سے پیش آنے کا امر فرمایا گیا ہے انہی میں غلاموں کا بھی ذکر ہے ارشاد ہوتا ہے۔

واعبدوا اللّٰہ ولا تشرکوا بہ شیئًا و بالوالدین احسانًا و بذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین والجار ذی القربیٰ والجار الجنب والصاحب بالجنب و ابن السبیل وما ملکت ایمانکم ان اللّٰہ لا یحب من کان مختالًا فخورًا	اور اللہ کی عبادت کرو۔ اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ بناؤ اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔ اور قرابت والوں یتیموں، محتاجوں، قرابت والے پڑوسیوں، اور اجنبی پڑوسیوں، اور پاس کے بیٹھنے والوں، اور مسافروں، اور جو لونڈی غلام تمہارے قبضہ میں ہیں ان سب کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اتراتیں اور بڑائی مارتے پھریں۔

زید بن حارثہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے جو اسلام سے پہلے سے آپ کے پاس رہتے تھے، آپ کا برتاؤ ان کے ساتھ اس درجہ کریمانہ تھا کہ لوگ عموماً ان کو زید بن محمد کہتے تھے۔ اور خود زید کو بھی آپ سے اس درجہ محبت تھی کہ ایک مرتبہ ان کے خاندان کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ فدیہ لے کر آزاد کر دیجیے، آپ نے فرمایا "زید سے پوچھ لو، اگر وہ تم لوگوں کے ساتھ جانا چاہتے ہیں تو شوق سے چلے جائیں" زید سے دریافت کیا گیا تو اُنھوں نے آپ کی غلامی کو اپنے قبیلہ کی آزادی پر ترجیح دی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور خادم حضرت شقران صالح تھے، جن کو اُن کے آقا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطور نذر پیش کر دیا تھا۔ حضرت شقران حبشی نژاد تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی خدمات سے بیحد خوش تھے۔ یہاں تک کہ وفات کے وقت آپ نے مخصوص طور سے اِن کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت فرمائی[1]

حضرت علیؓ فرماتے ہیں:-

كان آخر كلام رسول الله صلى الله عليه وسلم الصلوة الصلوة اتقوا الله فيما ملكت ايمانكم[2] (ابو داؤد باب فی حق المملوک،	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری کلام یہ تھا کہ نماز کا خیال رکھو، نماز کا۔ اور جو تمہارے باندی غلام ہیں اُن سے معاملہ کرنے میں اللہ سے ڈرو۔

ایک اور مقام پر آپ ارشاد فرماتے ہیں:-

---

[1] اسد الغابہ ذکر حضرت شقران و طبقات ابن سعد۔

حَسَنُ الملکۃِ نماءٌ وسوءُ الخلق شومٌ — غلام سے اچھا برتاؤ کرنا برکت کا باعث ہوتا ہے اور بدخلقی،
(ابو داؤد باب فی حق الملوک) — بدبختی و بدنصیبی ہے۔

غلام کا امن دینا معتبر ہے

اسلام میں غلام کا قول ایک حُر کی طرح نافذ ہوتا ہے۔ جنگ میں کسی شخص کو امن دینے کا معاملہ بہت ہی اہم ہے۔ اسلام کی عبد نوازی دیکھیے کہ اس معاملہ میں بھی غلام کے قول کو معتبر قرار دیا ہے۔ حضرت عمرؓ ایک سردار کو لکھتے ہیں:۔

اِنَّ عبدَ المسلمین من المسلمین و ذمتہٗ من ذِمَّتِہِم یُجوزُ اَمانُہٗ — مسلمانوں کا غلام مسلمانوں ہی سے ہے اور اس کا عہد بھی مسلمانوں کے عہد ہی کی طرح ہے۔ اُس کا امن دینا جائز ہے۔
(ابوداؤد باب فی حق الملوک)

سوس کی جنگ سے فارغ ہو کر حضرت ابوسبرۃ لشکر کو لیے ہوئے "جندیسا پور" پہنچے تو دیکھا کہ زِر بن عبداللہ بن کلیب پہلے سے وہاں کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں۔ اب ان دونوں نے متفق ہو کر جندیسابور پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ صبح شام جنگ ہوتی تھی۔ اسی اثناء میں مسلمانوں کے ایک غلام نے جس کا نام مُکنِف تھا شہر والوں کے پاس ایک پروانۂ امن لکھ کر بھیج دیا۔ مسلمان اس سے بے خبر تھے۔ کفار نے امن پا کر قلعہ کے دروازے کھول دیے اور باہر چلے آئے۔ مسلمانوں نے پوچھا کیا بات ہے؟" کہنے لگے "تم ہمیں امن دے چکے ہو اور اس کے باوجود لڑنے پہ تُلے ہوئے ہو۔" مسلمانوں کو جب اصل واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اُن میں سے بعض نے کہا کہ "وہ امن تو غلام کا دیا ہوا ہے معتبر نہیں" اہل جندیسا پور بولے "ہم تو تمہارے آزاد اور غلام میں کوئی فرق نہیں دیکھتے۔ تمہارے ایک فرد نے امن دیا ہے تو وہ معتبر ہونا چاہیے۔ مسلمانوں نے پورے واقعہ کی اطلاع حضرت عمرؓ کے پاس بھیجی تو آپ نے اُن کو لکھا:۔

اِنَّ اللّٰہَ عَظَّمَ الوفاءَ فَلَا تکونونَ اوفیاءَ حتّٰی تَفُوْمَا دُمتُم فِیْ شَكٍّ اَجِیْزُوْهُمْ وفوا لهم	اللہ نے وفاءِ عہد کا مرتبہ بہت بڑا کیا ہے اور تم اُس وقت تک اپنے عہد کو پورا کرنے والے نہیں ہوگے جب تک اُس کو پورا پورا ادا نہیں کردو گے۔ جب تک تم کو (کفار کی طرف سے) شک رہے اور ان کے غدر کا یقین نہ ہو، تم وفا کرتے رہو اور جس چیز کا وعدہ کرو اُسے دو۔

چنانچہ اسلامی لشکر نے غلام مُکنِف کے امن کو معتبر قرار دے کر باقی رکھا اور واپس چلے آئے[1]

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد مصر کے دورِ حاضر کا ایک نامور مصنف لکھتا ہے۔

ولو لم یَعْلَمْ هٰذا العبدُ مِنْ اخلاقِ اولئك الفاتحین السامیۃ اَنَّهُمْ یجیزون اَمَانَہٗ واَنَّ اخلاقهم الکریمۃ ونفوسهم الشریفۃ فوق کُلِّ فاتحٍ محارب لما رمٰی لِقومِہٖ بالامانِ واستنزلهم مِن المعاقل	اگر غلام ان عظیم الشان فاتحین کے اخلاق سے متعلق یہ نہ جانتا ہوتا کہ یہ غلام کے امن دینے کا اعتبار کرتے ہیں اور نیز یہ کہ ان کے اخلاق کریمہ اور نفوس شریفہ ہر فاتح سے بلند اور بالا ہیں تو یہ کبھی اپنی قوم کے نام امن نامہ نہ بھیجتا اور اُن کو قلعوں پر سے نہ اُتارتا۔
	(اشہر مشاہیر الاسلام ج ۱ ص ۳۳۲)

غلاموں کی تعلیم | اسلامی تعلیم کی رو سے صحابۂ کرام نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ غلام اور باندیاں صرف ان کی خدمت کے لیے ہیں۔ بلکہ وہ اپنے بیٹے اور بیٹیوں کی طرح اُن کی تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ ایک دفعہ قیساریہ کے چار ہزار غلام گرفتار ہو کر آئے، تو حضرت عمرؓ نے اُن میں سے بعض کو مکتب میں داخل کر دیا[2]۔

---

[1] طبری ج ۴ ذکر فتح سوس۔ [2] فتوح البلدان ص ۱۴۹۔

حضرت عباس اپنے غلام حضرت عکرمہ کو قرآن و حدیث کی تعلیم دیتے تھے، اور وہ سبق یاد نہیں کرتے تو پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتے تھے۔ (دارمی ص ۳۰)

ابو عامر سلیم جو رواۃ حدیث میں ہیں اپنے متعلق خود کہتے ہیں کہ میں بچپن میں گرفتار ہو کر مدینہ آیا، تو یہاں مجھ کو مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ معلم مجھ سے جب "میم" لکھواتا تھا، اور میں اچھی طرح لکھ نہیں سکتا تھا تو کہتا تھا کہ گول لکھو جیسی گائے کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ (بحوالہ الفاروق)

حمران بن ابان حضرت عثمانؓ کا مشہور غلام ہے آپ نے اُس کو خرید کر لکھنا سکھایا اور میر منشی بنایا[۱]۔ صحیح بخاری سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مکاتب میں آزاد بچوں کے ساتھ غلاموں کے لڑکے بھی تعلیم پاتے تھے۔ چنانچہ ایک بار حضرت ام سلیم نے مکتب کے استاد سے کہلا بھیجا کہ اُون صاف کرنے کے لیے لڑکے بھیجدو، مگر آزاد بچے مت بھیجنا[۲]۔

ممکن ہے اس سے یہ خیال پیدا ہو کہ غلاموں کے بچے اتنے حقیر سمجھے جاتے تھے کہ اُن سے ہر شخص جب چاہتا کام لے سکتا تھا، لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اسی حدیث سے حافظ ابن حجر نے استدلال کیا ہے کہ معمولی کاموں کے لیے احرار اور عبید دونوں کے لڑکوں سے خدمت لینا جائز ہے۔ رہا یہ امر کہ حضرت ام سلیم نے یہ کیوں کہا کہ "غلام بچے بھیجنا، آزاد بچے نہیں" تو فتح الباری میں اس تفریق سے متعلق حافظ ابن حجر ابن جلال کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

"ام سلیم نے حر کی شرط اس لیے لگائی کہ جمہور علماء کا اتفاق ہے، اگر کوئی شخص کسی نابالغ حر سے یا آقا کی اجازت کے بغیر کسی غلام سے کوئی خدمت لے اور وہ ہلاک ہو جائے تو نابالغ

---

[۱] فتوح البلدان ص ۳۶۰ [۲] بخاری کتاب الدیات باب من استعان عبداً او صبیاً۔

حُر کی صورت میں اس شخص کے خاندان (عاقلہ) کو اُس کی دیت دینی پڑیگی اور غلام کی صورت میں اُس کی قیمت ہی آقا کو ادا کرنی ہوگی اور وہ بھی خود تنہا اس کو ہی۔

لونڈیوں کی تعلیم و تربیت

غلاموں کی طرح لونڈیوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنے کی بھی ترغیب دی گئی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

"تین شخص ایسے ہیں جن کو دو بڑے اجر ملینگے۔ ایک وہ جو اپنی باندی کو تعلیم دے، اور خوب اچھی تعلیم دے، اُس کو ادب سکھائے، اور خوب سکھائے اور پھر اُس کو آزاد کر کے خود اُس سے نکاح کرلے۔ دوسرا وہ شخص ہے جو اہل کتاب تھا اور پھر اسلام لے آیا۔ تیسرا وہ شخص ہے، جو اللہ کا حق ادا کرتا ہے اور اپنے سید کی خیر خواہی بھی کرتا ہے[1]"

اب کہیے! کسی باندی کے لیے کسی آقا کا گھر (بشرطیکہ وہ اسلام کی تعلیم پر واقعی طور سے عمل پیرا ہونا چاہتا ہے) ایک قید خانہ ہے یا بہترین مدرسہ و تربیت گاہ۔

استبراء کے بغیر جماع کی ممانعت

اسلام سے قبل عرب میں یہ وحشیانہ طریقہ جاری تھا کہ جو باندیاں جنگ میں گرفتار ہو کر آتی تھیں اُن سے استبراء کے بغیر ہی (یعنی یہ معلوم کیے بغیر کہ اُن کو حمل ہے یا نہیں) مباشرت کر بیٹھتے تھے۔ اور اس میں حاملہ و غیر حاملہ کی کوئی تفریق نہیں کرتے تھے۔ حمل میں جماع کرنے سے جس طرح اختلاطِ نسب کی قباحت لازم آتی ہے، اس سے لونڈی کو نقصان پہنچنے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔ اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈیوں کو مطلقہ عورتوں کے حکم میں شامل کرلیا۔ یعنی جب تک غیر حاملہ باندیوں پر مدتِ حیض نہ گزر جائے اور حاملہ لونڈیوں

[1] بخاری باب فضل من اسلم من اہل الکتاب۔

کا وضع حمل نہ ہو جائے، اُن سے مجامعت کرنا جائز نہیں ہے۔

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اوطاس[1] کی جانب غزوۂ حنین کے دن ایک جماعت بھیجی۔ دشمن سے جنگ ہوئی اور مسلمان کامیاب رہے اسیران جنگ میں کچھ عورتیں بھی تھیں، اُن کے مشرک شوہر موجود تھے۔ اس لیے ان عورتوں کے لونڈیاں ہونے کے باوجود مسلمانوں کی ایک جماعت ان کے ساتھ مباشرت کرنے سے اجتناب کرتی تھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ وَالْمُحْصَنٰتُ من النساءِ اِلاما ملکت ایمانکم ابوسعید الخدری اس کے بعد الاما ملکت ایمانکم کی تشریح میں فرماتے ہیں:۔

ای فھُنَّ لھُم حلالٌ اِذا انقضَتْ عِدَّتُھُنَّ — یعنی باندیاں اُن کے لیے حلال ہیں جب اُن کی عدت گزر جائے۔

وہ عدت کیا ہے؟ خود ابوسعید ہی اس واقعہ سے متعلق ایک دوسری روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرکے فرماتے ہیں:۔

لاتُوطأُ حَامِلٌ حتّٰی تَضَعَ ولاغیرذاتِ حملٍ حتّٰی تحیض حَیضۃً[2] — حاملہ باندی جب تک وضع حمل نہ کرے، اور غیر حاملہ پر جب تک حیض نہ گذر جائے، اُس کے ساتھ تمتع نہ کیا جائے۔

استبراء کا اس قدر اہتمام کیا گیا ہے کہ "حتّٰی تحیض" سے ہی علماء نے استدلال کیا ہے کہ

---

[1] ہوازن کے علاقہ میں ایک وادی کا نام ہے۔ یہیں بنو ہوازن کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حنین کیا ہے۔ جب لڑائی سخت ہوگئی تو آپ نے فرمایا "حَمِیَ الوطیس" جنگ کا تنور گرم ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس فقرہ کے سب سے پہلے کہنے والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ معجم البلدان ج ۱ ص۳۷۵

[2] ابوداؤد کتاب النکاح باب وطی السبایا۔

اگر کسی باندی کو بحالتِ حیض گرفتار کیا گیا ہے۔ تو جواز مباشرت کے لیے اس حیض کا اعتبار نہیں ہوگا۔ اور جب تک اُس کو دوسرے حیض سے فراغت حاصل نہیں ہو جائیگی، تمتع جائز نہیں ہوگا۔[1]

حضرت ابو درداء سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی غزوہ میں ایک عورت کو دیکھا جو قریب الولادت تھی۔ آپ نے فرمایا "غالباً اس کے مالک نے اس کے ساتھ مجامعت کی ہے" لوگوں نے عرض کی "جی ہاں"، آپ نے فرمایا:۔

لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ اَلْعَنَهٗ لعنةً تَدْخُلُ مَعَهٗ فِي قَبْرِهٖ كيف يورثهٗ وهو لا يحل لَهٗ

میں نے قصد کیا تھا کہ اس شخص پر ایسی لعنت بھیجوں جو قبر میں اُس کے ساتھ جائے۔ یہ کیونکر ایسے شخص کو اپنا وارث بنا تا ہے جو اس کے لیے حلال نہیں ہے۔[2]

ایک بار حضرت رویفع بن ثابت انصاری نے کسی گاؤں پر حملہ کیا۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کا وقت آیا تو فوج کو ہدایت فرمائی۔

مَنْ اصابَ من هٰذا السبي فلا يطؤها حتى تحيض فاني سَمِعْتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول لا يحلّ لرجل ان يَسْقِيَ ماءهٗ وَلَدَ غيرِهٖ۔

جن لوگوں کے حصہ میں یہ باندیاں آئیں جب تک اُنہیں حیض نہ آجائے، وہ اُن سے جماع نہ کریں۔ میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے۔ آپ فرماتے تھے "کسی شخص کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنا پانی غیر کے بچہ کو پلائے"۔

اس حکم سے ایک یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ شریعت اسلام نے اس مسئلہ میں لونڈی کو مطلقہ عورت کا ہم رتبہ قرار دیا ہے۔ یعنی کسی عورت کا میدانِ جنگ میں گرفتار ہو جانا ایسا ہی ہے

---

[1] معالم السنن ج ۳ ص ۲۲۳ [2] مسند امام احمد بن حنبل ج ۴ ص ۱۰۸

کہ گویا اُس کے شوہر نے طلاق دے کر اُس کو اپنے سے جُدا کر دیا ہے۔ اور ملکیت کو نکاح کے برابر رکھا گیا ہے جس طرح نکاح میں ایجاب وقبول کر لینے سے ایک اجنبیہ محض کے ساتھ تمتع جائز ہو جاتا ہے۔ کسی عورت کا ملکیت میں داخل ہو جانا بھی اگر جوازِ مباشرت کا سبب بن جائے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ ایجاب وقبول سے نکاح کا منعقد ہو جانا اور الفاظ طلاق سے اُس کا فسخ ہو جانا محض ایک اعتبار شرعی ہے۔ پس اگر جنگ میں گرفتار ہونے، اور ملکیت کے حاصل ہو جانے میں بھی اس اعتبار شرعی کو ملحوظ رکھا جائے تو ظاہر ہے یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

غلاموں پر سختی کرنا منع ہے

قاعدہ ہے کہ انسان کو اُسی شخص پر زیادہ غصہ آتا ہے، اور وہ اپنے اقتدار و تحکّم کی نمائش اُسی پر زیادہ کرتا ہے جو اُس کے قبضہ میں ہوتا ہے۔ اور جس کے متعلق اُس کو اپنے مملوک ہونے کا احساس ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جو لوگ غیروں کے حق میں رحمدل اور نرم مزاج ہوتے ہیں بسا اوقات خود اپنے ماتحتوں کے ساتھ تندخوئی و درشت مزاجی کا برتاؤ کرتے دیکھے گئے ہیں اسلام نے انسانی فطرت کے اس جذبہ کو بے موقع اُبھرنے سے روکنا چاہا ہے۔ غلام کے ساتھ نرم معاملہ کرنے میں غالباً تمام امم قدیمہ میں اہل فارس زیادہ نمایاں ہیں، لیکن ہیروڈٹ لکھتا ہے کہ اُن کے ہاں بھی قانون یہ تھا کہ غلام سے اگر پہلی مرتبہ خطا سرزد ہوئی ہے تو اُس کو سخت سزا نہ دی جائے۔ البتہ اگر دوسری مرتبہ وہ پھر اُس کا اعادہ کرتا ہے تو آقا کو حق ہے اُس کو قتل کر دے یا جو سزا مناسب معلوم ہو اُس کو دے[1]۔

اسلام نے اس بارہ میں جو تعلیم دی ہے وہ وہی ہے جو ایک دین فطرت اور مذہب حق

---

[1] بحوالہ محمد المثل الکامل ص ۳۱۳۔

کی ہوسکتی ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ غلام سے کوئی فعل صادر ہوتا ہے اور آقا اُس کو اپنے زعم میں موجب سزا قرار دے کر اپنے تئیں سزا دینے کا حقدار سمجھتا ہے۔ اس قسم کے مواقع میں اکثر دھوکہ ہو جاتا ہے۔ سزا دینے کے بعد آقا کو محسوس ہوتا ہے کہ میں نے سزا نہیں دی بلکہ ایک ناکردہ گناہ پر ظلم کیا ہے۔ اب وہ نادم و شرمسار ہوتا ہے اور اپنے کیے پر محجوب و منفعل۔ آقا کو انفعال سے اور غلام کو مظلومیت بیجا سے بچانے کے لیے ہی اسلام نے اوّلاً معاف کرنے کا حکم دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! ہم غلام سے کتنی مرتبہ درگذر کریں؟ آپ یہ سُن کر خاموش ہو گئے۔ سائل نے پھر سوال کیا۔ آپ پھر بھی خاموش رہے۔ اُس نے تیسری مرتبہ پھر اس سوال کا اعادہ کیا۔ اب آپ نے ارشاد فرمایا۔

اعفوا عنہ فی کل یوم سبعین مرۃ[1] ہر روز ستر مرتبہ اُس سے درگذر کرو۔

کہا جا سکتا ہے کہ جس حدیث کا یہ ٹکڑہ ہے اُس میں مملوک یا عبد کا لفظ نہیں آیا، بلکہ خادم کا لفظ آیا ہے۔ اس لیے یہ حکم نوکروں کے ساتھ ہی مخصوص ہونا چاہیے جواب یہ ہے کہ اوّل تو امام ابوداؤد نے اس حدیث کو "باب فی حق المملوک" کے ماتحت درج کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہی کہ اُنھوں نے خادم سے مُراد مملوک ہی لیا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ "وہ آزاد ہے" یا "اُس کو آزاد کرنے کا حکم دیا ہے" اس طرح کے الفاظ عبد مملوک کے لیے ہی بولے جا سکتے ہیں

[1] ابوداؤد ج ۴ ص ۳۴۱ مطبوعہ مصر۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ستر سے مُراد بیان عدد نہیں بلکہ کثرت مراد ہے یعنی اگر بہت مرتبہ بھی غلام سے خطا ہو تو اُس کو معاف کر دو، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: "اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔"

لیکن اگر معاف کرنے سے کام نہیں چلتا اور سزا دینی ضروری ہی تو عقوبت بقدر گناہ و خطا ہی ہونی چاہیے

ہلال بن یساف سے روایت ہے، فرماتے ہیں ہم سوید بن مقرن کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم میں ایک سن رسیدہ بزرگ بھی تھے جن کے مزاج میں ذرا تیزی تھی، ان کے ساتھ ایک جاریہ تھی، کسی بات پر بگڑ کر اُنھوں نے اُس کے مُنہ پر طمانچہ مار دیا۔ اس پر سوید بن مقرن اس قدر غضبناک ہوئے کہ ایسے کبھی نہ دیکھے گئے تھے۔ پھر فرمایا: "کیا مارنے کے لیے اس جاریہ کا شریف چہرہ ہی رہ گیا تھا، تم نہیں جانتے ہو، ہم مقرن کے سات بیٹے تھے، اور ہمارے ہاں صرف ایک جاریہ تھی۔ ایک مرتبہ ہم میں سے سب سے چھوٹے نے اُس کے چہرہ پر طمانچہ رسید کر دیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے آزاد ہونے کا حکم دیا۔

اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت سوید بن مقرن کے صاحبزادہ "معاویہ" سے مروی ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں میں نے ایک مرتبہ اپنے غلام کے طمانچہ مارا۔ اس پر میرے باپ سوید بن مقرن نے مجھ کو اور اُسے دونوں کو بلایا، اور غلام سے کہا کہ تو اپنا قصاص معاویہ سے لے۔ اس کے بعد اُنھوں نے وہی واقعہ نقل کیا جو اوپر مذکور ہو چکا ہے۔

حضرت عمرؓ کے پاس سفیان بن الاسود کی ایک جاریہ آئی، اور شکایت کی کہ سفیان نے مجھ کو ایک جلتی انگیٹھی پر بٹھا دیا حضرت عمرؓ نے فوراً اُس کو آزاد کرنے کا حکم دیا اور وہ آزاد کر دی گئی۔

ایک مرتبہ ایک شخص[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ میری

---

[1] مؤطا امام مالک میں اس راوی کا نام عمر بن الحکم لکھا ہوا ہے، لیکن ابن عبدالبر فرماتے ہیں "یہ وہم ہے، صحابہ میں کوئی عمر بن [illegible] نہیں۔ بلکہ یہ صاحب معاویہ بن الحکم ہیں اور اُن کی یہ حدیث معروف ہے"۔

ایک باندی ہے جو میری بکریوں کو چراتی ہے۔ اُس سے ایک بکری گم ہوگئی، میں نے پوچھا تو کہنے لگی "بھیڑیا لے گیا"۔ مجھ کو بڑا غصہ آیا، آخر انسان تھا ہی۔ میں نے اُس کے ایک چپت مار دیا۔ اب اگر حکم ہو تو میں اس خطا کے بدلے میں اُسے آزاد کردوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باندی کو بلایا، اور دریافت کیا: خدا کہاں ہے؟ وہ بولی، آسمان میں۔ پھر آپؐ نے پوچھا: میں کون ہوں؟ اُس نے کہا، آپؐ اللہ کے رسول ہیں، یہ سُن کر آپ نے حکم دیا "اس کو آزاد کردو"[۱]

زاذان کہتے ہیں، ایک مرتبہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آیا، وہ اپنے ایک غلام کو آزاد کر چکے تھے۔ اُنھوں نے زمین سے ایک لکڑی یا کوئی اور چیز اٹھائی اور اُس کی طرف اشارہ کرکے فرمانے لگے "میرے لیے غلام کے آزاد کرنے میں اس چیز کی برابر بھی اجر نہیں ہے۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے، فرماتے تھے۔

مَنْ لَطَمَ مَمْلُوكَهُ اَوْضَرَبَهُ فَكَفَّارَتُهُ اَنْ يُعْتِقَهُ[۲]

جس کسی شخص نے اپنے غلام کے طمانچہ مارا، یا زدوکوب کیا اُس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اُسے آزاد کرے۔

ایک شخص کے پاس دو غلام تھے جن کے وہ بہت شاکی تھے۔ یہ اُن کو مارتے اور بُرا بھلا کہتے تھے لیکن وہ باز نہیں آتے تھے۔ بالآخر اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اور غلاموں کی اس سرکشی کا علاج پوچھا۔ آپ نے فرمایا "تمہاری سزا اگر ان کے قصور کے برابر ہے، تو کوئی مضائقہ نہیں، ورنہ سزا کی جو مقدار زائد ہوگی، اُس کے برابر خدا تم کو بھی سزا دیگا"۔ یہ سُن کر وہ بے قرار ہوگئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ شخص قرآن نہیں پڑھتا جس میں ہے: وَنَضَعُ

---

[۱] موطأ امام مالک باب ما یجوز من العتق فی الرقاب الواجبۃ [۲] مسلم باب صحبۃ الممالیک۔

الموازین القسط۔ وہ کہنے لگے، یا رسول اللہ! بہتر یہ ہے کہ میں اس غلام کو اپنے سے جدا کردوں آپ گواہ رہیں کہ یہ دونوں آزاد ہیں[1]۔

اگر کوئی شخص غلام کے ساتھ سختی کا معاملہ کرے۔ اُس کو شدید تکلیف پہنچائے۔ تو اس صورت میں اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر غلام کسی حاکم کے پاس اس کا مرافعہ کرے تو اس کو چاہیے کہ آقا کا جرم ثابت ہونے پر اُس کو قرار واقعی سزا دے۔ البتہ غلام کے خود بخود آزاد ہو جانے میں اختلاف ہے، لیکن امام مالک، اُن کے اصحاب، اور لیث کا مذہب یہی ہے کہ غلام آزاد ہو جائیگا خواہ اُس کا آقا اُسے آزاد کرے یا نہ کرے، اور اس کا ولا اُس کو ملیگا[2]

غلاموں سے سخت کام نہ لینا چاہیے

احادیث و آثار میں کثرت سے جگہ جگہ امر فرمایا گیا ہے کہ غلاموں سے اُن کی ہمت و طاقت کے مطابق ہی کام لینا چاہیے۔ ایک بار ایک شخص حضرت سلمان فارسی کے یہاں آیا، دیکھا کہ بیٹھے ہوئے آٹا گوندھ رہے ہیں۔ بولا "غلام کہاں ہے؟" فرمایا "ایک کام کے لیے گیا ہے۔ اب یہ پسند نہیں کہ اُس سے دو دو کام لیں[3]"۔

حضرت عثمان کی عادت تھی کہ رات کو اُٹھ کر وضو کا پانی خود لیتے اور خادم کو نہیں جگاتے تھے۔ کسی نے سبب پوچھا تو فرمایا "رات اُن کے آرام کرنے کے لیے ہے[4]"۔

لعنت کی ممانعت

کسی غلام کو مارنے پیٹنے کا کیا ذکر صحابۂ کرام لونڈیوں اور غلاموں کو کوئی بُرا کلمہ بھی نہیں کہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود اپنے ایک دوست سے ملنے آئے، جو

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۶ ص ۲۸۰ [2] نووی شرح مسلم باب صحبۃ الممالیک
[3] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت سلمان ؓ [4] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت عثمان

اُس وقت وہاں موجود نہ تھے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے دوست کی بی بی سے پانی طلب کیا، اُنہوں نے اپنی لونڈی کو بھیجا کہ پڑوس میں سے دودھ لے آئے، اتفاقاً اُس کو آنے میں دیر ہوئی، بی بی نے غصہ میں آکر اُس پر لعنت بھیجنی شروع کر دی۔ حضرت ابن مسعودؓ یہ سُن کر فوراً گھر سے نکل آئے۔ ان کے دوست آئے تو کہنے لگے "آپ سے کیا پردہ تھا، گھر میں آکر بیٹھتے، کچھ کھاتے پیتے"۔ بولے سب کچھ کر لیا لیکن آپ کی بی بی نے باندی غریب پر لعنت بھیجی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "اگر لعنت اُس شخص کو کہے جو لعنت کا مستحق نہ ہو تو لعنت لوٹ کر لعنت بھیجنے والے پر ہی پڑ جاتی ہے"۔ اس بناء پر مجھ کو خوف ہوا کہ شاید باندی معذور ہو۔ اور وہ لعنت آپ کی بی بی پر لوٹ کر آئے۔ اور میں اُس کا سبب بنوں[1]۔

ایک شب میں عبدالملک اُٹھا، اور اپنے ملازم کو آواز دی، اُس کو آنے میں دیر ہوئی، تو اُس نے اُس پر لعنت بھیجنی شروع کر دی۔ حضرت ام الدرداءؓ اُس کے محل میں تھیں۔ صبح کے وقت کہنے لگیں "تم نے رات اپنے خادم پر لعنت بھیجی ہے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "لعنت بھیجنے والے قیامت کے دن شفعاء یا شہداء نہیں ہونگے[2]۔

غلام پر تہمت تراشی بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَنْ قَذَفَ مَمْلُوکَہٗ وھُوَ بَرِیٌٔ مِمَّا قَالَ جُلِدَ یومَ القیامۃِ اِلَّا اَن یکونَ کَمَا قَالَ۔

جو شخص اپنے کسی غلام پر تہمت لگائے اور وہ اُس سے بری ہو تو اُس کو قیامت کے دن کوڑے لگائے جائیںگے مگر یہ کہ ایسا ہی ہو جیسا کہ اُس نے کہا ہے۔

ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں:۔

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۴۰۸ [2] مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب

جُلِدَ لَہٗ یومُ القیامۃِ احدًّا   بطور حد کے اُس کو قیامت کے دن سزا دیجائیگی۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی اُس پر حد قذف جاری ہوگی۔ اس کے متعلق مہلب کہتے ہیں کہ تمام ائمہ کا اجماع ہے کہ آقا پر حد قذف لگائی جائیگی لیکن حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں مہلب کے اس قول کے متعلق "فیہ نظر" (اس میں کلام ہے) کہا ہے۔ اور حضرت نافع سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے ایک مرتبہ سوال کیا گیا کہ جو شخص کسی ام ولد پر تہمت لگائے اُس کا حکم کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا:۔

یُضرَبُ الحدَّ صاغِرًا   ذلیل کرنے کے لیے اُس کو حد ماری جائے۔

حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ ابن منذر کہتے ہیں کہ امام مالک اور ایک جماعت نے یہی کہا ہے کہ ام ولد کے قاذف پر حد جاری کی جائیگی۔

غلام اگر خدا کی دہائی دے تو نہ مارو

غلام خواہ کسی واقعی خطا پر ہی مارا جارہا ہو لیکن اگر وہ پٹتے پٹتے اللہ کا نام لے دے (دہائی دے) تو حکم ہے کہ اُس سے ہاتھ روک لینا چاہیے۔ ارشاد نبوی ہے۔

اِذا ضرب اَحَدُکُمْ خَادِمَہٗ   تم میں سے کوئی شخص اپنے نوکر کو مار رہا ہو اور وہ اللہ
فذکر اسمَ اللہِ فَلْیُمْسِکْ[۱]   کا نام لے تو اُس سے ہاتھ روک لینا چاہیے۔

غلام کے لیے حدود و عقوبات

ازروئے احکامِ فقہ غلاموں کے لیے حدود و عقوبات بہ نسبت احرار کے نصف ہیں۔ مثلاً جس جرم کی پاداش میں حر کے لیے اسّی کوڑے ہیں اگر وہی جرم غلام سے سرزد ہوگا تو اُس کو چالیس کوڑے مارے جائینگے۔ حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ و نیل الاوطار ج ۷۔

یہ اس لیے ہے کہ غلاموں کے آقا اُن پر حد سے زیادہ مظالم نہ کریں، فرماتے ہیں۔

فلو شُرِعَ فِيهِمْ مزجرة بالغة اقصى المبالغ لفتح ذلك باب العدوان بِأَنْ يَقْتُلَ المولىٰ عَبْدَهُ ويحتج بأنه زانٍ ولا يكون سبيل المؤاخذة عليه فنقص من حدّهم وجعل ما لا يفضي الى الهلاك ؎

اگر غلاموں کے لیے انتہائی سزا (جو آزاد لوگوں کے لیے ہے) مشروع کر دی جائے تو اس سے ظلم وجور کا دروازہ کھل جائیگا۔ اس طرح پر کہ ایک آقا اپنے غلام کو قتل کر دیگا، اور بہانہ یہ کریگا کہ اُس نے زنا کیا تھا اور پھر اُس سے کوئی باز پرس بھی نہیں ہوگی اس بناء پر غلاموں کے حدود کو اس حد تک کم کر دیا گیا ہے کہ ہلاکت پر منتج نہ ہوں۔

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۶۰)

اسی خوف سے کہ کہیں غلام کی سزا اُس کی خطا سے نہ بڑھ جائے آقا کو حد درجہ محتاط رہنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہے۔

من ضرب غلامًا له حدًّا لم يأته او لطمه فإنّ كفارته ان يعتقه

جو شخص اپنے غلام کو بطور حد کسی ایسی خطا پر مارتا ہے جو اُس نے نہیں کی یا اُس کو طمانچہ مارتا ہے اُس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اُس کو آزاد کرے۔

صحابۂ کرام اس کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے کہ کہیں غلام کو محض غلام ہونے کی وجہ سے زیادہ سزا نہ ملجائے۔ ایک غلام ایک شخص کے باغ سے کھجور کا خوشہ چُرا لیا۔ مروان بن الحکم اُس وقت مدینہ کا گورنر تھا۔ باغ کے مالک نے اُس کے سامنے غلام کے خلاف شکایت کی۔ مروان نے غلام کو قید کر دیا اور چاہا کہ اُس پر حد سرقہ جاری کر کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ غلام کا آقا حضرت رافع بن خدیج رضؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور معاملہ جیسا کچھ تھا، اُن کے رو برو پیش کر دیا۔ اُنہوں نے کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ پھل کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا" اُس نے

کہا "تو ذرا مروان کو بھی آپ یہ حدیث سُنا دیجیے" حضرت رافع گئے اور مروان کو یہ حدیث سُنائی تو اُس نے غلام کو فوراً رہا کر دیا۔[1]

غلام کے خصی کرنے کی ممانعت

غلام کو خصی کرنے کی رسم بد بہت پُرانی تھی۔ اشوری، بابلی اور قدیم مصری ان سب کے ہاں اس کا قدیم سے رواج تھا۔ انہی لوگوں سے یونانیوں نے اختیار کیا۔ پھر رومیوں اور فرنگیوں میں بھی اس کا رواج عام ہو گیا۔ کہتے ہیں حضرت عیسیٰؑ سے دو ہزار برس قبل اشوریا کی ملکہ سمیرامیس نے اس رسم بد کی ایجاد کی تھی۔

خصی کرنے سے غرض یہ تھی کہ غلام زنانخانہ میں آجا سکیں، اور عورتوں کے پاس اُٹھنے بیٹھنے سے اُن کے متعلق کوئی اندیشہ نہ ہو۔ اسلام کے بعد بھی غیرمسلم اقوام میں غلاموں کو خصی کرنے کا رواج بہت زیادہ رہا۔ اس مقصد کے لیے خاص خاص کارخانے تھے جہاں صقلبی غلام بچپن میں ہی خصی بنا دیے جاتے تھے، اور پھر بازار میں اُن کی قیمت بھی زیادہ لگتی تھی بعض بعض غریبوں پر تو اس عمل جراحی کا اثر اتنا شدید ہوتا تھا کہ وہیں مر جاتے تھے۔ شاہانِ فرنگ کی عام عادت تھی کہ اندلس کے مسلمان بادشاہوں سے تقرب حاصل کرنے کے لیے خصی غلاموں کا نذرانہ پیش کرتے تھے۔ برشلونہ اور ترکونہ کے بادشاہوں نے مستنصر باللہ سے صلح کی تجدید چاہی تو بیس غلام بطور تحفہ پیش کیے۔[2]

ظاہر ہے اسلام ایسا دینِ حق اس طرح کے بھیمانہ افعال کی اجازت کیونکر دے سکتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الحدود باب مالا یقطع فیہ۔ [2] الجواہر فی تفسیر القرآن ج ۲۱ ص ۱۵۶۔

مَنْ خَصَّی عَبْدَہٗ خَصَیْنَاہُ[1] جو کوئی شخص اپنے غلام کو خصی کریگا ہم بھی اس کو خصی کرینگے

زنباع بن سلامۃ الجذامی نے ایک مرتبہ ایک غلام کو اپنی جاریہ کے ساتھ مخالطت کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ انہوں نے غصہ میں غلام کی ناک کاٹ لی اور اُسے خصی کر دیا۔ غلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور پورا واقعہ کہہ سُنایا۔ آپ نے زنباع سے دریافت کیا "تم کو ایسا کرنے پر کس چیز نے آمادہ کیا۔ زنباع نے جو اصل واقعہ تھا بیان کیا۔ آپؐ نے غلام سے فرمایا "جا تو آزاد ہے[2]"

جبر سے منع | سلمۃ بن محبق سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کی باندی سے مباشرت کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو یہ معاملہ پیش ہوا تو آپ نے فرمایا:۔

اِنْ کَانَ اِسْتَکْرَھَھَا فَھِیَ حُرَّۃٌ وَعَلَیْہِ لِسَیِّدَتِھَا مِثْلُھَا وان کانت طاوعتہ فھی لہٗ وعلیہ لِسَیِّدَتِھَا مِثْلُھَا

اگر اُس شخص نے باندی پر جبر کیا ہے تو وہ آزاد ہے اور اُس کو باندی کی مالکہ کے لیے تاوان ادا کرنا ہوگا لیکن اگر باندی نے برضا و رغبت ایسا ہونے دیا ہے تو وہ باندی اسکی ہی ہے اور جماع کرنیوالے کو تاوان دینا ہوگا

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں، یہ حدیث حسن ہے، اگرچہ بعض نے اس میں کلام کیا ہے[3]۔ اسی سلسلہ میں امام موصوف لکھتے ہیں کہ جو شخص اپنے غلام کو مُثلہ (بدہیئت و بدشکل) کریگا غلام آزاد ہو جائیگا۔ امام مالکؒ، امام احمد اور دوسرے بزرگوں کا مذہب یہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق آثار منقول ہیں، اور آپؐ کے اصحاب مثلاً حضرت عمرؓ سے بھی۔ امام عالی مقام کسی

---

[1] ابوداؤد باب من قتل عبدہٗ [2] زرقانی شرح موطأ امام مالک باب جامع القضاء فی العتاقۃ۔
[3] القیاس فی الشرع الاسلامی ص ۵۷

کسی فحش کام پر جبر کرنے کو بھی مثلہ کرنے میں شامل مانتے ہیں[1]۔

غلاموں کی عیادت

اسود بن ابی زید سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ جب کوئی وفد حضرت عمر کے پاس آتا تھا تو آپ اُس سے دریافت کرتے تھے "تمہارے علاقہ کا گورنر کیسا ہے؟ وہ کہتے بہت اچھا آدمی ہے"۔ پھر آپ دریافت کرتے "وہ تمہارے بیماروں کی عیادت کرتا ہے یا نہیں؟" وہ جواب دیتے "جی ہاں" آپ سوال کرتے کہ "غلاموں کی عیادت کرنے بھی جاتا ہے یا نہیں"۔ وہ کہتے کہ "ہاں جاتا ہے"۔ بعد ازاں آپ دریافت کرتے کہ ضعیفوں اور کمزوروں کے ساتھ اُس کا برتاؤ کیسا ہے؟ ان غریبوں کو اُس کے دروازہ پر بیٹھنے کی اجازت بھی ہے یا نہیں"۔ وہ اثبات میں جواب دیتے۔ اگر ان سوالات میں سے کسی ایک سوال کے جواب میں بھی یہ لوگ "نہیں" کر دیتے تو حضرت عمرؓ گورنر کو معزول کر دیتے تھے[2]۔

غلام کی دعوت قبول کرنا

بزار نے جابرؓ سے۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غلاموں اور باندیوں کی دعوت قبول کرتے تھے اور اُن کے ہاں تشریف لیجاتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ ایک درزی غلام کے پاس تشریف لے گئے، اُس نے خدمت اقدس میں ایک پیالہ پیش کیا، جس میں کدو پڑا ہوا تھا۔ حضور پُر نور نے اُسے بڑی خوشی کے ساتھ قبول فرمالیا اور تناول کیا[3]۔

غلام امامت کرتے تھے

آج کل مسجدوں کی امامت بالعموم ایسے لوگوں کے سپرد ہوتی ہے جو علم و فضل اور شرف و کمال کے اعتبار سے کسی بلند شخصیت کے مالک نہیں ہوتے لیکن درحقیقت اسلام میں

---

[1] القیاس فی الشرع الاسلامی ص ۶۰ و ۶۱۔ [2] تاریخ الطبری ج ۵ ص ۳۳ [3] شرح الشفا للشہاب ج ۲ ص ،،

یہ بہت بڑا شرف و امتیاز ہے جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف فرما رہے خود نماز پڑھاتے رہے۔ آخیر وقت میں آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا جس سے اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ آپ کے بعد خلافت حضرت ابوبکرؓ کو ہی ملنی چاہیے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

امامتِ صلوٰۃ کی اس اہمیت کو معلوم کرنے کے بعد آپ کو شاید تعجب ہو کہ یورپ اسلام کے جس غلام کو انتہا درجہ کا ذلیل و خوار سمجھتا ہے وہ مسلمانوں میں اتنا معظم و محترم ہے کہ نماز کی امامت کرتا ہے اور بڑے بڑے صحابہؓ جلیل المرتبت اس کی اقتدا میں نماز پڑھتے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ابوحذیفہ کے غلام سالمؓ نماز میں امامت کرتے تھے اور آپ کی اقتدا میں مہاجرین اولین جن میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ، ابوسلمہؓ، زیدؓ اور عامر بن ربیعہؓ بھی شامل ہوتے تھے۔ نماز پڑھتے تھے[1]۔

امام بخاری روایت مذکور کو جس باب کے ماتحت لائے ہیں اس کا ترجمہ استقضاء الموالی واستعمالھم ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں حدیث کے ساتھ ترجمہ کی مناسبت یہ لکھی ہے کہ امامتِ صلوٰۃ دینی کاموں میں سب سے بڑا اور اہم کام ہے، اور جب اس حدیث کے مطابق ایک غلام اس شرف کا مستحق سمجھا جا سکتا ہے تو گورنری، تحصیلداری، اور ججی وغیرہ ایسے عہدوں سے بدرجۂ اولیٰ فائز ہو سکتا ہے[2]۔ حضرت عمرؓ نے جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو کوفہ کا قاضی بنا کر بھیجا تو عمار بن یاسر کو جو آزاد کردہ غلام تھے کوفہ کا امام نماز اور کپتانِ فوج بنایا[3]۔

---

[1] صحیح بخاری باب استقضاء الموالی واستعمالھم [2] فتح الباری مطبوعہ مصر ج ۱۳ ص ۱۴۳

[3] فتوح البلدان بلاذری باب یوم جلولاء الوقیعۃ۔

غلام کی ملکیت

اسلام سے پہلے جو غلام ہوتے تھے کسی چیز کے مالک نہیں ہو سکتے تھے لیکن اسلام نے غلام معتق کی ملکیت کو تسلیم کیا ہے۔ بریرہؓ حضرت عائشہ کی باندی تھیں کسی شخص نے آپ کو گوشت ہبہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو دریافت کیا "کچھ ہے؟" بریرہ بولیں کہ جی ہاں گوشت موجود ہے، مگر فلاں نے مجھ کو صدقۃً دیا ہے"۔ آپ نے فرمایا۔ "لكِ صدقة ولنا هَدِيَةٌ" (وہ گوشت تیرے لیے تو صدقہ ہے مگر ہمارے لیے ہدیہ ہے) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غلام بھی اشیاء کا مالک ہو سکتا ہے۔ پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت عمر نے لوگوں کے وظائف وعطیات مقرر کیے تو اُن میں غلاموں کا بھی حصہ تھا۔ پس اگر غلام کے لیے ملکیت نہ ہوتی تو حضرت عمر کیوں غلاموں کا حصہ اُن کے آقاؤں سے الگ مقرر کرتے۔

غلامی غلاموں کے لیے رحمت تھی

اسلام کی ان تعلیمات کا یہ نتیجہ تھا کہ غلاموں کو بزمانۂ غلامی ایسی راحت وآسائش ملتی تھی جو اُنہیں آزاد ہونے کے بعد بھی یاد آتی تھی۔ بلکہ بعض بعض غلاموں کا حال تو یہ تھا کہ آزادی کا پیغام سُنتے ہی دل گرفتہ وحسرت زدہ ہو کر رہ جاتے تھے ابورافع کو آزاد کیا گیا تو رونے لگے۔ لوگوں نے سبب دریافت کیا۔ فرمایا کہ پہلے میرے لیے دو اجر تھے، اب ایک ہی اجر رہ گیا۔[1]

بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ فرماتے تھے "قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر جہاد نہ ہوتا، اور حج اور ماں کے ساتھ نیکی کرنے کا فرض مجھ پر عائد نہ ہوتا تو میں اس بات کو پسند کرتا کہ میں مروں درآنحالیکہ میں غلام ہوں[2]۔

---

[1] یہ روایت اسی کتاب میں "غلام نصیحت کر سکتا ہے" کے زیر عنوان گزر چکی ہے۔ [2] الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۲۵۵۔

غلاموں کے لیے اجر کی زیادتی

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جنت میں سب سے پہلے جانے والا وہ غلام ہے جو اللہ کی اور اپنے آقا کی اطاعت کرتا ہے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ جنت میں نہ بخیل داخل ہوگا نہ دھوکہ باز اور نہ وہ جو اپنی ملکیت کو بُرے طور سے استعمال کرتا ہے، اور جنت کا دروازہ کھٹکھٹانے میں وہ لوگ سب سے پہلے ہونگے جو غلام ہیں اور وہ اللہ کے اور اپنے حقوق ادا کرتے ہیں[1]۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک شخص جنت میں داخل ہوکر دیکھیگا کہ اُس کا غلام اُس سے اوپر کے درجہ میں ہے۔ وہ کہیگا "اے خدا یہ تو میرا غلام ہے" جواب ملیگا "میں نے اُس کو اُس کے عمل کا، اور تجھ کو تیرے عمل کا بدلہ دیا ہے[2]"۔

غلام سیادت کرتے تھے

غلاموں کو سوشل زندگی میں بھی احرار کے ساتھ پوری مساوات تھی۔ اسلام کی ان تعلیمات کا اثر یہ تھا کہ مسلمان غلاموں اور باندیوں کی تعلیم و تربیت میں بالکل اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی طرح اہتمام کرتے تھے، اور اُن کو فضل و ہنر اور علم و ادب کے حاصل کرنے میں پوری آزادی دی، اور پھر علم و کمال کے زیور سے آراستہ ہوکر جو غلام سوسائٹی میں آئے، اُن کی کماحقہٗ تعظیم و تکریم کی گئی۔ غلامی کا نشانِ داغ اُن کے فضل و کمال کے لیے ساتر نہیں ہوسکا۔ امارت و سیادت کے لیے صرف حسنِ قابلیت اور اس عہدہ کی اہلیت و لیاقت شرط تھی۔ غلام اور آزاد کا اس میں کوئی فرق نہیں تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کی مہم پر لشکر بھیجنا چاہا، تو اُس کی قیادت حضرت اُسامہؓ

[1] رواہ احمد و ابویعلی باسنادِ حسن [2] یہ روایتیں میں نے الترغیب و الترہیب باب ترغیب المملوک فی اداءِ حق مولاہ سے لی ہیں۔

غلام کی ملکیت | اسلام سے پہلے جو غلام ہوتے تھے کسی چیز کے مالک نہیں ہو سکتے تھے لیکن اسلام نے غلام معتق کی ملکیت کو تسلیم کیا ہے۔ بریرہؓ حضرت عائشہ کی باندی تھیں کسی شخص نے آپ کو گوشت ہبہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو دریافت کیا "کچھ ہے؟" بریرہ بولیں کہ جی ہاں گوشت موجود ہے، مگر فلاں نے مجھ کو صدقۃً دیا ہے"۔ آپ نے فرمایا "لكِ صدقة ولنا هدية" (وہ گوشت تیرے لیے تو صدقہ ہے مگر ہمارے لیے ہدیہ ہے) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غلام بھی اشیاء کا مالک ہو سکتا ہے۔ پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت عمر نے لوگوں کے وظائف وعطیات مقرر کیے تو اُن میں غلاموں کا بھی حصہ تھا۔ پس اگر غلام کے لیے ملکیت نہ ہوتی تو حضرت عمر کیوں غلاموں کا حصہ اُن کے آقاؤں سے الگ مقرر کرتے۔

غلامی غلاموں کے لیے رحمت تھی | اسلام کی ان تعلیمات کا یہ نتیجہ تھا کہ غلاموں کو زمانۂ غلامی ایسی راحت و آسائش ملتی تھی جو انہیں آزاد ہونے کے بعد بھی یاد آتی تھی۔ بلکہ بعض بعض غلاموں کا حال تو یہ تھا کہ آزادی کا پیغام سنتے ہی دل گرفتہ و حسرت زدہ ہو کر رہ جاتے تھے ابو رافع کو آزاد کیا گیا تو رونے لگے۔ لوگوں نے سبب دریافت کیا۔ فرمایا کہ پہلے میرے لیے دو اجر تھے، اب ایک ہی اجر رہ گیا۔[1]

بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ فرماتے تھے "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر جہاد نہ ہوتا، اور حج اور ماں کے ساتھ نیکی کرنے کا فرض مجھ پر عائد نہ ہوتا تو میں اس بات کو پسند کرتا کہ میں مروں درآنحالیکہ میں غلام ہوں[2]۔

---

[1] یہ روایت اسی کتاب میں "غلام نصیحت کرسکتا ہے" کے زیر عنوان گزر چکی ہے۔ [2] الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۲۵۵۔

غلاموں کے لیے اجر کی زیادتی

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جنت میں سب سے پہلے جانے والا وہ غلام ہے جو اللہ کی اور اپنے آقا کی اطاعت کرتا ہے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ جنت میں نہ بخیل داخل ہوگا نہ دھوکہ باز اور نہ وہ جو اپنی ملکیت کو برے طور سے استعمال کرتا ہے، اور جنت کا دروازہ کھٹکھٹانے میں وہ لوگ سب سے پہلے ہونگے جو غلام ہیں اور وہ اللہ کے اور اپنے حقوق ادا کرتے ہیں۔[1]

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک شخص جنت میں داخل ہو کر دیکھیگا کہ اس کا غلام اس سے اوپر کے درجہ میں ہے۔ وہ کہیگا "اے خدا یہ تو میرا غلام ہے" جواب ملیگا "میں نے اس کو اس کے عمل کا، اور تجھ کو تیرے عمل کا بدلہ دیا ہے۔[2]"

غلام سیادت کرتے تھے

غلاموں کو سوشل زندگی میں بھی احرار کے ساتھ پوری مساوات تھی۔ اسلام کی ان تعلیمات کا اثر یہ تھا کہ مسلمان غلاموں اور باندیوں کی تعلیم و تربیت میں بالکل اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی طرح اہتمام کرتے تھے، اور ان کو فضل و ہنر، علم و ادب کے حاصل کرنے میں پوری آزادی دی، اور پھر علم و کمال کے زیور سے آراستہ ہو کر جو غلام سوسائٹی میں آئے، اُن کی کماحقہٗ تعظیم و تکریم کی گئی۔ غلامی کا نشان داغ اُن کے فضل و کمال کے لیے ساتر نہیں ہو سکا۔ امارت و سیادت کے لیے صرف حسنِ قابلیت اور اس عہدہ کی اہلیت و لیاقت شرط تھی۔ غلام اور آزاد کا اس میں کوئی فرق نہیں تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کی مہم پر لشکر بھیجنا چاہا، تو اُس کی قیادت حضرت اُسامہؓ

---

[1] رواہ احمد و ابویعلیٰ باسنادِ حسن [2] یہ روایتیں میں نے الترغیب والترہیب باب ترغیب المملوک فی اداءِ حق مولاہ سے لی ہیں

کے سپرد کی حالانکہ وہ اُس وقت صرف اٹھارہ برس کے نوجوان غلام تھے۔ اس فوج میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابی شریک تھے۔ سب نے اسامہ کی اطاعت کی خلیفۂ اسلام حضرت ابوبکرؓ دور تک لشکر کی مشایعت کو تشریف لے گئے اور اس شان سے کہ اُسامہؓ گھوڑے پر سوار تھے اور ابوبکر صدیقؓ اُن سے لگے ہوئے پا پیادہ چل رہے تھے۔ حضرت اُسامہؓ بولے" یا تو آپ سوار ہو جائیے، ورنہ میں بھی پیدل چلونگا۔ آپ نے فرمایا" نہیں اللہ کی قسم تم گھوڑے سے نہیں اُترو گے ونہ میں بھی سوار نہیں ہونگا

زہری کہتے ہیں" میں ایک مرتبہ عبدالملک بن مروان کے پاس آیا تو اُس نے مجھ سے پوچھا تم کہاں سے آرہے ہو؟ میں نے کہا" مکہ سے" اس کے بعد مجھ میں اور عبدالملک میں حسب ذیل گفتگو ہوئی:-

عبدالملک:- "تمہاری روانگی کے وقت (مکہ سے) اہل مکہ کا سردار کون تھا؟"

زہری:- عطا ربن رباحؒ!

عبدالملک:- وہ عرب ہے یا غلام؟

زہری:- غلام!

عبدالملک:- "تو پھر عرب کا سردار کیونکر ہوگیا؟"

زہری:- "دیانت اور روایت کی وجہ سے"

عبدالملک:- بیشک اہل دیانت و روایت ہی سرداری کے مستحق ہیں۔

لہ طبری ج ۳ ص ۲۱۲

پھر عبدالملک نے دریافت کیا، "اچھا اہل یمن کا سردار کون ہے؟"

زہری :- طاؤس بن کیسان!

عبدالملک :- عرب ہے یا غلام

زہری :- غلام!

عبدالملک :- تو پھر یمن کا سردار کیونکر ہوگیا؟

زہری :- جس بنا پر کہ عطا اہل مکہ کا سردار ہے!

عبدالملک :- بیشک جو شخص عطا کی طرح صاحب دیانت و روایت ہو اُس کو سیادت کا حق ہے۔ اچھا اہل مصر کا سردار کون ہے؟

زہری :- یزید بن حبیب!

عبدالملک :- عرب ہے یا غلام؟

زہری :- غلام!

اس پر عبدالملک نے پھر وہی کہا کہ غلام عرب کا سردار کیونکر ہوگیا۔ اور زہری نے بھی حسب معمول وہی جواب دیا، اور اُس کو سُن کر عبدالملک نے پھر وہی کہا کہ بیشک صاحبِ دیانت و روایت شخص سیادت کا مستحق ہے۔ عبدالملک نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے پھر پوچھا۔ "اہل شام کا سردار کون ہے؟

زہری :- مکحول الدمشقی!

عبدالملک :- عرب ہے یا غلام؟

زہری:۔ غلام۔ اور غلام بھی کیسا! حبشی، قبیلۂ ہذیل کی ایک عورت کا آزاد کردہ غلام ہے۔

عبدالملک:۔ اہل جزیرہ کا سردار کون ہے؟

زہری:۔ میمون بن مہران!

عبدالملک:۔ عرب ہے یا غلام؟

زہری:۔ غلام!

عبدالملک:۔ اچھا اہل حرم کا سردار کون ہے؟

زہری:۔ ضحاک بن مزاحم

عبدالملک:۔ عرب ہے یا غلام؟

زہری:۔ غلام!

عبدالملک:۔ بصرہ کا سردار کون ہے؟

زہری:۔ حسن بن ابی الحسن!

عبدالملک:۔ عرب ہے یا غلام؟

زہری:۔ غلام!

عبدالملک:۔ اچھا! اہل کوفہ کا سردار کون ہے؟

زہری:۔ ابراہیم النخعی!

عبدالملک: عرب ہے یا غلام؟

زہری:۔ عرب!

عبدالملک نے ابراہیم النخعیؒ کا نام سُنا جو عرب تھے تو فرطِ مسرت میں کہنے لگا: "زہری تو برباد ہو! تو نے اب میری تشویش کو دور کر دیا، اس کے بعد خود ہی کہا "اللہ کی قسم غلاموں کو بڑے بڑے لوگوں پر سردار ہونا چاہیے، یہاں تک کہ اُن کے نام کے خطبے برسرِ منبر پڑھے جائیں اور عرب اُن کے نیچے بیٹھے ہوئے ہوں۔"

زہریؒ کہتے ہیں " میں نے کہا: ہاں بیشک اے امیر المومنین سرداری اللہ کا حکم اور اس کا دین ہے، جو کوئی اُس کی حفاظت کریگا سردار ہوگا اور جو اُس کو ضائع کر دیگا ذلیل و خوار ہوگا[1]۔

نُصیب عرب کا ایک مشہور شاعر اور غلام ہے۔ اُس نے اپنا ایک قصیدہ عبدالملک کے سامنے پڑھا، اور اُس نے خوش ہو کر نصیب کو ایک رقمِ کثیر دی۔ اُس پر کسی شخص نے کہا " یہ تو غلام سیاہ فام ہے"۔ عبدالملک بولا "یہ اگرچہ سیاہ ہے، اس کے اشعار تو سفید ہیں[2]"۔

جو غلام اپنے علم و فضل کی وجہ سے یا کسی خاص فن میں مہارت رکھنے کے باعث مسلمانوں کے سرتاج تھے اور احرار و شرفا تک ان کی توقیر کرتے تھے، اُن میں سے اکثر مشہور غلاموں کے حالات ہم نے کتاب کے دوسرے حصے میں لکھے ہیں۔ اُن کو دیکھنا چاہیے۔

غلاموں کی اعانت کے لیے اوقاف

اسلام نے مسلمانوں میں غلاموں کو آزاد کرنے اور آزاد کرانے کا اور اُن کو نظرِ استحقار سے نہ دیکھنے کا جو ولولہ پیدا کیا تھا، اُس کا نتیجہ یہ تھا کہ جو مسلمان صاحبِ ثروت

---

[1] یہ واقعہ ادب کی متعدد کتابوں میں مذکور ہے۔ مگر ہم نے تفسیر روح البیان ج ۳ ص ۳۲۱ سے لیا ہے۔ طوالت کے باوجود پورا واقعہ من وعن اس لیے نقل کر دیا ہے کہ عبدالملک اور حضرت زہریؒ کی اس گفتگو سے غلام کے متعلق اسلامی تخیل پر روشنی پڑتی ہے۔

[2] الکامل للمبرد ج ۲۔

ہوتے تھے اپنی رقم کا ایک حصۂ کثیرہ اس مصرف میں صرف کرتے تھے، بلکہ محض غلاموں کی امداد کے لیے وقف کر جاتے تھے۔ دمشق میں ایک وقف تھا جو وقف زبادی کے نام سے مشہور تھا ابن بطوطہ اس کی نسبت لکھتا ہے کہ یہ ایک مکان ہے جہاں چینی کے بڑے بڑے برتن رکھے رہتے ہیں۔ اصحابِ وقف نے اس مکان کو اس غرض سے وقف کیا ہے کہ اگر کسی غلام سے اپنے آقا کا کوئی برتن ٹوٹ جائے تو وہ اُس کو اس مکان میں رکھ جائے اور اُس کے بدلہ میں یہاں سے کوئی دوسرا اچھا برتن لیجائے۔

اسی طرح کا ایک وقف تیونس میں تھا، اور فاس میں بھی[1]۔

ان اوقاف کے علاوہ مسلمان اس کا بھی خیال رکھتے تھے کہ کافر غلاموں کو دے کر مسلمان غلام لے لیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ مسلمان غلام دار الحرب سے دار الاسلام میں آنے کے بعد فوراً آزاد ہو جاتے تھے۔ اور دوسری طرف کافر غلام بھی دار الکفر میں پہنچ کر آزاد ہو جاتے ہونگے۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجر امام احمد سے نقل کرتے ہیں:۔

ولو كان عند المسلمين اسارى وعند المشركين اسارى واتفقوا على المفاداة تعينت (ج ٦ ص ۱۲۵ مطبوعہ جدید (مصر)	اور اگر مسلمانوں کے پاس قیدی ہوں۔ اور مشرکین کے پاس بھی ہوں، اور باہمی تبادلہ پر یہ رضامند ہو جائیں تو تبادلہ یقینی ہے۔

شیخ ابن ہمام تحریر فرماتے ہیں "امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ سب اس پر متفق ہیں کہ اگر دشمن مسلمان اسیروں سے اپنے اسیروں کا تبادلہ کر لینے پر راضی ہو تو تبادلہ کر لینا چاہیئے[2]۔

[1] حاضر العالم الاسلامی ج ۳ ص ۸-۹۔ [2] فتح القدیر ج ۴ ص ۳۰۳

اس سلسلہ میں سب سے بڑی مفادات وہ ہے جو مسلمانوں اور رومیوں کے درمیاں ہوئی خلفاء بنی اُمیہ بھی اپنے گرفتار شدہ لوگوں کا فدیہ لیتے تھے۔ سب سے پہلے جو فدیہ منظم طریقہ پر ادا کیا گیا وہ تھا جو ۱۸۹ھ میں ہارون رشید کے ہاتھ سے انجام کو پہنچا۔ پھر ڈیڑھ سو برس کی مدت میں مفادات کے اس طرح کے کئی واقعات پیش آئے۔ مشہور مؤرخ مقریزی کا بیان ہے کہ مسلمانوں کی توجہ اپنے اُن بھائیوں کو رہا کرانے کی طرف زیادہ مائل رہنے لگی جو کفار کے قبضہ میں گرفتار تھے ارباب ثروت میں جو اہل ورع تھے وہ غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے مال وقف کرتے تھے۔[1]

اسلام کی تعلیم اور اُس کے زیر اثر صحابۂ کرام کے حسن سلوک و معاشرت کا اثر یہ تھا کہ غلام آقاؤں پر جان دیتے تھے۔ اور اُن کے فرمان کی بخوشی تعمیل کرتے تھے۔ افلح حضرت ابو ایوب انصاری کا غلام تھا۔ انھوں نے اس کو مکاتب کر کے آزاد کرنا چاہا تمام لوگوں نے اس کو مبارکباد دی۔ لیکن بعد میں حضرت ابو ایوب انصاری نے کتابت کے عہدنامے کو فسخ کرنا چاہا۔ افلح کے متعلقین نے کہا "کیا تم پھر غلامی میں رہنا پسند کرو گے؟ حالانکہ خدائے تعالیٰ نے تم کو آزاد کر دیا تھا۔" افلح نے کہا "میں کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا" چنانچہ اس نے خود معاہدہ کو فسخ کر دیا۔ اس کے چند دنوں کے بعد ہی حضرت ابو ایوب نے اُن کو آزاد کر دیا اور کہا کہ "جو مال تمہارے پاس ہو وہ کل تمہارا ہے"۔[2]

اسلامی تعلیم کا اثر | عبداللہ بن جدعان کے پاس مکہ میں تقریباً ایک سو غلام تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں سے متعلق اسلامی تعلیمات کی اشاعت کی تو اُن غلاموں میں اس قدر

---

[1] مقریزی جلد ۲ ص ۷۹، ۱۹۱ بحوالہ الجواہر فی تفسیر القرآن ج ۲ ص ۱۵۴ [2] طبقات ابن سعد تذکرۂ افلح

جوش پھیلا کہ انہیں مکہ سے کسی دوسری جگہ لیجانا پڑا[۱]۔

اسلامی تعلیم کا ایک بڑا اثر یہ ہوا کہ عربوں نے قبائل اور ملکی و وطنی عصبیت سے الگ ہو کر اسلامی اخوت، برادری کا احساس کیا۔ اور ان کے معاملات اپنے غلاموں اور باندیوں کے ساتھ بھی نہایت خوشگوار ہو گئے۔ حضرت عمر نے سالم جو ایک غلام تھے اُن کے متعلق فرمایا "اگر سالم زندہ ہوتے تو میں اُن کو حکومت سپرد کرتا"۔ حضرتِ معاویہ فرماتے تھے "اگر یزید کی بیعت کا طوق مسلمانوں کی گردن میں نہ ہوتا تو میں قاسم و محمد (جو جواری کے بطن سے تھے) کے درمیان اس امر خلافت کو شوریٰ کر دیتا"۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم اپنے خلیفہ کی اطاعت کرو اگرچہ وہ عبد حبشی ہو"۔

اسلامی اخوت اور انسانی احترام کے اس احساس قوی کا ہی نتیجہ تھا کہ مسلمان غلاموں سے بھائیوں اور بیٹوں جیسا اور باندیوں سے بہنوں اور بیٹیوں کی طرح معاملہ کرتے تھے۔ اور اُن کا ایسا کرنا کسی اقتصادی طمع اور لالچ پر مبنی نہیں تھا، بلکہ صرف اس لیے کہ اسلام کی تعلیمات نے اُن کے دل و دماغ کو بُرے اخلاق و عادات سے پاک و صاف کر کے پسندیدہ خصائل و شمائل کے زیور سے آراستہ کر دیا تھا۔ اور اُن کی نظر میں آقا اور غلام، مالک اور مملوک دونوں ایک مساوی حیثیت رکھتے تھے۔

مدائنی کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ کے ساتھیوں کی ایک جماعت آپ کے پاس آئی اور کہنے لگی "اے امیر المومنین آپ یہ اموال تقسیم کر دیجیے۔ اور عرب اور قریش کو موالی اور عجم پر ترجیح

---

[۱] عظم الکلام فی ارتقاء الاسلام ص ۴۳   [۲] شرح النہج جزء ۱۔ ص ۱۸۲۔

دیجیے۔ حضرت علی نے جواب دیا۔

اتامرونی ان اطلب النصر بالجور[1] کیا تم مجھ کو حکم کرتے ہو کہ میں ظلم و ستم کر کے مدد طلب کروں

بنو اُمیہ اور عربی عصبیت

بنو اُمیہ جو سخت عربی عصبیت رکھتے تھے اور جن کو اپنے خاندانی شرف و مجد پر اتنا ناز تھا کہ عجم کے ملوک و اشراف کو بھی نظر میں نہیں لاتے تھے۔ اسلام کی تعلیمات سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ حجاج بن یوسف ثقفی ظلم و ستم کی دنیا کا ایک نمایاں ہیرو ہے۔ غریب موالی خاص طور پر اس کے ناوک خوردہ ستم تھے۔ اس نے شہر واسط میں پہنچ کر وہاں سے تمام نبطیوں کو نکال کر مختلف دیہاتوں میں اس غرض سے بھیج دیا کہ اُن کا عربی لب و لہجہ خراب ہو جائے اور وہ سوسائٹی میں کسی مرتبۂ رفیع کو حاصل نہ کر سکیں، اور صرف یہی نہیں بلکہ اُن کے ہاتھوں کو بھی داغدار کر دیا۔ لیکن موالی و عجم کے خلاف اس قدر شدید تعصب رکھنے کے باوجود اُس نے حضرت سعید بن جبیر کو کوفہ کا امام اور قاضی مقرر کیا۔ اور جب اہل کوفہ نے اپنی عادت کے مطابق[2] ان کی شکایت کی تو ابو بردۃ بن ابی موسیٰ الاشعری کو یہاں کا قاضی مقرر کر دیا۔ مگر

---

[1] شرح النہج جزو ا ص ۱۸۲ [2] کوفہ کے لوگ عجیب طرح کے بد دماغ واقع ہوئے تھے حضرت عمرؓ کے عہد میں سعد بن ابی وقاص یہاں کے گورنر ہوئے تو انہوں نے ان کی اس قدر شکایتیں بارگاہِ خلافت میں پہنچائیں کہ حضرت عمرؓ کو مجبوراً انہیں معزول کرنا پڑا۔ مگر جب عمار بن یاسر یہاں کے گورنر مقرر ہوئے تو انہوں نے کہا کہ یہ تو ضعیف و کمزور ہیں، سیاست نہیں جانتے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ میں اہل کوفہ کو کیا کہوں، ایک قوی اور مدبر کو یہاں کا گورنر مقرر کرتا ہوں تو کہتے ہیں "یہ تو بڑا سخت مزاج ہے" اور اگر کسی نرم خو کو گورنر بناتا ہوں تو کہنے لگتے ہیں "یہ تو بہت کمزور ہے، سیاست ہی نہیں جانتا" اور خود حضرت سعد نے اہل کوفہ کی حق میں دعا کی تھی اللھم لا ترضہم عنہم امیرًا ولا ترضھم بامیر۔ یعنی اے خدا نہ تو اہل کوفہ سے کسی امیر کو خوش رکھ اور نہ اہل کوفہ کو کسی امیر سے چنانچہ ان لوگوں کا حال یہی ہوا۔ جو کوئی ان کے ہاں گورنر ہو کے آیا انہوں نے اس کی مخالفت کی، (باقی بر صفحہ ۲۰۲)

ساتھ ہی حجاج نے ان کو لکھا کہ سعید بن جبیر سے مشورہ برابر کرتے رہنا۔ پھر جب عبدالرحمٰن بن الاشعث نے حجاج کے خلاف بغاوت کی تو سعید بن جبیر نے عبدالرحمٰن کا ساتھ دیا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ شہید کردیے گئے۔ (الکامل للمبرد ج ۲)

باایں ہمہ اس میں شک نہیں کہ عرب سوسائٹی میں موالی کے حد سے زیادہ عمل دخل کے باعث بنوامیہ کی سربی عصبیت جس کو اسلام کی تعلیم نے قریب قریب فنا کردیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تیس برس بعد پھر بیدار ہوگئی۔ لیکن ہمیں اس پر متعجب نہ ہونا چاہیے۔ جن لوگوں نے خود آپس میں بنوامیہ اور بنوہاشم کا خط امتیاز کھینچ کر ایک دوسرے پر تفوق ثابت کرنے کی کوشش کی ہو اور پھر اس فوقیت کو انہوں نے تلوار کی قوت سے منوانے میں بھی دریغ نہ کیا ہو اگر انہوں نے عربیت و عجمیت کا سوال پیدا کردیا۔ تو اس میں حیرت کی بات ہی کیا ہے۔ اس قسم کے متعصب عربوں کا حال یہ تھا کہ موالی کو بنظر استحقار دیکھتے۔ اور ان کی کثرت سے کڑھتے اور گھٹتے تھے چنانچہ ایک شاعر (ریاشی) کہتا ہے۔

إِنَّ اولادَ السرارِی   كَثُرُوا يا ربّ فينا

ربّ ادخلنی بلادًا   لا اری فیها ھجینا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۱) اور اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ یہاں تک کہ عہد بنوامیہ میں جب حجاج کو یہاں کی گورنری ملی تو انہوں نے اس کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرنا چاہا لیکن حجاج انتہا درجہ کا تندخو بے رحم اور سخت مزاج تھا۔ اس نے ان لوگوں کو تمسخر کرتے ہوئے دیکھا تو یہ شعر پڑھا۔ انا ابن جلا وطلاع الثنایا ؛ متی اضع العمامۃ تعرفونی۔ ترجمہ:"میں روشن ہوں، اور گھاٹیوں پر چڑھنے والا ہوں۔ جب میں عمامہ اتار کے رکھونگا تو تم مجھ کو پہچان لوگے" اور پھر اس نے کہا، اہل کوفہ! میں سروں کو دیکھ رہا ہوں کہ پک گئے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ وہ جو قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے وانزلنا الحدید فیہ بأس شدید اسی قسم کے لوگوں کے متعلق ہے۔

ترجمہ:- اے خدا باندیوں کی اولاد ہم میں بہت بڑھ گئی ہے۔ تو مجھ کو ایسے شہروں میں پہنچا دے جہاں میں کسی دوغلے آدمی کو نہ دیکھوں۔

ایک اعرابی سوار قاضی کے پاس گیا، اور کہنے لگا "میرے باپ کا انتقال ہوگیا اور اُس نے ہم تین لڑکوں کو اپنا وارث چھوڑا ہے۔ جن میں سے میں اور ایک دوسرا لڑکا حرّہ کے بطن سے ہیں، اور تیسرا بھائی ہجین ہے۔ یعنی باندی کے بطن سے۔ اب آپ بتائیے ہم تینوں میں مرحوم کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟" قاضی صاحب نے فرمایا "ترکہ کے برابر تین حصّے کرلو اور تینوں بھائی ایک ایک حصّہ لے لو، بشرطیکہ تمہارے علاوہ کوئی اور وارث نہ ہو" اعرابی کہنے لگا "کیا وہ ہمارا ہجین بھائی بھی ہماری برابر حصّہ لیگا۔" قاضی نے کہا "بیشک" یہ سُن کر اعرابی خفا ہوگیا اور بولا "معلوم ہوتا ہے کہ تیری خالاؤں میں شریف عورتیں کم ہیں۔"

شعوبیّہ ادھر عربی عصبیت حد سے زیادہ ہوگئی، اور موالی آئے دن استحقار و استخفاف سے دوچار ہونے لگے اور اُدھر اسلام نے موالی میں خودداری اور عزت نفس کا جذبہ، اور مساواتِ انسانی کا قوی احساس پیدا کردیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کی متعصبانہ ذہنیت کے برخلاف ایک نیا فرقہ پیدا ہوگیا، جو شعوبیہ کہلاتا تھا۔ عربی زبان وادب کے بعض بڑے بڑے ماہروں نے اس فرقہ کی سرپرستی کی۔ اور اس کو پروان چڑھایا۔ مصر کی جدید کتاب "ضحی الاسلام" کے فاضل مصنف کے بقول شعوبیہ کی تاریخ دیکھنے سے حسب ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) فرقۂ شعوبیہ کے علمبرداروں نے شروع شروع میں تو اسلامی تعلیمات پر ہی اپنے دعووں کی بنیاد رکھی۔ اور اُن کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ کوئی شخص کسی دوسرے پر محض عربی یا عجمی ہونے

یا کسی خاص شعب وگروہ سے تعلق رکھنے کی بناء پر فائق نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اعمال صالحہ اور اچھے کردار کی وجہ سے ہی کسی انسان کو فوقیت دی جاسکتی ہے۔ لیکن بعد میں اُن کا یہ ادعا رعرب کے استحقار میں تبدیل ہوگیا۔

(۲) شعوبیّت کوئی مستقل مشرب یا مسلک (cult) نہیں تھا جس کی تعلیمات مخصوص قسم کی ہوں، اور جس کے شعائر بھی ایک جُدا طرز کے ہوں جیسے شافعیت اور حنفیت یا شیعیت اور اہل سنت والجماعت ہونا۔ بلکہ وہ ایک طرح کا رجحانِ اجتماعی تھا جیسے آج کل ہم کہتے ہیں، جمہوریت یا شخصیت، اشتراکیت، فوضویت، نازیت، یا فسطزم۔ اور اسی بناء پر اس کے ماننے والوں کی تعداد کو متعین نہیں کیا جاسکتا، بلکہ کہنا پڑیگا کہ ہر گاؤں میں ہر شہر میں، ہر مقام اور ہر موضع میں اس خیال کے تھوڑے بہت لوگ پائے جاتے ہیں۔

(۳) شعوبیت کی ترقی کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اس میں رجحان وطنی اور تعصبِ دینی دونوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ اور خلفاء عباسیہ کے زیر سایہ اہل فارس کو جو فروغ حاصل ہوا تھا اُس سے بھی اس احساس کو بڑی مدد ملی۔

(۴) جیسا کہ بیان ہوچکا ہے اوّل اوّل تو شعوبیت کا ظہور محض عرب کے بعض قبائل کی شدید قبائلی عصبیت کی وجہ سے ہوا۔ لیکن جیسا کہ ہر تحریک کا قاعدہ ہے بعد میں شعوبیت کی تحریک نے ایسے لوگوں کو پیدا کیا جو اپنے بالمقابل عرب کی کسی فضیلت اور برتری کو تسلیم کرنے کے لیے ایک آن تیار ہی نہ ہوسکتے تھے، چنانچہ سعید بن حمید البختکان جو شیریں بیان شاعر و مضمون نگار تھا اور دعویٰ کرتا تھا کہ ایرانی بادشاہوں کی اولاد سے ہے، اُس نے عجمی فضیلت پر چند کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب

کا نام "انتصاب العجم من العرب" تھا۔ اور دوسری کا نام "مفاخر العجم" پھر ہیثم بن عدی نے جو منصور، مہدی ہادی اور رشید کا ہم نشین تھا، عرب کی برائیوں پر چند کتابیں لکھیں۔ ابن ندیم نے اُن کے نام یہ لکھے ہیں (۱) کتاب "المثالب الصغیر" (۲) "کتاب المثالب الکبیر" (۳) "کتاب مثالب ربیعۃ" (۴) "اسماء بغایا قریش فی الجاہلیۃ" (۵) "اسماء من وَلَدْنَ" "کتاب من تزوج من الموالی فی العرب۔"

عِلّانَ الشعوبی نے "المیدان فی المثالب" نامی ایک کتاب لکھی جس میں ابن ندیم کے بقول اُس نے عرب کی حد سے زیادہ مذمت کی اور اُن کے عیوب کو گن گن کر بیان کیا۔ اس کے اہم ابواب یہ ہیں :-

مثالب قریش، مثالب تیم بن مُرہ، مثالب بنی اسد بن عبد العزیٰ، مثالب بنی مخزوم۔ اسی طرح ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ نے کتاب "لصوص العرب" اور "ادعیاء العرب" لکھی[1]

ان کے علاوہ اور بھی بہتیری کتابیں ہیں جو شعوبیت کے زیر اثر عرب کی مذمت پر لکھی گئیں ہمارا مقصد اس کے ذکر سے یہ دکھانا ہے کہ اسلام نے اپنی تعلیم مساوات سے خود غلاموں اور موالی عجم میں عزتِ نفس اور خودداری کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ جب اُنھوں نے عربی عصبیت کے ہاتھوں اپنے آپ کو ذلیل ہوتے ہوئے دیکھا تو اس کو برداشت نہ کر سکے اور ایک مستقل تحریک کی سلک میں منظم ہو کر اُنھوں نے زبردست مقاومت کی سعی بلیغ کی۔ ظاہر ہے اگر اسلام ان کا حامی و مددگار نہ ہوتا تو بنی عباس کی طاقتور عربی حکومت کے زیر سایہ رہتے ہوئے اُن کو کبھی یہ جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ نفسیاتی طور پر غور کیجیے تو شعوبیت کا ظہور اور اُس کا ارتقا اُس ذہنیتِ مساوات و برابری

---

[1] یہ سب معلومات ابن ندیم کی کتاب الفہرست سے ماخوذ ہیں۔

کا نتیجہ تھا جو اسلام کی تعلیمات نے آقاؤں اور غلاموں، عربوں اور عجمیوں سب میں یکساں طور پر پیدا کردی تھی اور جس کی وجہ سے نہ ایک عربی کو عجمی پر، اور نہ کسی عجمی کو عربی پر، ایک آقا کو اپنے غلام پر، اور نہ کسی غلام کو اپنے آقا پر تفوق و برتری جتانے کا حق تھا۔

مسٹر اٹربری (Atterbury) کہتے ہیں:۔

"ایک زنگی اسلام میں داخل ہوتے ہی اپنے نفس کی عزت کو محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کے بعد کہ وہ اپنے آپ کو غلام یقین کرتا تھا، آزاد اور حُر سمجھتا ہے[1]۔

موسیو بونہ موری ان اسباب پر بحث کرتے ہوئے جو اہل افریقہ میں اسلام کی کامیابی کا باعث ہوئے لکھتا ہے" اسلام میں طبقات اور درجات نہیں ہیں۔ زنگی اسلامی جماعت میں داخل ہوکر اپنے تئیں حقیر نہیں سمجھتا" اس کے بعد کہتا ہے" غنی اور فقیر ہر مذہب میں ہوتے ہیں لیکن مسلمان مالداروں میں وہ خشونت اور سختی نہیں پائی جاتی جو ہمارے اغنیاء میں بالعموم محسوس کیجاتی ہے۔ اغنیاء اسلام اغنیاء نصاریٰ کی بہ نسبت نعمتوں کے زوال اور تغیر احوال کو زیادہ یاد رکھتے ہیں اور ایک مسلمان فقیر پر یہ دشوار نہیں کہ اغنیاء اسلام میں سے کسی ایک کے گھر میں داخل ہو جائے اور وہاں اپنے لیے سامان ضیافت پائے[2]"۔

لین پول (Lane pole) کہتا ہے:۔

سلجوقیوں کے بڑے بڑے غلام ایسے ہی معزز اور فخر کرنے والے تھے جیسا کہ قرون وسطیٰ کی جمہوریت کے سپہ سالار اور بہادر، اور جب ان لوگوں نے شاہی طاقت کو اپنے ہاتھ میں

---

[1] بحوالۂ حاضر العالم الاسلامی ج ۲ ص ۴۔ [2] حاضر العالم الاسلامی ج ۲ ص ۴

لیا تو ان کو ورثہ میں اپنے سابقہ آقاؤں کی اونچی روایات ملی تھیں[1]۔

اسلام اور مسیحیت کا فرق

غلامی سے متعلق اسلامی تعلیمات جو آپ اوپر پڑھ آئے ہیں۔ اُن سے یہ امر بوضاحت معلوم ہو جاتا ہے کہ جہاں تک اسلامی تعلیم و ارشاد کا تعلق ہے۔ اسلام نے غلامی کے رواج کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ بلکہ اس کو مصلحتِ وقت کے پیش نظر باقی رکھ کر مختلف تدبیروں کے ذریعہ ایسی حالت میں پہنچا دیا ہے کہ اگر مسلمان ان تعلیمات کی اصل اسپرٹ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُن پر سختی سے کاربند ہوتے تو یہ رواج بہت جلد اپنی موت آپ مرگیا ہوتا۔ اب اس کے بالمقابل مسیحیت کا جائزہ لیجیے تو واضح ہوگا کہ جو لوگ ہم پر حرف گیری کی دھول اُڑا رہے ہیں، خود ان کے جیب و دامن کس حد تک اس گرد سے اٹے ہوئے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو ایسا بے تعصب مصنف کہتا ہے۔

"۔۔ بت میں غلام مسیح کا یہ دعوے نہ تھا، جو کسی رعایت خاص کا مستحق ہیں"

شمالی ریاستہائے امریکہ میں انسداد غلامی کی جنگ

آج پیروان مسیحیت بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہم نے قانوناً غلامی کا انسداد کر دیا لیکن آپ اسلام اور مسیحیت کا اس معاملہ میں موازنہ کریں تو صاف معلوم ہوگا کہ مسیحیت کے علمبرداروں نے جو کچھ کیا وہ صرف اقتصادی حالات سے مجبور ہو کر کیا۔ جب تک جدید قسم کے آلاتِ عمل و زراعت ایجاد نہیں ہوئے تھے ان لوگوں کو اپنے کار۔۔۔

[1] Saladin pp 22

[2] میری کہانی ج ۲ باب مذہب

کے لیے غلاموں کی محنت درکار تھی۔ سرمایہ ان کا ہوتا تھا اور محنت ان کی تھی۔ اور یہ لوگ اپنی سرمایہ دارانہ ذہنیت کے ماتحت ان سے سخت سے سخت کام لیتے تھے لیکن جب جدید آلات ایجاد ہو گئے جن سے مزدوروں پر اثر پڑا۔ تو غلام بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے۔ اب ان کے اخراجات اُن کے آقاؤں پر بار ثابت ہونے لگے۔ اور اُنھوں نے مجبور ہو کر ان کو آزاد کر دیا۔ اسی اقتصادی ضرورت کے پیشِ نظر انسدادِ غلامی کا قانون بنایا گیا۔ چنانچہ مسٹر جے ای۔ کیرنیس اپنی کتاب *The slave power* میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

شمالی ریاستوں نے کیوں غلامی کا خاتمہ کر دیا۔ درآنحالیکہ جنوبی ریاستوں میں اب تک غلامی کا رواج پایا جاتا ہے؟ اس کے جو وجوہ و اسباب بیان کیے جاتے ہیں کہا جاتا ہے وہ زیادہ وقیع نہیں ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں کہ سفید فام آدمی جنوب میں آب و ہوا کے باعث کام کرنے سے عاجز نہیں اور اس کے برخلاف افریقی شخص فطرۃً سست ہوتا ہے۔ اور وہ بحالت مجبوری ہی کام کر سکتا ہے۔ اصل سبب اقتصادی ہے جیسا کہ آزاد انسان کی محنت اور غلام کی محنت کے تقابل سے ظاہر ہوتا ہے۔ رواجِ غلامی کے ماتحت مالک کو پوری طاقت حاصل ہوتی ہے اور اپنے غلام کی محنتوں کا پھل بڑے مزے سے کھاتا ہے۔ وہ ایک مقصد کے لیے اور ایک خاص نقطۂ نظر کے ماتحت اپنے غلام کی محنت کو کام میں لاتا ہے، اور پھر شکایت بھی نہیں کر سکتا کہ اس میں مزید خرچ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب جبکہ طرح طرح کے سامان ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن میں خرچ کم اور منفعت زیادہ ہے تو پھر کیا ضرورت تھی کہ خواہ مخواہ غلامی کے رواج کو قائم رکھ کر

اخراجات بسا اوقات اپنے ذمہ عائد کیے جائیں

اس کے برخلاف اسلام نے انسداد غلامی کے سلسلہ میں جو کچھ کیا، اور کوئی شبہ نہیں کہ اس باب میں اُس کی تعلیمات بالکل انتہائی ہیں — وہ کسی اقتصادی یا معاشرتی مصلحت پر نہیں، بلکہ سرتاسر اخلاقی بنیاد پر قائم ہے اور اس تصور کے ماتحت ہے کہ انسان انسان سب برابر ہیں کسی ایک کو دوسرے پر مالکانہ تسلط و اقتدار قائم رکھنا درست نہیں ۔

ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا۔

ڈاکٹر توفیق صدقی نے بالکل سچ کہا ہے :-

مبلغین مسیحیت کہتے ہیں کہ ہم یورپ والے جو معاشرتی مدحات نافذ کرتے ہیں وہ سب ان کے مذہب میں سنت کے آثار باقیہ میں سے ہیں لیکن حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ یہ سب کچھ عقلی ترقی اور فکر و خرد کی بلندی کی وجہ سے ہے دین کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ ورنہ اس کی کیا وجہ ہے کہ صدیوں تک یہ لوگ بیہودہ برے طریقہ کے ساتھ لوگوں کو غلام بنائے رہے[2]

اور اسی بنا پر مسٹر سید امیر علی نے خوب کہا ہے۔

And it is simply an abuse of words to apply the word "Slavery" in the English sense, to any status known to the legislation

---

[1] Slavery in the Roman Empire P 231 [2] الاسلام و روح المدنیۃ ص ۴۰

of Islam.[1]

سید امیر علی کا مطلب یہ ہے کہ غلامی تو در اصل وہ ہے جو یورپ میں پائی جاتی ہے اسلام کے قانون میں کوئی غلامی نہیں ہے جس پر انگریزی اصطلاح کے مطابق "غلامی" کے لفظ کا اطلاق ہو سکے ۔ درحقیقت بھی یہی ہے ۔ اسلام نے آقا کے اختیارات اور اُن کے استعمال پر جو پابندیاں جا بجا عائد کی ہیں اُن کے پیشِ نظر غلامی کی تعریف اِرتقا، اسلام پر صادق ہی نہیں آسکتی ۔

مسٹر ۔ ہین گلبسن کہتے ہیں :۔

"غلامی کی عام پسندیدہ اور مقبول تعریف یہ ہے کہ وہ ایک ایسا سوشل رواج ہے جس میں ایک آدمی دوسرے کا ملک ہوتا ہے"۔

اس ملک کو ہر طرح سے استعمال کیا جا سکتا ہے اور غلام سے ہر قسم کی محنت و مزدوری کرائی جا سکتی ہے ۔ نیبور (Niebour) کہتا ہے :۔

"ملک (property) ایک طاقت ہے جو خواہ کتنی ہی نرم طریقہ پر استعمال کی جائے بہر حال اصولی طور پر وہ لامحدود ہوتی ہے"

پھر ایک موقع پر کہتا ہے "آقا کے اختیارات پر کسی طرح کی پابندی عائد کرنا غلامی کا کم کر دینا ہے، اصل غلامی نہیں ہے اور پھر ایک اور جگہ کہتا ہے "وہ شخص جو کسی دوسرے انسان کی تمام خدمات کا مستحق اور مالک سمجھا جائے وہ اس کا مالک (Owner) ہوتا ہے" اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں یہی مصنف اپنی کتاب Slavery as an industrial system میں

(1) Spirit of Islam p 260.

کہتا ہے:-

"اگر غلامی کی بنیاد کسی ایسے معاہدہ پر ہو جو جانبین میں کیا جائے، تو پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ غلام اور نوکر میں کیا فرق ہے؟"

اسی مفہوم کو دوسرے علماء نے اسی طرح بیان کیا ہے:-

غلام ایک انسان ہے جو کسی دوسرے کی ملکیت ہو۔ اور جس سے خاندان کے حدود سے باہر جبری محنت لی جا سکے

"A slave is a human being who is the property of another and subject to Compulsory labour, beyond the limits of the family"[1]

اب غلامی کی اس تعریف کو اور اس کے ان شرائط کو پیش نظر رکھو اور پھر یہ خیال کرو کہ اسلام نے کس طرح آقا کے اختیارات کی تحدید کی ہے۔ مثلاً یہ کہ آقا ضرورت اور غلام کی طاقت سے زیادہ اس سے کام نہیں لے سکتا۔ اور اگر وہ ایسا کرے اور غلام کو زد و کوب کرے تو اس کو حکم ہے کہ آزاد کر دے۔ کیونکہ اسی سے اس گناہ کا کفارہ ہو سکتا ہے۔ تو صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے

(1) Encyclopaedia of Religion and Ethics article 'Slavery'

پر اسلام نے غلامی کی بیخ کنی کو ... اپنے ذمہ لیا ... وہ درحقیقت غلامی نہیں۔ نیبور نے ... [illegible] ... اگر غلامی کی بنا دیانت سے معاہدہ پر قائم ہو تو وہ دراصل غلامی نہیں خدمتگاری ہے۔ اوراق گزشتہ میں ایک وہ حدیث گذر چکی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس شخص کو اس کا غلام مزاج کے موافق معلوم نہ ہو اس کو چاہیے کہ بیچ ڈالے ... [illegible] ... اسی دوسرے کو ... اس سے واضح ہوتا ہے کہ غلام اور آقا دونوں میں ایک طرح معاہدہ ہوتا ہے اگرچہ بالواسطہ نہیں۔ بلکہ خدمت کی طرف سے تابعیت ... [illegible] ... بت ارقی ہے اور آقا کو غلام سے تعلق ... [illegible] ... اس سے اس کی بہت طاقت سے زیادہ کام نہیں لیگا جو خود کھائیگا غلام کو بھی کھلائیگا۔ لباس کا خیال رکھیگا۔ اس پر تہمت تراشی نہیں کریگا ... [illegible] ... اس پر لعنت نہیں بھیجیگا۔ وغیرہ وغیرہ

یہ چند اس معاہدہ کی دفعات ہیں۔ ہر وہ شخص جو ان میں سے کسی ایک دفعہ کی خلاف ورزی کریگا۔ اس کو خدا کے حضور میں جوابدہ ہونا پڑیگا۔ اور اپنے گناہ کی پاداش اس کو بھگتنی پڑیگی۔

بتائیے! کیا نیبور (Niebuhr) کے قول کے مطابق اس غلامی کو واقعی غلامی کہا جا سکتا ہے؟

ایک دوسری جگہ بھی عیسائیت اور اسلام دونوں کا مقابلہ کرتے ہوئے امیر علی نے بالکل بجا کہا ہے:-

"وہ غلامی جو اسلام میں جائز ہے، درحقیقت اس غلامی کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں رکھتی

جو بات زمانۂ "مسیحیت" میں جائز رکھی جاتی رہی ہے۔ ورنہ اس کو اس غلامی کے ساتھ کوئی علاقہ ہے جو امریکہ میں ۱۸۶۵ء کی مقدس جنگ تک رہی [illegible]

علمبرداران مسیحیت غلاموں سے کیا سلوک کرتے تھے؟ اس کے متعلق غیروں کی نہیں بلکہ خود ان کے بھیدیوں کی گواہی شہادت ہے۔ [illegible] جو [illegible] بیان کرتا ہے:

" وہ امور جو عیسائیوں کے لیے انتہائی شرمناک ہیں ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ انھوں نے صرف [illegible] انگلستان [illegible] کیا [illegible] کہ یہ لوگ انسانوں کو ایک [illegible] بیچتے تھے اور غلام بناتے تھے"

[illegible] اس قدر تحریر کرتا ہے۔

" یہ سب [illegible] اس کے [illegible] ہوتے ہیں کہ [illegible] تمدن کے ملک میں جھگڑا کریں، اور مختلف قسم کے سخت و ناقابل برداشت ٹیکس [illegible] سے بڑی بڑی قیمتیں وصول کریں۔ یہ سفید فام لوگ ان [illegible] لوگوں [illegible] طرح [illegible] کو مارتے ہیں، عذاب دیتے ہیں، ان کے اموال کو لوٹتے ہیں، ان کی عورتوں کو اپنے لیے مباح سمجھتے ہیں، اور ان غریبوں کو غلام بنا لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ [illegible] کے رہنے والے اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں چلے جاتے ہیں [illegible]"

فونیہ کہتا ہے:-

" ولایات متحدہ میں عجیب و غریب قسم کے واقعات دیکھنے میں آتے ہیں جو [illegible] کے لیے [illegible]

---

(۱) [illegible] الاسلام و [illegible] ص ۱۴۰۔

(۲) Black man's burden.

قابل فخر نہیں ہوتے۔ یہاں کے حبشی سفید فام عورتوں کے ساتھ سخت محبت کرتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات اُن سے شہوت رانی بھی کر لیتے ہیں "ڈلنش" کا قانون ایسے لوگوں کے لیے حکم کرتا ہے کہ ان کو تارکول کے تیل سے لیپ دیا جائے۔ اور پھر شمع کی طرح انہیں جلا ڈالا جائے جس جانب میں یہ واقعہ ہوتا ہے وہاں کی حکومت حبش اس پر بہت خوش ہوتی ہے کہ مجرم کے جلنے کے وقت خود موجود رہے۔[1]

ان بیانات کے علاوہ شروع کتاب میں "غلامی اور مسیحیت" کے زیرِ عنوان اسی قسم کی کئی ایک شہادتیں گزر چکی ہیں۔ اس کے برخلاف اسلام کی تعلیمات ہیں کہ وہ سراسر اخلاقی و روحانی بنیاد پر قائم ہیں اُن میں کسی اقتصادی منفعت یا رجحان کو دخل نہیں۔ علمبرداران مسیحیت مسیحیت میں غلامی سے متعلق کیا شہادتیں دیتے ہیں۔ آپ پڑھ چکے۔

محققین یورپ کا اعتراف اب دیکھیے ہمارے غیر (محققین یورپ) اسلام میں غلاموں کے ساتھ حسن معاملہ کرنے کی کیا شہادتیں دیتے ہیں فان ڈنبرگ لکھتا ہے:-

اسلام میں غلاموں کے لیے بہتیرے قواعد رکھے گئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیرو کس قدر شریفانہ انسانی شعور و احساس رکھتے تھے۔ ان قواعد کا مطالعہ کرنے کے بعد تم دیکھو گے اسلام کی خوبیاں اُن تمام طریقوں کے مناقض ہیں جن کو ہمارے زمانہ تک بڑی بڑی مدعیان تہذیب و تمدن قومیں اختیار کرتی رہی ہیں۔ ہاں! اسلام نے غلامی کے اُس رواج کو فنا نہیں کیا جو تمام عالم میں پھیلا ہوا تھا۔ لیکن اُس نے غلام کی حالت بہتر بنانے کی بڑی کوشش کی ہے۔[2]

(1) Temperment et Caractere by Alfred Fouillee

(۲) تاریخ الاسلام السیاسی ج ۔

ایک نامور انگریز مصنف کہتا ہے:-

"مسلمان غلاموں کے ساتھ عموماً اچھا معاملہ ہوتا تھا الجیریا میں اور دوسری جگہوں میں بھی[1]"

مشہور انگریز سیاح ڈبلیو جی پلگریو کہتا ہے:-

"میں عرب میں کثرت سے حبشی غلاموں کے ساتھ ملتا رہا ہوں ان حبشی باندیوں کے ساتھ زنا شوئی کا تعلق رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ملے جلے قبیلوں اور قوموں کے آدمی بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ میں نے ہر جگہ غلاموں کی حالت بہت زیادہ ترقی کی طرف مائل دیکھی ہے، اور آزاد کرنے کا رواج بھی عام ہے۔ شہری آزادی پر نیا نیا قبضہ جمانے والے آزاد کردہ غلام جلد شادی کر لیتے ہیں۔ اگرچہ ایک آزاد کردہ حبشی غلام امراء و رؤسا کے طبقہ تک شروع شروع میں نہیں جا سکتا ورنہ کوئی عربی سردار اپنے غلام کو اپنی بیٹی نکاح میں دینا گوارا کر لیتا ہے۔ تاہم انگریزی اقوام میں رنگ و خون نے تمیز سے جو پابندیاں ان غلاموں پر عائد ہوتی ہیں یہ لوگ ان سے بالکل محفوظ و مامون ہیں"

پالگریو (Palgrave) کے تقریباً پچیس برس بعد Doughty نے غلاموں کی جو حالت دیکھی ہے اُس کی نسبت وہ کہتا ہے:-

"غلاموں کی حالت بسا اوقات خوشگوار ہوتی ہے اگر ان غلاموں کا آقا خدا کا خوف رکھتا ہے تو وہ انہیں آزاد کر دیگا اور پھر کبھی غلامی ہاتھ میں جانے دیگا۔

---

(1) The Sociology of Islam p 118

پول لکھتا ہے :۔

"انصاف کی رو سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی پیغمبرانہ حیثیت میں غلامی کے رواج کو جائز رکھا ہے۔ لیکن اُنہوں نے بڑے زور کے ساتھ اپنے پیروؤں کو غلاموں کے ساتھ نرمی کرنے اور اُن کا خیال رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اور جہاں تک ممکن تھا غلاموں کے معاملہ کو آسان اور آرام دہ بنا دیا ہے۔"

فالیری نے کہا ہے :۔

اسلام کے دشمنوں نے اس بات کا ارادہ کیا ہے کہ غلامی کے رواج کو باقی رکھنے کی بناء پر اسلام کو نشانۂ ملامت بنائیں لیکن مسلمانوں۔ دیہاتیوں اور شہریوں کے نزدیک غلاموں کے لیے جو مراعات ہیں وہ اُن مراعات سے بدرجہا زیادہ ہیں جو غلاموں کے لیے یورپ میں ہیں، اور انصاف یہ ہے کہ مشرق میں جو غلامی قائم ہے اُس کو تو اُس غلامی کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں جو امریکہ میں پائی جاتی ہے۔ جب ہم غلامی کے مسئلہ پر تاریخی نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ نے اس معاملہ میں بھی عجیب و غریب اصلاح فرمائی ہے"

اس کے بعد فالیری نے اُس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں آپ فرماتے ہیں:۔

"کوئی شخص اپنے غلام کو غلام اور باندی کہہ کر نہ پکارے"۔

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد فالیری نے اپنی تقریر کو اس پر ختم کیا ہے' اس سے بہتر انسانیت

Studies in Mohammadanism ۔ لہ

کونسی ہوسکتی ہے؟"[1]

موسیو گستاولیبان اپنی مشہور کتاب "تمدن عرب" میں لکھتا ہے:-

"غلامی کا لفظ جب اُس یورپین شخص کے سامنے بولا جاتا ہے جو امریکن ناولوں اور روایتوں کے پڑھنے کے عادی ہیں جن کا سلسلہ تیس سال سے جاری ہے تو اس کے ذہن میں فوراً تصور پیدا ہو جاتا ہے اُن غریبوں کا جو زنجیروں میں بندھے ہوئے ہوں اور اُن پر کوڑے برسائے جارہے ہوں اور پھر ان بیچاروں کو بقائے حیات کے لیے کافی غذا بھی نہ ملتی ہو، اور رہنے کے لیے انہیں تیرہ وتار کوٹھریاں نصیب ہوتی ہوں مجھ کو اس سے بحث نہیں کہ یورپ میں جو غلام ہیں اُن پر یہ تمام باتیں صادق آتی ہیں یا نہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام میں غلاموں کا جو تصور ہے وہ عیسویوں کے غلاموں کے تصور سے بالکل مختلف ہے"۔

دوٹی (Doughty) کا بیان اوپر گذر چکا ہے۔ ڈچ اسکالر اور سیاح Snouke Hurgronge جس نے مکہ معظمہ میں علماء اسلام کے ساتھ چھ مہینے گزارے تھے Doughty کے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"ان غلاموں کو کافی غذا دی جاتی ہے، کیونکہ سامان خورونوش بہت کافی ہے اور سستا ہے کپڑے اور خانہ داری کا سازوسامان اور تمام وہ چیزیں جو زندگی کو خوشگوار کرنے کے لئے ضروری ہیں ان کو بافراط ملتی ہیں۔ جب یہ لوگ آزاد کر دیے جاتے ہیں تو یہ سقائی کرتی

---

[1] بحوالہ الاسلام والحضارۃ العربیۃ۔ جزء اول ۵۵ دائرۃ المعارف الاسلامیہ فرید وجدی مضمون الاسترقاق"

ہیں۔ یا کوئی اور محنت و مزدوری کا کام کرتے ہیں بسا اوقات یہ آزاد کرنیوالے آقا اپنے آزاد کردہ غلاموں کی نگرانی کو پسند کرتے ہیں علی الخصوص جبکہ یہ شادی شدہ ہوں دوسرے افریقی غلام جو نسبتہً زیادہ اہل ہوتے ہیں گھروں میں ملازمت کر لیتے ہیں۔ یا دکانوں پر بحیثیت دکاندار کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ اچھے سوداگر چاہتے ہیں کہ اس طرح کے ملازموں سے اپنی دکانیں پُر کر لیں۔ یہ غلام ان تاجروں کے گھروں میں بڑے آرام اور راحت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی حیثیت گھروں میں ایک فیملی ممبر کی سی ہوتی ہے۔ جو زیادہ اچھے غلام ہوتے ہیں وہ اپنے آقاؤں کے معتمد مددگار رہوتے ہیں۔ اور برائے نام غلام کہلاتے ہیں۔

خانگی غلام عموماً بیس برس کی عمر میں آزاد کر دیے جاتے ہیں۔ کیونکہ خانگی غلام ہونے کے باعث اُن کو گھر کی مستورات (خواہ آزاد ہوں یا باندیاں) کے سامنے آنا جانا پڑتا ہے۔ بعض صاحب خانہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ وہ آزاد کردہ غلام کے لیے جب کبھی ممکن ہو ایک گھر کا انتظام کر دے۔

غلام کی فلاح و بہبود ہمیشہ اُن کے پیش نظر رہتی ہے۔ اور آزاد ہونے کے بعد بھی دونوں میں تعلقات قائم رہتے ہیں۔ آزاد ہونے کے بعد غلاموں کے لیے کسی عہدہ یا منصب کا دروازہ بند نہیں ہوتا۔ وہ آزاد ہو کر اصلاً آزاد لوگوں کے بالمقابل ہر قسم کے کاروبار زندگی میں نظر آتے ہیں۔ اور نتائج بتاتے ہیں کہ وہ اس مقابلہ میں کسی طرح بھی آزادوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ سب سے زیادہ با اثر شہری، گھروں اور دکانوں کے مالک وہی لوگ

ہیں جو پہلے غلام تھے اُن کی کالی کھال ترقی میں کوئی رُکاوٹ پیدا نہیں کرتی۔

حبشی عورتیں بالعموم گھروں میں کام کرتی ہیں۔ اور باورچی خانہ کے انتظامات بھی سنبھالتی ہیں حبشی مرد زیادہ ذہین اور سمجھدار خیال کیے جاتے ہیں۔ اُن کی تربیت اعلیٰ پیمانہ پر ہوتی ہے۔ اور اُس کے ہی مطابق اُن کی تعلیم ہوتی ہے۔ تجارتی کاروبار میں اُن کے ساتھ ملازموں کا سا معاملہ ہوتا ہے یا معتمدین کا سا۔[1]

مسٹر جوزف تھامپسن (Joseph Thompson) جو افریقہ کا ایک مشہور سیاح ہے "لنڈن ٹائمز" (London Times) مورخہ ۱۴ نومبر ۱۸۸۷ء کے نام ایک خط میں "مشرقی افریقہ میں غلامی" کے زیر عنوان لکھتا ہے:۔

"میں بے تامل یہ رائے رکھتا ہوں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مشرقی مرکزی افریقہ سے متعلق جتنا وسیع میرا تجربہ ہے آپ کے اخبار کے کسی اور نامہ نگار کا نہیں ہے کہ اگر یہاں غلاموں کی تجارت کا بازار گرم ہے، تو اُس کی وجہ ایک بڑی حد تک یہ ہے کہ ان علاقوں میں اسلام کا پروپگنڈا نہیں کیا گیا ہے۔ اور میرے پاس یقین کرنے کے قوی اسباب ہیں کہ اگر یہاں اسلام کو روشناس کرایا جاتا تو بردہ فروشی کا کبھی کا مکمل خاتمہ ہو چکا ہوتا۔

مسٹر باسورتھ اسمتھ لکھتے ہیں:۔

اب ہم دیکھنا یہ چاہتے ہیں کہ غلامی کی نسبت اسلام نے کیا کیا؟ اس میں بلاشبہ ترقی اور

(1) The Sociology of Islam p 121,

ثابت ہوئی۔ اس کی اصلاح اور ترقی عورتوں کی اصلاح و ترقی کی نسبت زیادہ قطعی تھی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے غلامی کو بالکل موقوف نہیں کیا کیونکہ اس وقت عربوں کی حالت ایسی تھی کہ نہ تو ایسا کرنا ممکن تھا اور نہ مناسب لیکن آپ نے لوگوں کو غلاموں کے آزاد کرنے کی ترغیب دی۔ آپ نے یہ اصول قرار دیا کہ جو قیدی اسلام قبول کرے وہ آزاد ہے۔ اس سے زیادہ قابل تعریف یہ بات کہ اگر آزاد شدہ عزت اور ایمانداری کی زندگی بسر کرتا ہے تو وہ ذلیل نہ سمجھا جائے۔ اور غلاموں کے بارہ میں آپ نے ہدایت کی کہ ان سے مہربانی اور نرمی کا برتاؤ کیا جائے۔ آپ نے اپنے خطبہ میں جو وفات سے ایک سال قبل دیا تھا۔ فرمایا کہ دیکھو غلاموں کو وہی کھانا کھلاؤ جو خود تم کھاتے ہو، اور ایسا ہی کپڑا پہناؤ جو خود تم پہنتے ہو، کیونکہ وہ بھی خدا کے بندے ہیں۔ ان کو کوئی کسی قسم کی ایذا نہ دینی چاہیے"۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:-

"ایک غلام جس کو قانوناً اور مذہباً اس طرح محفوظ رکھا گیا ہو زمانہ حال کے مفہوم غلامی کے اعتبار سے غلام نہیں کہلایا جا سکتا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ قرآن میں یہ لفظ کہیں نہیں آیا، بلکہ اس کے بالعوض جو جملہ "تمہارے دائیں ہاتھ کی ملک" ما ملکت ایمانکم استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی جائز اسیرانِ جنگ اور محروم الحریت اشخاص ہیں۔ ایسے غلام مسلمان ہونے کی صورت میں آزاد کر دیے جاتے تھے۔ اور اگر وہ اپنے مذہب پر قائم رہتے تب بھی وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس تعلیم کے

بموجب جو آپ نے اپنے پیرووں کو دی مسلمانوں کے بھائی خیال کیے جاتے تھے۔ آپ نے فرمایا "جو مالک اپنے غلاموں سے مہربانی کا برتاؤ کریگا وہ خدا کا برگزیدہ بندہ ہے، اور جو کوئی اپنی قوت کو بُری طرح استعمال کریگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا"

آنحضرتؐ سے کسی نے پوچھا "اگر کوئی نوکر مجھے ناخوش کرے تو مجھے کتنی مرتبہ اُسے معاف کر دینا چاہیے" آپؐ نے فرمایا "ستر بار" ہر نیم شائستہ قوم کے سردار کی طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قیدی عورتوں کو باندیاں بنانے کی اجازت دی ہے لیکن جو باندی اپنے مالک سے "ام ولد" ہو جاتی وہ نہ تو اپنی اولاد سے جدا کی جاتی تھی اور نہ دوبارہ فروخت ہو سکتی تھی بلکہ مالک کے انتقال پر آزاد ہو جاتی تھی۔ یہ ہمدردانہ شرائط حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن بہت سی باتوں میں یہ شرائط حضرت موسیٰ کی شریعت کے شرائط سے زیادہ قابل ترجیح ہیں اور ان میں اصلاح و ترقی کا خیال رکھا گیا ہے۔ بلکہ ایسی ہیں کہ یورپین، یا امریکن بردہ فروش سلطنت نے کبھی اپنے مجموعہ قوانین میں اس وقت تک درج نہیں کیں جب تک کہ تمام عیسائی ممالک سے غلامی بالکل موقوف نہیں کر دی گئی[1]

ڈاکٹر مارکس ڈاڈس بھی اپنے تعصب کے باوجود اس حقیقت کا اقرار کیے بغیر نہ رہا۔ "محمد (صلعم) بہت شفیق اور رحمدل شخص تھے۔ اور بے شبہ آپ کا یہ منشا تھا کہ غلاموں کی حالت میں اصلاح کریں۔ اگر آپ فی الفور غلاموں کی آزادی کا خیال کرتے تب بھی اُس کو عمل میں

(1) *Mohammad and Mohammadanism printed in London, 1876 pp 243-245*

لانا غالباً ناممکن ہوتا۔ لیکن آپ نے انما المومنون اخوۃ کا اعلان کرکے بتدریج اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے ایک ایسا یقینی ذریعہ سوچا جو آپ کے اختیار کے مطابق سب سے بہتر ذریعہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے موجودہ غلاموں سے نیک برتاؤ کی ہدایت فرمائی اس بارہ میں آپ کی آخری نصیحت ایسی اہم اور وقیع ہے کہ اُس سے قطع نظر نہیں ہو سکتی آپ نے فرمایا "اب رہے تمہارے غلام! تو دیکھو جو تم کھاتے ہو وہی ان کو کھلاؤ، جیسا کپڑا تم پہنتے ہو ویسا ہی اُن کو پہناؤ۔ اگر وہ کوئی ایسا قصور کریں جو تم معاف نہیں کر سکتے تو اُنہیں فروخت کر دو۔ کیونکہ وہ خدا کے بندے ہیں اور انہیں ایذا نہیں دینی چاہیے۔ لوگو! میری بات سنو اور اُسے خوب سمجھ لو کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں، تم سب مساوی ہو، اور تم سب ایک برادری ہو"۔ اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آپ کی تلقین کردہ انسانی مساوات کی عملی مثالیں تو بعض ممالک میں نظر آتی ہیں لیکن افسوس ہے کہ عیسائی ملکوں میں اس پر عمل نظر نہیں آتا۔ حضرت عمر اپنے اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے نکلتے ہیں، اور اُن کا غلام اونٹ پر سوار ہے پیغمبر اسلام کی جگر گوشہ حضرت فاطمہ اپنی باندیوں کے ساتھ ساتھ چکی پیستی نظر آتی ہیں۔ یہ وہ نمونے ہیں جن میں آپ کی تعلیم کی مکمل مثال ملتی ہے[1]

مسٹر ٹی ڈبلیو آرنلڈ اپنی مشہور کتاب دعوت اسلام (The preaching of Islam.) میں ہسپانیہ کے عیسائیوں میں اسلام کی اشاعت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ہسپانیہ کے یہ درماندہ غلام پہلے لوگ تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ ان غلاموں نے عرب

---

(1) Four lectures on natural and revalid religion.

کے آنے کو اپنے حق میں مبارک سمجھتے کیونکہ ان کی حکومت میں ان کی حالت مظلوموں کی تھی اور مسیحی دین کا علم ان میں ایسا اوپری تھا کہ اسلام لانے کی صورت میں جو آزادی اور فائدے ان کو میسر آتے تھے ان کے مقابلہ میں یہ علم کچھ وقعت نہ رکھتا تھا۔[1]

پھر پروفیسر موصوف نے باب ششم میں "یورپ کی عیسائی قوموں میں ترکوں کے ذریعہ سے اشاعتِ اسلام" پر بحث کرتے ہوئے بڑی صفائی کے ساتھ لکھا ہے:

"غرض اس قسم کے خیالات تھے جو ترکی سلطنت میں عیسائیوں کے دل پر بڑا اثر ڈالتے تھے اور خاص کر ان مصیبت زدہ عیسائی غلاموں پر ان خیالات کا اثر پڑتا تھا جو برسوں سے غلامی کی حالت میں مبتلا مایوسی کے ساتھ زندگی کاٹتے تھے اور جن کو غلامی سے آزاد ہونے اور اپنی تکلیفوں سے چھوٹنے کی امید باقی نہ رہی تھی۔ پس کیا تعجب ہے کہ کسی عیسائی غلام نے اپنے دل سے یہ پوچھا ہو کہ اگر خدا ایسے دین سے خوش ہوتا جس کا تو سہارا لیے ہوئے ہے تو وہ کبھی تجھ کو اس بے کسی کی حالت میں نہ چھوڑتا۔ بلکہ آزادی حاصل کرنے اور اپنے قدیم مذہب میں داخل رہنے کے لیے تیری مدد کرتا لیکن اب خدا نے آزادی کا راستہ تجھ پر بند کر دیا ہے۔ اب شاید خدا کی مرضی یہی ہے کہ تو اپنا دین و آئین چھوڑ دے اور مسلمان ہو کر نجات حاصل کر"

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"اسلامی شریعت میں جو قواعد غلامی کے تھے، اُنھوں نے غلامی کی شدید سختیاں دور کر دی

---

[1] دعوت اسلام باب پنجم ص ۱۴۸۔

تھیں۔ علاوہ اس کے ٹرکی میں غلاموں کے ساتھ وہ ظلم اور بے رحمیاں نہیں ہوتیں تھیں جو شمالی افریقہ کی قزاقی عملداریوں میں گزرا کرتی تھیں۔ ترکوں میں غلاموں کو مثل آزاد لوگوں کے حقوق حاصل تھے یہاں تک کہ غلام کے ساتھ اگر آقا نے سختی کی تو غلام اپنے آقا کے قاضی کو بلا سکتا تھا۔ یا اگر غلام نے شکایت کی کہ آقا کا اور اُس کا مزاج ایسا مختلف ہے کہ اُن دونوں کا ساتھ نبھ نہیں سکتا تو قاضی آقا کو مجبور کرتا تھا کہ غلام کو کسی اور شخص کے ہاتھ فروخت کر دے[1]

ایک اور عیسائی اہل قلم حد درجہ تعصب رکھنے کے باوجود اقرار کرتا ہے :۔

ترکوں کی تعریف میں یہ کہنا ضروری ہے کہ وہ اپنے غلاموں اور نوکروں کے ساتھ جن کی محنت سے وہ کسی قدر نفع اُٹھاتے ہیں، اچھا سلوک کرتے ہیں اور اکثر اوقات اُن کا برتاؤ عیسائیوں کے برتاؤ سے جو وہ اپنے غلاموں اور نوکروں کے ساتھ کرتے ہیں بہتر ہے مسلمانوں میں اگر کوئی غلام کسی طرح کا پیشہ سیکھ لیتا ہے تو اُس کو سوائے آزادی کے اور کسی بات کی ضرورت نہیں رہتی، سوائے آزادی کے اُس کو تمام ایسی چیزیں میسر ہوتی ہیں جن کی ایک آزاد آدمی کو ضرورت ہو سکتی ہے۔[2]

کان تکزی نوس نے عیسائی غلاموں کے آزاد ہو جانے کا زمانہ سات برس لکھا ہے وہ لکھتا ہے:۔

ترک اپنے غلاموں کا بہت اعتماد کرتے ہیں کیونکہ اُن کے پیغمبر نے اور احکام کے ساتھ یہ حکم بھی دیا تھا کہ غلام سات برس سے زیادہ غلامی کی حالت میں نہ رہیں، کوئی مسلمان ایسا

---

[1] دی پریچنگ آف اسلام ص ۱۹۴ [2] نون دن وریشن صفحہ ۱۳۲۔

نہیں جو اس حکم کا پابند نہ ہو۔

اسلام میں یہ حکم تو نہیں ہے کہ غلام کو سات برس کے بعد آزاد کر دیا جائے لیکن اسلامی تعلیمات کی وجہ سے مسلمان کثرت سے غلام آزاد کرتے تھے، یہاں تک کہ کسی غلام کی غلامی پر سات برس سے زیادہ مشکل سے ہی گذرتے ہونگے۔ اسی بناء پر غالباً کان تکزی نوس کو دھوکا ہوا ہے اور وہ یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ اسلام غلاموں کو ساتویں برس آزاد کر دینے کا حکم کرتا ہے۔ بہ حال اس مغالطہ سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا سلوک غلاموں کے ساتھ کیسا تھا۔

پھر اور آگے چل کر پروفیسر ڈبلیو۔ ٹی۔ آرنلڈ لکھتے ہیں۔

"بعض مورخوں کا خیال ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد غلام آزاد ہو جاتا ہے لیکن ایسا نہ تھا۔ اس لیے کہ آزادی کا دینا آقا کی مرضی پر موقوف تھا البتہ غلاموں کے مسلمان آقا اکثر اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ اگر ان کے غلام مسلمان ہو جائیں تو بعد روپیہ دیے۔۔ آزاد کر دیے جائینگے لیکن اگر عیسائی غلام اپنے تئیں خوب خدمت گزار ثابت کرتے تھے، تو ان کے مسلمان آقا ان کو آزاد کر دیتے تھے گو وہ عیسائی مذہب پر قائم رہتے ہوں اور ضعیفی کی عمر میں ان غلاموں کی گذر اوقات کے لیے آقا کوئی ساماں مہیا کر دیتے تھے"[2]

بعض اعتراضات اور اُن کے جوابات

اب ہم کو اُن چند اعتراضات کی طرف توجہ کرنی چاہیے جو غلامی کے سلسلہ میں عموماً عائد کیے جاتے ہیں

---

[1] دعوت اسلام ص ۱۹۵   [2] دعوت اسلام ص ۱۹۷

غلام اور حمیت

ان میں سب سے اہم اور بڑا اعتراض یہ ہے کہ غلام کو بالکل ایک شئے مملوکہ کی طرح سمجھا جاتا ہے یعنی جس طرح ایک شخص اپنے گھر اور کپڑوں اور کھانے پینے کی چیزوں کا مالک ہوتا ہے اور ان پر ہر طرح کا اختیار رکھتا ہے اُنہیں بیچ سکتا ہے، ہبہ کرسکتا ہے۔ کسی کے پاس رہن رکھ سکتا ہے، اسی طرح غلام کو بھی وہ بیع کرسکتا، ہبہ میں بخش سکتا اور دوسرے تصرفات عمل میں لاسکتا ہے تو کیا یہ انسانیت کی توہین نہیں ہے کہ ایک صاحبِ عقل وہوش انسان کو شئے مملوکہ کی طرح استعمال کیا جائے؟

یہ ہے اصل اعتراض کا خلاصہ! جواب یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم کو اصولی طور پر یہ تسلیم کرلینا چاہیے کہ جنگ اور صلح دونوں کی حالتیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس بنا پر ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، صلح اور امن کی حالت میں جو چیزیں انتہائی وحشت و بربریت کی دلیل سمجھی جاتی ہیں بحالتِ جنگ اُن کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ بعض مخصوص حالات میں واجب اور لازم قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جب تک دنیا میں خیر اور شر کا وجود توأم ہے، اور عالم میں امن وامان کو قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اور اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تب بھی جنگ میں (بشرطیکہ وہ جنگ زرگری کی نہیں بلکہ شر وفساد کے عناصر خبیثہ کو قلع قمع کردینے کے لیے ہو) جو تشدد برتا جاتا ہے قبیح نہیں بلکہ حسن ہے، قتل وخونریزی سے زیادہ ہولناک کیا چیز ہوسکتی ہے؟ لیکن معلوم ہے کہ جنگ میں اس کو کس طرح برداشت کرلیا جاتا ہے۔ بحالتِ صلح اگر کوئی کسی کو خطاءً بھی قتل کردے تو قصاص نہ سہی خوں بہا (دیت) دینا پڑتا ہے لیکن جنگ میں ایک شخص اپنی تلوار کو سیکڑوں

کے خون سے رنگین کرلیتا ہے اور اُس سے باز پرس تو کجا اُس کو بہادر کہا جاتا ہے، اور انعام و اکرام کے ذریعہ اُس کے فعل کی تحسین کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ہم کو یہ بات صاف طور پر کہہ دینی چاہیے کہ اسلام نے غلامی کو محض اس ضرورت سے مجبور ہو کر (وقتی طور پر) جائز رکھا ہے کہ اُس کا رواج قدیم ایام سے ہر ملک و قوم میں پایا جاتا تھا اور چونکہ یہ مسئلہ ایک بین الاقوامی مسئلہ تھا، اس لیے جب تک تمام قومیں متفق و متحد ہو کر اس رواج بد کے استیصال پر آمادہ نہ ہو جائیں اسلام خود قطعی طور پر اس کا قلع قمع نہیں کر سکتا تھا۔ اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ اسلام نے غلامی کو جس شکل و صورت میں باقی رکھا ہے، آیا یہ وہی بھیانک شکل و صورت ہے جس کے ساتھ وہ پہلے سے قائم تھی، یا اُس میں رد و بدل کر کے چند در چند ایسے نقش و نگار کا اضافہ کر دیا ہے جن کے باعث غلامی غلامی نہیں بلکہ ایک طرح کی برادری بن گئی ہے۔ پس اگر اسلام میں بھی غلام کے لیے بعض وہ احکام پائے جاتے ہیں جو پہلے سے غلاموں کے لیے دوسری قوموں میں موجود تھے تو ظاہر ہے۔ اسلام پر اس کا کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا کہ الشیٔ اذا ثبت ثبت بلوازمہ۔

غلام کا ملکیت میں داخل ہونا، اُس کی بیع و شراء کا جواز، اُس کا وراثت میں منتقل ہونا، باندیوں کے ساتھ تسری کرنا، یہ تمام چیزیں اسلام سے پہلے موجود تھیں۔ اسلام نے جس طرح غلام کی حیثیت کو بدلا اور اخلاقی اعتبار سے اُس کے مرتبہ کو بلند کیا، معاملات بالا سے متعلق بھی چند در چند اصلاحات کیں۔

اسلام سے پہلے غلام کو ایک ذی روح شئے مملوکہ کی طرح سمجھا جاتا تھا، یہاں تک کہ

آقا غلام کی زندگی اور موت کا بھی مالک ہوتا تھا، اگر وہ بے خطا بھی اُسے قتل کر دیتا تو اُس سے کوئی باز پرس نہیں ہوتی تھی لیکن اسلام نے غلام کو اس ملکیت محض سے نکال کر اُس میں اتنی تخفیف کر دی ہے کہ آقا کو غلام سے صرف انتفاع اور خدمت لینے کا حق ہے، اُس کی انسانیت یا جان پر آقا کو ملکیت حاصل نہیں ہے۔ یہ سب باتیں بوضاحت پہلے معلوم ہو چکی ہیں، یہاں صرف اس بات کا جواب دینا ہے کہ غلام کی بیع و شراء اور اُس کا ہبہ کرنا کیوں جائز رکھا گیا ہے۔

اصل یہ ہے بحیثیت غلام کے جو پہلی پابندی کسی شخص کے اوپر عائد کی جاسکتی ہے وہ ملکیت کی ہے، لیکن اس ملکیت سے مُراد یہ نہیں ہے کہ غلام انسانیت سے خارج کوئی چیز ہے۔ اور غیر ذی روح و عقل اشیاء کی طرح اُس کے ساتھ بھی معاملہ ہو سکتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر یہ سمجھیے کہ غلام کسی کی جائداد (Property) نہیں ہوتا، اور اُس کی مملوکیت اُس کی انسانیت کو فنا نہیں کرتی۔ علامہ ابن قیم تصریح کرتے ہیں۔

فَإِنَّ السَّيِّدَ حَقُّهُ فِي مَالِيَّةِ العَبدِ	آقا کا حق غلام کی مالیت میں ہے اس کی
لا فِي انسانِيَّتِهِ [1]	انسانیت میں نہیں۔

بلکہ مملوکیت سے غرض یہ ہے کہ غلام اپنے آقا کے بس اور اختیار میں ہوتا ہے۔ وہ اُن حدود سے باہر جو بحیثیت ایک انسان کے کسی شخص کے لیے مقرر کی جا سکتی ہیں، غلام سے خدمت اور محنت کے کام لے سکتا ہے اور اسی طرح وہ اپنے قبضہ سے نکال کر اُس کو کسی دوسرے انسان

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۳۵۱۔

کے قبضہ میں دے سکتا ہے۔ غلام اور دوسری اشیا کی مملوکیت میں جو فرق ہے وہ اس سے ظاہر ہوگا کہ ایک مالک کو اپنی شے مملوکہ پر ہر طرح کا اختیار اور حقِ تصرف ہوتا ہے۔ وہ جس طرح اس کو بیچ سکتا اور ہبہ کرسکتا ہے، ٹھیک اسی طرح اس کو ضائع اور ہلاک بھی کرسکتا ہے لیکن غلام کی مملوکیت کا حال یہ نہیں ہے۔ آقا اس سے کام لے سکتا ہے، محنت مزدوری کرا سکتا ہے، اپنے پاس سے جُدا کرکے بامعاوضہ (بیع کی صورت میں) یا بے معاوضہ (ہبہ کی صورت میں) کسی دوسرے کے تصرف میں دے سکتا ہے، لیکن وہ اس کو قتل نہیں کرسکتا، اس کو خصی بھی نہیں کرسکتا، یہاں تک کہ اس کے ناک کان بھی نہیں کاٹ سکتا۔ اور اگر وہ ایسا کریگا تو اس کو حاکم کے سامنے جوابدہی کرنی ہوگی۔ اس فرق سے صاف ظاہر ہے کہ غلام کی مملوکیت کا معاملہ بالکل دوسری اشیاءِ مملوکہ کا سا نہیں ہے کہ ہم اس کی وجہ سے غلام کو ایک جائداد (Property) کہہ دیں۔

اس میں شک نہیں کہ غلاموں اور باندیوں کو قرآن مجید اور بعض احادیث میں "مَا مَلَکَت ایمانُکُم" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن میرے خیال میں اس کا ترجمہ یہ ہے "کہ وہ جو تمہارے قبضہ میں ہیں" ایک حدیث میں ہے " املك عليك لسانك مطلب یہ ہے کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھو" اسی سے املاك کسی عورت کو کسی کے نکاح میں دینے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے[1]۔ عورت نکاح سے کسی کی ملک میں داخل نہیں ہوجاتی، بلکہ صرف ہوتا یہ ہے کہ شوہر کو اس سے تمتع کا حق حاصل ہوجاتا ہے، جس کو فقہ کی زبان میں مِلك بُضعَ کہتے ہیں پس اسی طرح غلام کو "رَقبہ" یا "ملک الیمین" کہتے ہیں کہ آقا اس پر چند قسم کے تصرفات رکھتا ہے۔

---

[1] نہایہ ابن اثیر ج ۴ ص ۱۱۴ و ۱۱۵۔

اب رہا اُس کی بیع وشراء کا معاملہ! تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ بیع وشرا بڑی حدتک غلام کے حق میں ہی مفید ہے۔ پہلے حدیث گذر چکی ہے کہ اگر کسی آقا کی طبیعت اپنے غلام کے ساتھ میل نہیں کھاتی ہے تو اُس کو چاہیے کہ غلام بیچ دے۔ بتائیے اگر غلام کی بیع جائز نہ ہوتی تو وہ غریب کس قدر عذاب میں رہنے پر مجبور رہتا۔ اب یہ تو ہوگا کہ وہ ایک بدخو یا ناموافق آقا سے جُدا ہو کر ایک دوسرے شخص کے پاس آجائیگا۔ ممکن ہے یہاں اُس کی طبیعت کے موافق آقا مل جائے اور دونوں کی زندگی چین سے بسر ہو جائے

اس میں شبہ نہیں ایک انسان کی خرید و فروخت نہایت قبیح فعل ہے لیکن جس طرح ابتدائی تمدن کی ضرورت کے باعث غلامی کو جائز کرلیا گیا ہے، غلام کی فلاح و بہبودی کی ہی خاطر اُس کے بیع وشرا کو بھی جائز مان لیا گیا ہے۔ اس کی مثال بالکل یہ ہے کہ طلاق کو "ابغض المباحات"[۱] فرمایا گیا لیکن اس کو محض اسی غرض سے مباح رکھا گیا ہے کہ اگر زن وشوہر میں مزاج کی موافقت نہ پائی جائے اور وہ دونوں امن وچین کے ساتھ معاشرت نہ کرسکیں تو طلاق کے ذریعہ ایک دوسرے سے مفارقت اختیار کرلیں، اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح طلاق کو ضرورت کی چیز ہونے کے باعث ضرورت تک ہی محدود رکھا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح غلام کی بیع وشرا بھی ناگزیر حالات میں ہی جائز ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غلاموں کی تجارت مذموم و قبیح سمجھی جاتی تھی۔

ایک مرتبہ چند آدمی حضرت معاویہ کے پاس آئے۔ آپ نے پوچھا "کیا کرتے ہو؟" بولے "غلاموں کی تجارت کرتے ہیں" حضرت معاویہ نے فرمایا۔

بئس التجارۃ ضمان نفسٍ ومؤونۃ ضرسٍ[۲] بُری تجارت ہے کیونکہ اس میں نفس کی کفالت کرنی پڑتی ہے اور محنت

---

[۱] جائز چیزوں میں سب سے زیادہ بُری چیز۔ [۲] عیون الاخبار ج ۱ ص ۲۵

عباسی دورِ خلافت میں غلاموں اور باندیوں کی تجارت کا رواج زیادہ ہو گیا تھا لیکن وہ لوگ بھی غلاموں کی تجارت کرنے والوں کے اعمال و افعال کی نگرانی کرتے تھے حکومت کی جانب سے ایک خاص عامل اسی کام پر مامور ہوتا تھا جس کو "قَیِّمُ الرَّقِیق" کہتے تھے[1]۔

مسٹر سید امیر علی لکھتے ہیں:۔

"غلام کو اٹھا کر لیجانا یا غلاموں کی تجارت کرنا جو مستحکم عیسائیت کے زیر سایہ پلا اور بڑھا اور جس کا حکم یہودی مذہب میں بھی ملتا ہے، اسلام میں نہایت درجہ قبیح اور مذموم فعل قرار دیے گئے ہیں اور جو شخص غلاموں کی تجارت کرتا ہے اس کو انسانیت سے خارج کر دیا گیا ہے[2]"

پھر آگے چلکر تحریر فرماتے ہیں۔

"خرید و فروخت کے ذریعہ غلامی اول چار خلفاء راشدین کے عہد میں قطعاً نا معلوم ہے کم از کم ایک بھی مستند دلیل اس امر کی نہیں ہے کہ خلفائے اربعہ کے عہد خلافت میں کوئی ایک غلام بھی خرید کر حاصل کیا گیا ہو۔ اولین خلفاء عباسیہ کے زمانہ میں شیعہ امام حضرت جعفر صادق رض نے غلامی کے خلاف بہت پُر اثر وعظ کہا[3]۔"

دوسرا اعتراض

دوسرا اعتراض اس بات پر ہے کہ غلام خود کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت اسلام کی رو سے جن لوگوں کا تکفل کسی دوسرے کے ذمہ ہوتا ہے اور تکفل بھی کسی خاص چیز کے لیے نہیں، بلکہ زندگی کی تمام ضرورتوں میں وہ خود کسی چیز میں مالکانہ تصرف نہیں کرسکتا

---

[1] اغانی ج ۲ ص ۲۷

(2) The Spirit of Islam p 265.

(3) " " " p 267.

بلکہ اُس کی جتنی بھی چیزیں ہوتی ہیں اُن پر تکفل ہی کا مالکانہ تصرف ہوتا ہے اولاد جب تک نابالغ ہوتی ہے اُن کا نان نفقہ والدین کے ذمہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر اُن کو اگر تحفۃً کوئی شے ملتی ہے، تو وہ والدین کے تصرف میں ہوتی ہے۔ مگر ہاں بالغ ہو جانے کے بعد اولاد کا تکفل والدین کے ذمہ نہیں ہوتا تو اُن میں مالکانہ تصرف کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی حال غلام کا ہے۔ آقا کو غلام کے تمام اخراجات کا تکفل کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے غلام کی ہر مملوکہ چیز مالک کی ملک میں داخل ہو گی لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ غلام میں کسی شے کے مالک ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ مولیٰ اگر غلام کو اپنی طرف سے معاملات کا مختار و وکیل بنا دے تو غلام بالکل ایک حر، عاقل و بالغ کی طرح تمام معاملات کو انجام دے سکتا ہے اور اُس کا عقد و معاملہ بالکل مولیٰ کا ہی معاملہ سمجھا جائیگا۔

تسرّی تیسرا اعتراض "تسری" پر ہے۔ معترضین کہتے ہیں یہ چیز کس قدر بدنما ہے کہ ایک عورت جو منکوحہ ہے، جنگ میں گرفتار ہو کر آتی ہے ایک شخص اُس کو باندی بنا لیتا ہے، اب اُس کا نکاح فسخ ہو جاتا ہے اور آقا اُس سے جہاں اور مختلف خدمات لے سکتا ہے، اُس کے ساتھ ہمبستری بھی کر سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں سطحی طور پر دیکھا جائے تو تسری ایک امر معیوب نظر آتا ہے لیکن اس حقیقت پر غور کیجیے کہ نکاح اصل میں ہے کیا؟ نکاح دراصل ایک معاہدہ ہے جو ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان ہوتا ہے۔ شریعت نے اس معاہدہ کی تکمیل کے لیے چند شرائط مقرر کر دی ہیں کہ اگر وہ ان شرائط کے ساتھ کیا جائے تو اُس کو معتبر مانا جاتا ہے اور اُس پر مختلف احکام

حلت تمتع، اولاد کے نسب کا ثبوت اور وراثت وغیرہ متفرع ہوتے ہیں۔ پھر یہ معاہدہ ناقابل انقطاع نہیں ہوتا۔ بلکہ مختلف اختیاری اور غیر اختیاری اسباب کے باعث ٹوٹ بھی جاتا ہے جس طرح طلاق سے یہ نکاح فسخ ہو جاتا ہے، اسی طرح تبدیل مذہب بھی اس کو باطل کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے یہ تمام چیزیں اعتبار شارع پر موقوف ہیں لیکن اس اعتبار کے لیے کوئی وجہ وجیہ ضرور ہونی چاہیے اصل بات یہ ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ زوجین ایک دوسرے کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے، یا ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ اُن کے ماتحت دونوں کی ازدواجی زندگی کامیاب نہیں ہو سکتی تو نکاح کا فسخ ہو جانا ہی بہتر ہو گا۔ طلاق پہلی شق کا مظاہرہ ہے۔ اور مذہب کا تبدیل کر دینا دوسری صورت میں داخل ہے۔ پس اسی طرح اگر شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس صورت میں کہ بیوی گرفتار کر لی گئی ہے۔ اور وہ دارالاسلام میں ہے، اور شوہر آزاد ہے اور دارالحرب میں رہتا ہے، نکاح کو باطل قرار دے دیا ہے تو ظاہر ہے ایک بڑی حکمت پر مبنی ہے جس طرح تبدیل مذہب کے بعد ازدواجی تعلقات بالعموم خوشگوار نہیں رہ سکتے موجودہ صورت میں بھی اُن کا برقرار رہنا اور نبھنا ایک امر دشوار ہے۔ یہ معاملہ کا صرف ایک رُخ ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ آقا جب اپنی باندی سے گھر کے تمام کاموں میں امداد لیگا اور ساتھ ہی اُس کے ساتھ ہمبستری بھی کریگا تو نفسیاتی طور پر باندی کی حیثیت بالکل ایک خادمہ اور اجنبیہ کی سی نہیں رہیگی بلکہ وہ اُس کے ساتھ یک گونہ انسیت و محبت محسوس کریگا۔ اور یہ احساس آقا اور باندی کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کا باعث ہو گا، پھر اگر اس باندی سے بچہ پیدا ہو گیا ہے تو یہ ام ولد ہو جائیگی اور آقا کی موت پر آزاد ہو جائیگی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ تسری کا جواز خود باندی کے حق میں مفید

اور کارآمد ہے کہ اس سے اُس کو آزادی کی ایک راہ ملتی ہے۔ اور وہ گھر میں قریب ربۃ البیت[1] کی حیثیت سے رہتی ہے۔ نکاح اور فسخ نکاح محض اعتبار شارع پر موقوف ہیں پس اگر کسی عورت کا جنگ میں گرفتار ہو جانا بمنزلہ طلاق اور کسی شخص کا اُس کو باندی بنا کر رکھنا بمنزلہ نکاح مان لیا گیا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح مطلقہ کے لیے عدت ہوتی ہے کہ جب تک گزر نہ جائے وہ کسی سے نکاح نہیں کر سکتی۔ ٹھیک اسی طرح جاریہ کے لیے حکم ہے کہ استبراء کے بغیر اُس کے ساتھ ہمبستری ممنوع ہے۔

تمتع کا تعلق بہت ہی نازک تعلق ہے۔ جانبین ایک دوسرے کا ہم کفو یا ہم مرتبہ ہونا چاہتے ہیں۔ اس بناء پر صحابہ کرام جو اسلام کی اصل اسپرٹ سے باخبر تھے جنگ کے موقع پر بھی اس کا خیال رکھتے تھے کہ اگر کسی اعلیٰ خاندان کی کوئی عورت جنگ میں گرفتار ہو کر آتی تھی تو اُسے یا تو نہایت عزت و احترام کے ساتھ اُس کے وطن ہی بھیج دیتے تھے، جیسا کہ حضرت عمرو بن العاص نے جنگ مصر میں بلبیس پر حملہ کیا اور شاہِ مصر مقوقس کی بیٹی جس کا نام ارمانوسہ تھا گرفتار ہو کر آئی تو اُنہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے حکم سے اُس کو بڑی عزت و احترام کے ساتھ مقوقس کے پاس بھیجدیا، اور مزید احتیاط کی غرض سے ایک سردار بھی اُس کے ہمراہ کر دیا کہ اس کو بحفاظت تمام پہنچا آئے[2]۔

اور یا اگر اُسے باندی بنا کر رکھتے تھے تو ہر کس و ناکس کو نہیں بلکہ وہ کسی ایسے ہی شخص کو سپرد کی جاتی تھی جو اُس کی طرح خاندانی اعتبار سے بڑا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ صحابہ کرام فارس سے آئے

---

[1] مالک خانہ۔ [2] ابن جریر طبری ص ۱۹۲۵۔

اُن کے ساتھ قیدیوں میں شاہِ ایران یزدگرد کی تین لڑکیاں بھی تھیں حضرتِ عمرؓ نے ان لڑکیوں کی خاندانی وجاہت کے پیشِ نظر ان کا معاملہ حضرت علیؓ کے سپرد کر دیا۔ حضرت علیؓ نے اُن میں سے ایک حضرت محمدؒ ابن ابی بکر کو دوسری اپنے صاحبزادے حضرت امام حسینؓ کو اور تیسری حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دے دیں کہ ان تینوں بزرگوں میں سے ہر ایک اپنے عہد کا بہت بڑا بزرگ اور خاندانی اعتبار سے بہت ہی معظم و مکرم تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں حضرت صفیہ اور حضرت جویریہ سردارانِ قبائل کی صاحبزادیاں تھیں۔ جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر کے اپنے حبالۂ عقد میں لے لیا، اور پھر اُن کی دلداری بھی آپ اس درجہ فرماتے تھے کہ ایک بار آپ نے حضرت صفیہ کو روتے ہوئے پایا۔ وجہ دریافت کی معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ اور حضرت زینب فرماتی ہیں "ہم تمام ازواج میں افضل ہیں۔ ہم کو زوجہ ہونے کے علاوہ آپ کی چچا زاد بہن ہونے کا بھی شرف حاصل ہے"۔ آپ نے ارشاد فرمایا "تو تم نے کیوں نہیں کہہ دیا کہ ہارون میرے باپ، موسیٰ میرے چچا، اور محمد میرے شوہر ہیں، پھر تم مجھ سے کس طرح افضل ہو سکتی ہو؟"

اِن سب کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں تسری کی اجازت کسی غرض فاسد اور شہوت رانی کے لیے نہیں ہے بلکہ چند در چند تمدنی اور معاشرتی مصالح پر مبنی ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے بنو اُمیہ کے اخیر دورِ حکومت اور خلفاء عباسیہ کی تمدنی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اُن پر یہ واضح ہو گا کہ ان جواری نے اسلامی تمدن کی تعمیر میں کتنا بڑا حصہ لیا ہے۔

چوتھا اعتراض | ایک اعتراض یہ ہے کہ جو قیدی جنگ میں گرفتار ہوتے ہیں اُن کی حیثیت شاہی

قیدیوں (State prisoners) کی ہوتی ہے۔ اس لیے اُن کا افراد مجاہدین میں تقسیم کر دینا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوتے ہیں تمدنِ جدید میں اُن کے ساتھ تین ہی قسم کا معاملہ ہوتا ہے۔ (۱) قتل کر دیے جائیں (۲) رہا کر دیے جائیں خواہ بے معاوضہ یا بامعاوضہ (۳) اُن کو قید کر کے رکھا جائے۔ ان میں سے دو صورتیں اسلام میں بھی ہیں جن کا ذکر شروع میں ہو چکا ہے۔ اب رہی تیسری صورت تو یہ غلامی کی صورت کے مقابل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اخلاقی اعتبار سے ان میں کونسی صورت زیادہ نفع بخش ثابت ہو سکتی ہے۔

ایسے قیدیوں کے لیے جمہوری سلطنتیں اور شخصی حکومتیں بلند چہار دیواری کے قید خانے بنواتی ہیں اور اُن سے سخت دشوار اور مشکل کام لیتی ہیں، یا کسی غیر آباد جزیرہ میں بھیج دیتی ہیں اور اُن کے کھانے کپڑے، رہنے سہنے کا تمام خرچ رعایا سے وصول کرتی ہیں۔ پھر جدید ٹیکس لگا کر خزانۂ عامہ سے روپیہ حاصل کرتی ہیں۔ اسلام میں قید خانہ کی رسم نہیں تھی۔ اب ان دونوں طریقوں میں مقابلہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ غلامی قید خانہ کے سسٹم سے بہتر ہے۔ قید میں رہ کر کوئی شخص اکتسابِ فضل و کمال نہیں کر سکتا۔ اگر اُس میں کوئی جوہر قابل ہوتا بھی ہے تو وہ فنا ہو جاتا ہے اور اُس کی تمام صلاحیتیں از کار رفتہ و بیکار ہو کے رہ جاتی ہیں۔ قید میں الگ تھلگ محنت و مشقت کی زندگی بسر کرنے کے باعث اُس کو فاتح قوم کی تہذیب و تمدن اور اُن کے اخلاق و کمالات سے متمتع ہونے کا موقع بھی نہیں ملتا اور اس بنا پر قیدی کی یہ زندگی سراسر محنت و مشقت اور مصیبت والم کی زندگی ہوتی ہے، بلکہ اخلاقی تربیت نہ ہونے کے باعث اس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ قیدی کے دل میں فاتح قوم کی طرف سے جو نفرت ہے وہ شدت کی صورت اختیار کر لے اور اُس کی

یہ اسیریٔ "ذوق گناہ" کی زیادتی کا سبب بنجائے۔ الغرض قید کے سسٹم میں بجز نقصان کے فائدہ کوئی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف غلامی کی صورت میں اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ کسی جدید ٹیکس کا اضافہ کرکے رعایا کو زیر بار کیا جائے، یا خزانۂ عامہ پر بوجھ ڈالا جائے۔ بلکہ غلام افرادِ مجاہدین پر تقسیم کردیے جاتے ہیں اور چونکہ وہ غلاموں سے خدمات کا فائدہ حاصل کرتے ہیں اس لیے غلاموں کا تکفل اُن کے لیے ناگوار بھی نہیں ہوتا۔

پھر اسلامی سوسائٹی میں رہنے سہنے کے سبب غلام کو اخلاقی تربیت اور دماغی نشوو نما کا کافی موقع ملتا ہے۔ اور اس طرح جو اپنے دشمن ہوتے ہیں اُن سے دوستوں کی ایک فائدہ مند جماعت تیار ہو جاتی ہے۔ گویا صنم خانہ سے کعبہ کے رہنما دستیاب ہو جاتے ہیں۔

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا!

یورپ کی اجتماعی غلامی

اسلام میں غلامی کی حقیقت واضح ہوگئی ہوگی اب نامناسب نہ ہوگا اگر اس مقام پر چند اشارے اس بات کی طرف بھی کردیے جائیں کہ اسلام پر اعتراض کرنے والوں کا خود اپنا حال کیا ہے؟ پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ اسلام میں اس بات کی سخت ممانعت ہے کہ بحالت امن غیر مسلموں کو زبردستی پکڑ پکڑ کے غلام بنایا جائے لیکن عیسائی قوموں کا حال ایک عرصہ تک یہ رہا ہے کہ جو اُن کے مذہب کا پیرو نہیں ہوتا تھا اُس کو جبراً غلام بنا کر بیچ دینا جائز سمجھتے تھے۔ عہدِ حاضر کا ایک مصنف لکھتا ہے:-

ایک عرصہ تک جرمن پادری غلاموں کی اُس تجارت میں حصہ لیتے تھے جو یہودی سوداگروں کے ہاتھ میں تھی ۱۴۵۲ء میں پوپ نکولس پنجم نے پرتگال کے بادشاہ کو اس امر کا حق دیدیا کہ وہ تمام مسلمانوں کو تباہ کر سکتا اور اُن کو غلام بنا کر فروخت کر سکتا ہے۔ اور یہ فتوے جواز صرف غریب مسلمانوں کے حق میں ہی نہیں بلکہ تمام دشمنانِ مسیحیت کے لیے تھا چنانچہ ۱۴۸۸ء میں ایک سو مورسینی مسلمان ہشتم پوپ معصوم کے پاس غلام بنا کر بھیجے گئے۔ اُن کا بھیجنے والا فرڈینینڈ تھا، اور ان غریبوں کو امراء کے طبقہ میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔

ان کے علاوہ وہ بپتسمہ لیے ہوئے یہودی جو غیر مرتدین (اصل یہودیوں) کے ساتھ تعلقات رکھتے تھے اُن کو غلامی کا سزاوار سمجھا جاتا تھا، ان کے ہاں غلامی متعدد جرائم کی سزا بھی تھی مثلاً سازش کرنا، دھوکہ دہی غیب گوئی، چوری کرنا اور مال مسروقہ کا برآمد نہ کر سکنا۔ اور صلیبی جنگوں کے زمانہ میں مسلمانوں کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنا[1]۔

عیسائی مصنفین مسلمانوں کے مزعومہ مظالم کی داستانیں بڑی رنگیں بیانی سے لکھتے ہیں۔ لیکن اُنہیں کچھ خبر ہے خود اُن کا ایک منصف مزاج مصنف ڈبلیو، ٹی، آرنلڈ عیسائیوں کے مظالم کی نسبت کس قدر واضح شہادت دیتا ہے۔ موصوف رقمطراز ہیں :-

"ادیا کے مسلمان علاوہ خراج کے ہر سال ایک بن بیاہی جوان عورت بھیجتے تھے، جو عیسائی کرلی جاتی تھی، یہ رسم ایک قدیم عہدنامہ کے بموجب جاری تھی۔ اور بادشاہ نے ہمیشہ خیال رکھا کیونکہ بادشاہ ان سے زبردست تھا، علاوہ ازیں مسلمانوں کو ہتھیار رکھنے

(1) Islam in the world. p 32.

اور لباس جنگ پہننے کی ممانعت تھی۔ اور حکم تھا کہ اگر گھوڑوں پر سوار ہوں تو زین نہ لگائیں، مسلمان کہتے تھے کہ ہم نے ان احکام کی ہمیشہ پابندی کی ہے تاکہ بادشاہ ہم کو قتل نہ کرے اور ہماری مسجدوں کو نہ جلائے۔ ہر برس حبشہ کا بادشاہ جوان عورت کے لیے اپنے آدمی بھیجتا ہے۔ ہم اس عورت کو لیجاتے ہیں، اور غسل دیتے ہیں اور بستر پر لٹا کر اس کو چادر سے ڈھک دیتے ہیں، تب ہم دعائیں پڑھتے ہوئے جو میت کے لیے ہوتی ہیں اس عورت کو گھر کے دروازہ تک لیجاتے ہیں اور پھر بادشاہ کے آدمیوں کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ اور یہی کیا ہمارے آبا نے اور ہمارے اجداد نے ہم سے پہلے۔[1]

بتائیے! کیا تاریخ اسلام کے کسی گمنام گوشہ میں بھی اس طرح کی سفاکی اور انسانیت فروشی کی کوئی ایسی ہولناک مثال مل سکتی ہے؟

پھر آگے چل کر تحریر کرتے ہیں:۔

"بادشاہ یحییٰ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ۱۸۸۰ء میں اس نے پچاس ہزار مسلمانوں کو، اور بت پرستوں میں سے ایک قوم کے بیس ہزار آدمیوں کو اور گالا کی قوم میں سے پانچ لاکھ لوگوں کو اصطباغ دیا۔"[2]

یہی فاضل مصنف ایک اور مقام پر رقمطراز ہے:۔

"طلیطلہ کی چھٹی مجلس نے قانون وضع کیا تھا کہ کل شاہانِ ہسپانیہ اس بات پر حلف لیا کرینگے کہ جاثلیقی مذہب کے سوا کسی دین کی پیروی ملک میں جائز نہیں ہوگی۔

---

[1] ترطینی صفحہ ۱۲۷ بحوالہ دی پریچنگ آف اسلام ص ۱۳۱ [2] دی پریچنگ آف اسلام اردو ترجمہ ص ۱۳۶

اور تمام فریقانِ منحرف کے خلاف سختی سے قانون جاری کیا جائیگا۔ اس کے بعد دوسرا قانون وضع ہوا اور وہ یہ تھا کہ کوئی شخص جو رسولی کلیسا یا انجیلی قواعد یا آبا کی توہین یا کلیسا کے فتاوی اور مقدس سکرمنٹ (معاہدہ) کو معرض بحث میں لائیگا اس کی جائداد ضبط ہوگی اور اسے حبس دوام کی سزا ملیگی۔

الفریڈ فولیہ (Alfred Fouillee) لکھتا ہے

"سنہ ۱۹۰۰ء امریکہ میں ایسے وحشت انگیز مناظر دیکھنے میں آتے ہیں جو کسی امریکی کے لیے باعث فخر نہیں ہو سکتے۔ ان کے ہاں ایک قانون تھا جس کو "لنش" کہتے ہیں اس کی رو سے اگر کوئی سیاہ فام آدمی کسی سفید فام عورت سے اختلاط کر لیتا، تو اس غریب کو تارکول سے لیپ دیا جاتا، اور پھر اس کو اس طرح جلایا جاتا جس طرح کہ چراغ جلاتے ہیں، اور لطف یہ ہے کہ افریقی حکومت کو مجبور کیا جاتا کہ وہ اس موقع پر اپنا کوئی نمائندہ بھیجے[1]"

اس کے علاوہ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں ایسا کونسا ظلم تھا جو عیسائیوں نے اپنے مخالفین پر نہیں کیا، تاریخ کے صفحات اب تک ان کے ذکر سے خونچکاں ہیں۔ پھر مسلمانوں کے ساتھ عیسائیوں کا یہ معاملہ تو اُس زمانہ کا ہے جبکہ اُن کے ہاں غلامی عملاً موجود تھی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں غلامی کا خاتمہ قانونی طور پر کر دیا گیا تھا۔ لیکن جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے یہ تحریک قطعاً اقتصادی مصالح پر مبنی تھی۔ انسانی فلاح و بہبود کے خیال، اور عام مساواتِ انسانی کے

(1) Temperament et caractere.

جذبہ پرنہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چند درچند بختیوں کے باوجود یورپ کے بعض علاقوں میں اب بھی غلامی کا وجود پایا جاتا ہے بلکہ انگلستان ایسے متمدن ملک میں زن فروشی کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں

زن فروشی انگلستان میں | ڈاکٹر کلوڈ سیل برٹن، روزنامہ ٹائمز لندن کے اڈیٹر کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں :-

"آپ کے اخبار کے پچھلے نمبر میں جو اقتباس بیوی کی فروخت سے متعلق سو سال قبل کے ٹائمز سے نقل ہوا ہے اس نے مجھ کو جارج ڈیبنی کریبن کی بیان کی ہوئی روایت یاد دلا دی جو اپنے بچپن میں وہ ایک بار اپنے چچا کے ساتھ نارفوک کی سڑک پر جا رہے تھے سڑک کے کنارے انہیں ایک کاشتکار کھڑا ہوا ملا، اس کے ساتھ ایک عورت تھی جس کے گلے میں رسی اس طرح پڑی ہوئی تھی کہ گویا وہ بکری کا جانور ہے۔ اس عورت کو وہ راہگیروں کے ہاتھ ۱۰ شلنگ میں بیچ رہا تھا، چنانچہ ایک دوسرے کاشتکار نے اس کو خرید لیا۔ اپنے اس راوی کی عمر کا اندازہ کر کے کہتا ہوں کہ یہ واقعہ ۱۸۲۲ء سے بہت بعد کا کوئی ۱۸۴۳ء کا ہے"[1]

مسٹر جے بیلی لکھتے ہیں :-

"مجھ کو یاد پڑتا ہے آج سے چالیس سال قبل کے روزناموں میں یہ واقعہ چھپا تھا کہ گرینڈ جنکشن کنال کے ایک ملاح نے اپنی بیوی کو ایک دوسرے ملاح کے ہاتھ چار پنس کی قیمت میں فروخت کر ڈالا تھا، اور پھر اس کا مقدمہ بھی چلا تھا"[2]

---

(1) Daily Times of London 5 may 1932.

(2) ,, ,, ,, ,, ,, ,,

مسٹر لو وانسن لکھتے ہیں:-

"۱۹۱۲ء کے موسم گرما میں میں ڈربی اور آئیشام کے درمیان اپنی موٹر سائیکل کی مرمت کے لیے اُترا۔ پاس ہی خانہ بدوشوں کا ایک ڈیرہ تھا۔ میں مرمت کر ہی رہا تھا کہ ایک مرد اور ایک عورت کچھ ٹوکریاں لیے ہوئے آئے۔ مرد نے کہا "ایک ٹوکری خرید لو" میں نے انکار کیا۔ بعدازاں اُس نے ایک چھڑی بیچنی چاہی، جب اُس سے بھی میں نے انکار کیا تو دو شلنگ کے معاوضہ میں اپنا کتا دینا چاہا، آخر میں اُس نے چلا کر کہا "اور کچھ نہیں لیتے ہو تو لو ڈھائی شلنگ میں اپنی عورت کو بیچتا ہوں"[1]۔

سیاسی محکومیت اور غلامی	پھر یہ دیکھو کہ جن لوگوں نے قانون کے زور سے غلامی کا انسداد کرایا، اُنہوں نے آج کس طرح دوسری قوموں کو اپنی سیاسی غلامی کے شکنجہ میں جکڑ بند کر رکھا ہے

اُن کا اپنی محکوم قوموں کے ساتھ انتہائی مستحقرانہ برتاؤ، رنگ و نسل کے فرق و امتیاز کی بنا پر بنی نوع انسان کے ایک کثیر طبقہ کو اپنے برابر مدنی و شہری حقوق کا اہل نہ سمجھنا، سوشل معاملات میں اُن کے ساتھ مساویانہ حیثیت سے پیش نہ آنا، طرح طرح کے قوانین کی مدد سے ان کے اعمال و افعال پر تکلیف دہ پہرے بٹھا دینا، عہدوں اور ملازمتوں کے استحقاق میں کالے اور گورے کا فرق کرنا، محکوم و مفتوح اقوام سے بیش از بیش محنت لینا اور کم سے کم انہیں معاوضہ دینا، اور خود اُنہی غریبوں کی خون پسینہ کی پیدا کی ہوئی دولت سے عیاشی اور تن پروری کرنا یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ ان لوگوں کا دماغ اب بھی غلام بنانے (استعباد و استعمار) کے

(1) *Daily Times of London, 9 May 1932.*

رکیک جذبات سے خالی نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے ایک شخص ایک شخص کی غلامی کرتا تھا۔ اب ایک خاص قوم ہے جو مختلف اقوامِ عالم کو اپنی غلامی میں سمیٹ لینا چاہتی ہے اور اس کا معاملہ ان جماعتی غلاموں کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ بُرا ہے جو پہلے ایک شخص اپنے کسی ایک غلام کے ساتھ کرتا تھا۔ اس بنا پر ٹالسٹائی نے کہا ہے:۔

ٹالسٹائی کی شہادت | ہمارے زمانہ میں وطنیت کا جذبہ ایک بالکل غیر طبعی اور نادرست جذبہ ہے اور یہی دراصل ہمارے ان بہتیرے امراض اجتماعی کا سبب ہے جن سے نوع بشری نقاں سنج ہے، اور یہ عجیب و غریب بات ہے کہ یہ وطنیت انسان کو ہلاک کر دینے والی لڑائیوں اور عام اسلحہ بندی کا سبب سمجھی جاتی ہے۔ یورپ میں انیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں عام فوجی قانون کے باعث جس قسم کی غلامی کا ظہور ہوا در حقیقت وہ تو پہلے زمانہ کی شرمناک غلامی سے بھی کہیں زیادہ ہولناک اور تباہ کن ہے"۔

اس کے بعد ٹالسٹائی ان حکومتوں کی مذمت کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"ان حکومتوں کی سنگدلی اور بدطینتی یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ انہوں نے نفسانی خواہشات اور ملک گیری کے رکیک جذبات سے پُر ہو کر ممالک ایشیا، افریقہ، اور امریکہ کو آپس میں تقسیم کر لینے کے مسئلہ میں مختلف ہو کر باہمی جنگ و جدل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اقوام مستوحہ اگر پامال ہوتی ہیں تو ہوں انہیں اس کی کوئی پروا نہیں ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ یہ لوگ اپنے مقاصد بد کی تکمیل کے لیے ہر قسم کے غدر، فریب اور کذب و دروغ سے بھی باز نہیں آتے۔ (Social evils and its remedies)

اسلامی حکمت عملی | مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے۔ انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں غیر مسلموں کو دربار میں اعلیٰ مراتب دیئے، ملک میں بڑے بڑے عہدے اور مناصب عطا کیے۔ ملک و وطن اور رنگ و نسل کے امتیاز کو انہوں نے کبھی کوئی وقعت نہیں دی یہ نتیجہ تھا ان کی مذہبی تعلیماتِ اخوت و برادری کا جو ان کو وسیع حوصلہ اور وسیع النظر بناتی تھیں ان کے اس طرزِ عمل سے اسلام کی اس اسپرٹ معلوم ہوتی ہے کہ وہ بنی نوعِ انسان کا کتنا ہمدرد اور بہی خواہ ہے یہی وجہ ہے مسلمانوں نے جس کسی ملک کو فتح کیا وہاں کے باشندوں نے ان کا بڑے تپاک سے خیرمقدم کیا۔ محمد بن قاسم جس نے سندھ کی حکومت کو تاراج کر کے رکھ دیا۔ ہندوستان سے رخصت ہوا تو ہندوستان کے لوگوں کو اس کا سخت رنج ہوا۔ اور رو کر انہوں نے اپنے دلی غم کا اظہار کیا۔ اور مقام کیرج میں اس کا تمثال بنا کر رکھا[۱] مسلمانوں کی حسن نیت و عمل کا ہی یہ ثمرہ تھا کہ وہ جس کسی ملک میں گئے اس کی دولت و ثروت میں اضافہ ہو گیا علم و ہنر کا چرچا عام ہو گیا اور تہذیب و شائستگی پھیل گئی۔ اس کے برخلاف یوروپین اقوام کا معاملہ غیر قوموں کے ساتھ کیسا رہا ہے۔ اس سب کی تفصیل تو بہت طویل ہوگی۔ ہم مختصراً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آج برطانوی حکمت عملی کی وجہ سے ہندوستان جس دورِ غلامی سے گذر رہا ہے کیا وہ اجتماعی غلامی کی ایک نہایت ناپاک مثال نہیں ہے؟

برطانوی حکمت عملی | کسی ہندوستانی نے نہیں خود ایک انگریز سر تھومس ٹرٹن نے ۱۸۱۳ء میں دار العوام میں ہندوستان کی برطانوی حکمت عملی سے متعلق کہا تھا:-

[۱] فتوح البلدان باب فتوح السندھ

"ہندوستانیوں کو فائدہ کیا دو گے؟ تم نے ان لوگوں کے ملک کو خراب، ان کے انسانوں کو برباد کر دیا، ان کے شہزادوں کو قتل کیا، بے شک یہی ذاتی مفاد ہے جس نے تم نے لوگوں کو دھوکہ، دغا اور جہالت میں مبتلا کر دیا۔"

انگریزوں کی ذہنیت انگریز کی ذہنیت سراسر مستبدانہ ہے، وہ غیر قوم پر حکومت کرتا ہے تو اس کو فائدہ پہنچانے کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے ملک کو مرفہ الحال کرنے کے لیے۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ مفتوحہ اقوام کی تخریب کر کے خود اپنے لیے تعمیر کا سامان کرے۔ ایک انگریز ایلکنس سمیڈ صاف لفظوں میں اعتراف کرتا ہے۔

"جب کوئی قوم یا ملک غلام بنایا جاتا ہے، تو فاتح سب سے پہلے یہ کام کرتا ہے کہ تعلیم کو تباہ کر دیتا ہے۔۔ بہت بری طرح سے انتظام کرتا ہے کیونکہ علم اور غلامی ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے۔"

ڈیوک آف ڈیون شائر اسی نظریہ کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"یہ غیر دانشمندانہ فعل ہے کہ ہندوستان کے لوگ زیور علم سے آراستہ ہوں، جدید تہذیب، جدید ترقی، جدید علوم سے انہیں سیراب کیا جائے اور پھر ان سے یہ بھی کہا جائے کہ ملکی معاملات میں حصہ لینے کی بجائے اس وقت تک انہیں کبھی موقع نہیں ملے گا کہ وہ پہلے اپنے یورپین حکمرانوں سے چھٹکارا حاصل کریں۔"

مسٹر ولیم ڈگبی پراسپرس انڈیا میں میجر جنرل اسمتھ کے سی بی کی شہادت درج کرتے ہیں جس سے ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق حکومت کا تخیل نمایاں ہو جائیگا۔

سوال ۱۶۳ ۔ کیا آپ کسی طرح اس کی روک کر سکتے ہیں کہ دیسیوں کو ان کی طاقت کا علم ہو؟

جواب ۔ میرے خیال میں انسانی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ معدودے چند غیر ملکی کروڑ آبادی کے ملک پر حکمرانی کر سکیں۔ جسے آج کل رائے کی بادشاہت کہتے ہیں اس لیے جونہی وہ تعلیم یافتہ ہو جائینگے تو تعلیم کے اثر سے ان کے قومی اور مذہبی تفرقے دور ہو جائینگے جس کے ذریعہ سے ہم نے اب تک اس ملک کو اپنے قبضہ میں رکھا ہے یعنی مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف کرنا، اور علی ہذا القیاس تعلیم کا یہ اثر ضرور ہوگا کہ ان کے دل بڑھ جائینگے اور انہیں اپنی طاقت سے آگاہی ہو جائیگی۔

آنریبل مسٹر الفنسٹن اور ایف وارڈن نے ۱۸۱۳ء و ۱۸۲۸ء میں مسئلہ تعلیم پر ایک یادداشت مرتب کی تھی۔ اس میں انہوں نے اُس نقصان عظیم کو تسلیم کیا ہے جو ہندوستان کو انگریزوں کی استعماری پالیسی سے پہنچا وہ لکھتے ہیں۔

"ہم نے ہندوستانیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیے، اور ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اُس سے نہ صرف یہ کہ تعلیمی ترغیب نہیں ہوئی بلکہ اُس سے قوم کا علم سلب ہوا جاتا ہے۔ اور علم کے پچھلے ذخیرے نیست و نابود ہو رہے ہیں۔ اس الزام کو رفع کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے۔"

چنانچہ ہندوستان کی انگریز حاکموں کے ہاتھ اس عام تباہی و بربادی کو دیکھ کر سر ڈی ہملٹن نے کہا۔

"اگر کبھی انگریزوں کو ہندوستان اسی طرح چھوڑنا پڑا جس طرح رومن نے انگلستان کو چھوڑا تھا، تو وہ ایک ایسا ملک چھوڑ جائینگے جس میں نہ تعلیم ہوگی نہ حفظانِ صحت کا سامان ہوگا اور نہ دولت ہی ہوگی"۔

ڈاکٹر جے۔ ٹی سوئزرلینڈ لکھتا ہے:-

"ہندوستان میں جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ اس کی ذمہ داری بلا شبہ انگریزوں کے سر ہے۔ چند ادنیٰ ترین فرقوں کے علاوہ سب علم کے خواہاں ہیں اور حصولِ علم کی سچی آرزو رکھتے ہیں۔ ہندوستانی رہنما پچاس سال سے تعلیم، تعلیم پکار رہے ہیں، لیکن یہ چیخ و پکار اور مطالبہ بے سود ثابت ہوتا ہے۔ انگریزوں کو غیر ضروری پنشن دینے اور اس سے بدتر سلطنت کی خاطر غیر ضروری فوجی اور دیگر مدات پر کثیر رقمیں صرف کرنے کے بجائے اگر یہ روپیہ ہندوستانیوں کے مفاد پر صرف کیا جائے، تو ہندوستانیوں میں عام تعلیم کو جاری کرنے کے لیے روپیہ وافر ہے"

شروع شروع میں تو انگریز ہندوستانیوں کے لیے تعلیم کے مواقع بہم پہنچانے میں دریغ ہی کرتے رہے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ لوگ روشن دماغ ہو کر اپنی سیاسی طاقت سے باخبر ہوجائینگے، اور اپنے حقوق کا مطالبہ شروع کر دینگے لیکن بعض مدبرین برطانیہ نے اس طرف توجہ دلائی کہ ہندوستان کو پائدار اور مضبوط غلامی کے شکنجہ میں کسنے کے لیے تعلیم سے محروم رکھنے کی پالیسی غلط ہے۔ اس کے برعکس اُن کو تعلیم دلانی چاہیے، مگر ہندوستانیوں کے اپنے علوم و فنون اور اُن کی زبانوں کی نہیں بلکہ خود زبانِ انگریزی کی، یہاں تک کہ دفتری زبان

بھی فارسی اور اُردو کی بجائے انگریزی ہی ہونی چاہیے ۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا! خود اُن کے الفاظ میں سُنیے۔ کرنل گوڈمین جو پنجاب کے انسپکٹر آف اسکولز تھے ۱۸۸۲ء میں لکھتے ہیں:۔

حکومت برطانیہ نے ہندستان میں اسکول صرف اس لیے کھولے ہیں کہ عوام الناس میں وفاداری کا جذبہ ہو، اور حکومت کی بنیاد مضبوط رہے۔

لارڈ مکالے ۱۸۳۵ء کے مراسلہ میں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی تعلیمی حکمت عملی کے متعلق لکھا گیا ہے، لکھتے ہیں۔

"تعلیم یافتہ ہندوستانی ذوق طبع، رنگ، اخلاق اور خیالات میں بالکل انگریزوں کے رنگ میں رنگے جائینگے۔ اس طرح ہندوستان اور انگلستان کا تعلق ہمیشہ کے واسطے مستحکم اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائیگا۔

اس خواب کی تعبیر بھی جلد ہی مل گئی۔ اور زعماء انگلستان نے اس کا صاف لفظوں میں اعتراف کیا کہ ہماری موجودہ تعلیمی حکمتِ عملی سے ہندوستان بڑی مدت تک کے لیے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے۔ اور اب ہم اطمینان کے ساتھ ان پر حکومت کر سکتے ہیں چنانچہ مسٹر ہنٹر نے کہا:۔

"ملک کے ساتھ دماغ بھی فتح کر لیا گیا ہے"۔

کاؤنٹ اوٹومین کہتا ہے۔

"ہندوستان کے دماغ اور ذہانت کے متعلق کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن یہ تعجب ہے کہ کس طرح مغربی تعلیم کے طریقہ نے ان کو خراب کیا۔ اور اُن کی روایتی ذہانت و فراست کو

بالکل مفلوج کردیا۔

میکولے نے انگریز حاکموں کی ذہنیت کا راز اس طرح فاش کیا:۔

ہم لوگ ہندوستان کے ایک طبقہ کو ضرور ایسا بنانے کی کوشش کرینگے کہ خون اور رنگ میں تو وہ ہندوستانی ہو لیکن کیفیت، خیال اور ذہنیت میں بالکل انگریز جیسا ہو، اگرچہ کہنے کو ہندوستان میں یونیورسٹی، کالج، اسکول موجود ہیں لیکن پھر بھی ۹۵ فیصدی ہندوستانی جاہل ہیں۔ موجودہ انگریزی تعلیم میں اس قدر خرچ ہے کہ نہ بار کیا اوسط درجہ کے لوگ بھی صیغہ تعلیمات کے اخراجات کو برداشت نہیں کرسکتے لیکن جو تعلیم حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتے اور خرچ کو برداشت کرکے اسکول یا کالج میں داخل بھی ہوتے ہیں تو یونیورسٹی کی مہربانی ان لوگوں کے ساتھ یہ ہوتی ہے کہ آدھے سے زیادہ لڑکوں کو ناکام کردیا جاتا ہے، اور تعلیم اس عنوان سے دیجاتی ہے کہ نہ تو کوئی بڑا کام انجام دے سکتے ہیں اور نہ کسی فن میں کمال حاصل کرسکتے ہیں، بلکہ غلامانہ ذہنیت ان لوگوں کے دماغوں میں پیدا کردیجاتی ہے، اور بعض جو کامیاب ہوتے ہیں اور اسکول و کالج سے باہر نکلتے ہیں تو وہ حکومت کی ملازمت یا اور کوئی دوسری نوکری کرنے لگتے ہیں۔ اور اس غلامی کو معراج سمجھنے لگتے ہیں اور اس طرح اپنی قیمتی زندگی کو ختم کردیتے ہیں"

مسٹر جے۔ سی چٹرجی سپرنٹنڈنٹ ایجوکیشن صوبۂ دہلی نے ایک تعلیمی رپورٹ میں لکھا ہے۔

"معلوم یہ ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ افراد اور غیر تعلیم یافتہ افراد میں تعلیم نفاق کی ایک خلیج پیدا کردیتی ہے جس سے اندیشہ ہے، آئندہ سیاسیات پر عمل درآمد مشکل ہو جائیگا، اور ہمارے

گھر کے معاشرتی تعلقات پر ایک ناخوشگوار اثر پڑیگا۔

اِن بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی اشاعت سے انگریزوں کا مقصد ان کے دل اور دماغ کی اخلاقی تربیت، روحانی رفعت و بلندی اور معاشی مرفہ الحالی و خوشگواری نہیں تھا، بلکہ غرض یہ تھی کہ ہندوستان کی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کیا جائے جسم کے ساتھ ساتھ اُن کے دل اور دماغ کو بھی غلام بنا لیا جائے۔ کیا اسلام کے کسی حکم یا مسلمانوں کی تاریخ سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اُنہوں نے غیر قوموں کو اس طرح اپنی اجتماعی غلامی میں جکڑ بند کرنے کے لیے اس طرح کی ریشہ دوانیوں اور دسیسہ کاریوں سے کام لیا ہو۔

اقتصادی بدحالی | انگریزوں کی اس تباہ کن ذہنیت کا اثر جس طرح تعلیم میں ظاہر ہوا اُس کے باعث ملک کی اقتصادی حالت بھی دن بدن کمزور ہوتی چلی گئی۔ آج بے روزگاری اور عام افلاس کی وجہ سے ہندوستان کا جو کچھ حال ہے، زعمائے فرنگ نے اس کو پہلے ہی معلوم کر لیا تھا اور وہ اس بدحالی اور زبوں حالی سے متعلق ایسٹ انڈیا کمپنی کے طرزِ عمل پر نکتہ چینی کرتے ہوئے پہلے ہی پیشین گوئی کر چکے تھے۔ مسٹر برک جو کمپنی کے طرزِ حکومت کے بہترین معترض ہیں اُنہوں نے ایک مرتبہ پارلیمنٹ میں ہندوستانی مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"عربوں، ایرانیوں اور تاتاریوں نے ہندوستان پر بہت سے حملے کیے جن سے اکثر انتہائی خونریزی اور تباہی ہوئی۔ ان کے مقابلہ میں عموماً ہمارے قدم اس ملک میں اتنا خون بہا کر نہیں بڑھے۔ البتہ ہم نے دغا اور فریب کی مختلف صورتوں کے ساتھ پیشقدمی کی۔ اور اُس اندھی اور احمقانہ عداوت سے فائدہ اُٹھایا جو ہندوستانی والیانِ ملک کے درمیان

ایک لا علاج مرض کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ ہم نے کھلے میدان میں قوت آزمائی نہیں کی، لیکن سابق فاتحین میں اور ہم میں ایک فرق تھا، اور وہ یہ کہ اُن کی خوشحالی اور بربادی اُن کے نئے وطن یعنی ہندوستان کی خوشحالی اور بربادی کے ساتھ وابستہ ہو جاتی تھی اُن کے ماں باپ سوچتے تھے تو یہ کہ اسی سرزمین میں ان کی اولاد پھلے پھولیگی۔ اسی طرح ان کے بیٹوں کو بھی اپنے اسلاف کی یادگاریں یہیں محفوظ نظر آتی تھیں زمانۂ سابق کے فاتحین کاشتکار اور صناع سے بھاری بھاری محصول تو لیتے تھے لیکن وہ اُن جیبوں کو جن سے دوبارہ فائدہ اُٹھاتے تھے ازسرِنو بھر بھی دیتے تھے۔

لیکن انگریزی حکومت میں یہ نظام بالکل بدل گیا ہے۔ تاتاریوں کی یورش سے بیشک ہندوستانیوں کو نقصان پہنچا تھا مگر ہماری حفاظت ہندوستان کو تباہ کیے ڈالتی ہے۔ نوعمر لونڈے ملک پر حکومت کر رہے ہیں، جہاں کے باشندوں سے نہ اُن کا میل جول ہے اور نہ اُن سے ہمدردی ہے۔ دولت کی ہوس اور تیز مزاجی جتنی کسی جوان میں ہو سکتی ہے وہ اُن لوگوں میں بھری ہوتی ہے اور ملک میں ان کی آمد کا ایک تانتا لگا ہوا ہے۔ ایک کھیپ لوٹتی ہے تو دوسری پہنچ جاتی ہے۔ ہندوستانی رعایا کے سامنے مستقبل کی صرف ایک مایوس کن صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک غیر محدود زمانہ تک ان موسمی شکاری پرندوں کے نئے نئے غول اسی طرح آتے جاتے رہینگے جن کی بھوک ہر مرتبہ اور زیادہ تیز ہوتی رہیگی۔ درآنحالیکہ جس چیز کے وہ بھوکے ہیں وہ کمیاب ہوتی جائیگی۔ (تصانیف برک ج ۲ ص ۸۰، ۹)

ایسٹ انڈیا کمپنی | ملک کی عام اقتصادی بدحالی کا ایک بڑا سبب یہ ہوا کہ انگریزوں نے قدیم زمینداروں
کی جگہ نئے زمیندار | کو ان کے اصل مالکوں کے قبضہ سے نکال کر بنیوں کو دی شروع کر دیں جن سے
خود انگریزوں کا بڑا مفاد وابستہ تھا۔ بڑے بڑے علاقے ان بنیوں کے نام ٹھیکہ پر دیے جاتے تھے
لیکن اصل ٹھیکہ دار کوئی با اختیار انگریز ہوتا تھا جو خود پردے میں رہتا تھا۔ اس وقت کے قانون
کی رو سے کسی ایک شخص کو ایک لاکھ سے زائد مالگذاری کا ٹھیکہ دینا جائز نہ تھا، مگر بڑے بڑے
صاحب لوگوں کے بنیے قانون سے آزاد تھے۔ خود وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل کا بنیا کنتو بابو تیرہ
لاکھ کا ٹھیکہ دار تھا۔ ایک دوسرا بنیا گنگا گوبند جی وارن ہیسٹنگز کا آلہ کار تھا۔ اور اس کی نسبت
دارالعوام میں جولائی ۱۷۸۵ء میں ایک حساب دکھایا گیا تھا جس کی رو سے گنگا گوبند سنگھ کی
کمائی تین کروڑ بیس لاکھ روپیے کے قریب تھی۔[1] اسی طرح گورنر کے دیوان رامچندر کی نسبت بیان
کیا گیا تھا کہ وہ ساٹھ روپیے ماہوار کا ملازم تھا مگر اس نے ساڑھے بارہ کروڑ کے قریب ترکہ
چھوڑا تھا۔ کمپنی کے ایک ایجنٹ روپ کشن کے پاس اتنی دولت تھی کہ اس نے ماں کے
مرنے پر نوے لاکھ صرف کیا تھا۔

انگریزوں نے کس طرح ان بنیوں کو اپنے لیے آلہ کار بنا رکھا تھا۔ مسٹر برک اس کا
ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"بنیا یا دیوان انگریز کے گھر کا منتظم ہوتا ہے، وہ تمام چالبازیوں اور عیاریوں سے واقف
ہوتا ہے جو مظالم سے بچنے کے لیے ایک غلام استعمال کرتا ہے، بنیا لوٹتا ہے، استحصال

---

[1] برک مقدمہ ہیسٹنگز ج ۱ ص ۳۹، بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔

بالجبر کرتا ہے، غارتگری کرتا ہے، اور پھر اُس میں سے جس قدر مناسب سمجھتا ہے اپنے صاحب کو بھی دے دیتا ہے۔ ان بنیوں نے بڑے بڑے گھرانے اُلٹ دیے ہیں۔ ملک برباد کر دیا ہے'۔

انگریزوں کی اس حکمت عملی کے باعث بنیوں نے کیا کیا مظالم کیے اور ملک کو کس طرح برباد کیا۔ مسٹر برک حسب ذیل الفاظ میں اس کی شہادت دیتے ہیں:۔

"زمیندار گھربار اور نوکر چاکر سب چھوڑ کر بھاگ نکلے، اور بھاگنے سے قبل اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہ اوقاف نیلام ہو رہے ہیں جو انہوں نے یا اُن کے بزرگوں نے خدا کی راہ میں اس لیے دے رکھے تھے کہ اُن کی آمدنی سے بیواؤں، یتیموں، لنگڑے لولوں اور اپاہجوں کی امداد کی جایا کرے۔ وہ جائدادیں بھی جو خود انہوں نے کفن دفن اور مرتے وقت کی رسموں کے لیے علٰحدہ کر رکھی تھیں فروخت کر دی گئیں۔ افسوس کہ جانکنی کے وقت سکون اور اطمینان سے گزر جانے کا سہارا بھی اس ظالم ہاتھ نے قطع کر دیا۔ اف کیسا ظالم ہاتھ تھا جس کا ظلم چتا کی آگ سے زیادہ جلانے والا، قبر سے زیادہ حریص اور موت سے زیادہ بے رحم تھا"

کاشتکاروں کی تباہی

"ان زر پرست بنیوں کا قبضہ کاشتکاروں کے لیے بھی سخت مصیبت تھا۔ لگان کی وصولی میں ان پر طرح طرح کی سختیاں کیجاتی تھیں اور جانوروں کے غولوں کی طرح قید میں رکھ کر آخری کوڑی تک اُن کی جیبوں سے نکلوا لیجاتی تھی۔ اور ان طریقوں سے بھی مطالبہ پورا نہ ہوتا تو اُن کے ڈھور ڈنگر اور گھر کا سامان نیلام کر دیا جاتا۔ بیسیوں گھرو

لوٹ لوٹ مار کی گئی۔ ان مظالم سے تنگ آکر جب کسان بھاگنے لگے تو ان کو پکڑ کر دوبارہ

پکڑ کر انہیں واپس کیا گیا تاکہ وہ انہی گھروں میں رہیں جو بندی خانوں سے کم نہ تھے

پھر اپنے گھروں کے مصائب سے تنگ آکر بہت سے کاشتکار جنگلوں میں جا چھپے تو وہاں

بھوک اور جنگلی جانوروں نے عاجز کر دیا۔ تب وہ پھر واپس آئے۔ اور مجبوراً مقابلہ کے

لیے کھڑے ہو گئے۔ اس بلوہ کو پہلے بے قاعدہ اور پھر باقاعدہ فوج کے ذریعہ دبایا گیا۔ اور

ظلم کی مدد میں زبردست مظالم کیے گئے۔

انگریز تاجروں کے اعمال پر نکتہ چینی کرتے ہوئے میجر باسو "انگریزی سلطنت کا استحکام"

میں لکھتے ہیں :۔

"یہ تجارت ظلم کی ایک مشین ثابت ہوئی جس سے بدقسمت اور مجبور کاشتکار تباہ ہونے

لگے ان پر اُن کے انگریز آقا طرح طرح کی مہذب بربریت کا استعمال کرتے تھے۔ اور

اس سے محظوظ ہوتے تھے۔ (ص ۵۱)

عام بے روزگاری و پریشان حالی

ظلم واستبداد کے ذریعہ ہندوستان کے کاروبار پر قبضہ کرنے اور دیسی منافع کی راہوں کو بند کر دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سینکڑوں زمیندار اور ہزاروں سپاہی اور ملازم بے روزگار ہو گئے تھے۔ قاعدہ ہے "تنگ آمد بجنگ آمد" چنانچہ ان لوگوں نے مجبوراً لوٹ مار کا پیشہ اختیار کر لیا۔ غضب ہے ناگپور سے لے کر خلیج بنگال تک تیئیس[۲۳] ہزار پنڈارے لوٹ مار کرتے پھرتے تھے۔ ان لوگوں نے ۱۸۱۹ء کے موسم سرما میں صرف دس دن کے اندر ایک سو بیاسی آدمی قتل کیے، پانسو کو زخمی کیا، اور تقریباً تین ہزار انسانوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں

اور ایک کروڑ کا مال لوٹا۔[1]

صنعت و حرفت | کمپنی نے زمینداریوں کو تباہ و برباد کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ یہاں کی صنعت و حرفت کو بھی مٹایا۔ مشہور مورخ ہند مسٹر ولسن لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان کے ساتھ اس ملک نے جس کا اب وہ محکوم ہے، بڑی بے انصافی کی ہے۔ اس کی ایک افسوسناک مثال یہ ہے کہ ۱۸۱۳ء میں ایک گواہ نے، تحقیقاتی کمیشن کے سامنے) بیان کیا تھا کہ اس وقت تک ہندوستان کے سوتی اور ریشمی کپڑے برطانیہ کے بازاروں میں وہاں کے بنے ہوئے مال سے پچاس اور ساٹھ فیصدی سستے بکتے تھے اور پھر بھی نفع کے ساتھ، لہذا ضروری ہوا کہ ستر اور اسی فیصدی کے امتناعی محصول لگا کر انگلستان کی مصنوعات کا تحفظ کیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا اور یہ انسدادی محصول اور احکام نہ ہوتے تو مانچسٹر اور پیسلے کے پتلی گھر کھلتے ہی بند ہو گئے ہوتے اور پھر بھاپ کی طاقت بھی ان کو متحرک نہ کر سکتی۔

کمپنی نے ہندوستانی صنعت و حرفت کو برباد کرنے کے لیے علانیہ احکام صادر کر دیئے کہ بنگال میں ریشم پیدا کرانے کی کوشش کی جائے لیکن ریشم کے کپڑے تیار کرنے کو روکا جائے۔ جتنے جولاہے تھے زبردستی کمپنی کے ملازم بنا لیے گئے اور ان کو سخت ممانعت تھی کہ کسی اور کے لیے کپڑا بُنیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو انہیں سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔[2]

ملازمت | اسی طرح جتنی اعلیٰ ملازمتیں تھیں وہ بھی سب سفید فام انسانوں کے لیے وقف تھیں ہندوستانی

(1) Strangers at the Gates, P. 250

(۲) رومیش چندر دت ص ۲۶۴، ۲۶۵۔

ان سے الگ رکھے جاتے تھے، پھر ان انگریز عہدہ داروں کی تنخواہیں اس قدر زیادہ تھیں کہ ملک کا عام دستور کسی طرح اس کی اجازت ہی نہیں دے سکتا۔

ساست مروز | آج دعویٰ کیا جاتا ہے، ہندوستان کو بڑی بڑی اصلاحات مل چکی ہیں، صوبجاتی خود مختاری ہے۔ اپنی وزارتیں ہیں، اپنی مجالس مقننہ ہیں لیکن کیا اس قدر ترقیوں کے باوجود انگریز اور ہندوستانی عہدوں کے استحقاق کے اعتبار سے برابر سمجھے جاتے ہیں۔ کیا مالیات کا شعبہ اُن کے ہاتھ میں ہے، کیا فوج کے نظم ونسق میں خود ان کو کوئی دخل ہے۔ کیا مجالس مقننہ اپنی رائے اور فیصلے کے نفاذ کرنے میں آزاد ہیں۔ کیا وزارتوں پر گورنر کو قوت مقتدرہ حاصل نہیں ہے کیا عام اسلحہ رکھنے کی اجازت ہے۔ کیا سول سروس میں انگریز اور ہندوستانی دونوں کی تنخواہ کا معیار ایک ہی ہے۔ پھر ایک ہندوستان پر ہی کیا موقوف ہے، یہ مستعمرانہ پالیسی کہاں اپنا کام نہیں کر رہی ہے۔ کیا اسلام کے دستور سے کوئی ایسا حکم پیش کیا جاسکتا ہے جس میں مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہو کہ وہ غیر قوموں کو اس طرح اپنی اجتماعی غلامی کی زنجیروں میں باندھ لیں۔ کیا اسلام کی تاریخ میں اس طرح کی تنگ نظری، ذہنی تسفل، اور دماغی فروتری کی کوئی مثال مل سکتی ہے۔ مولانا شبلی نے اسی بناء پر سچ کہا تھا:-

اس مساوات پہ ہے معشرِ اسلام کو ناز — نہ کہ یورپ کی مساوات کہ ظلم اکبر! [۱]

---

[۱] ہم نے اس باب میں ہندوستان کی تعلیمی اور اقتصادی حالات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس کی اکثر معلومات "تعلیمی ہند" از حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی۔ "اور مسلمانوں کا روشن مستقبل" مصنفہ مولانا سید طفیل احمد صاحب (علیگ) سے ماخوذ ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے "بھارت میں انگریزی راج" سندر لال۔ "بدقسمت ہندوستان" لالہ لاجپت رائے تقاریر مسٹر برک۔ "ہندوستان کی اقتصادی تاریخ" از س۔ "انگریزی سلطنت کا استحکام" میجر باسو۔

منکرین رقیت کے دلائل پر ایک نظر

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن لوگوں کے دلائل پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے جنھوں نے غیر مسلموں کے اعتراضات سے مرعوب ہو کر اسلام میں غلامی کے وجود سے ہی انکار کر دیا ہے۔ رقیت کا قطعی انکار غالباً سب سے پہلے سر سید احمد خاں نے کیا ہے، پھر اُن کے ایک رفیقِ طریق مولوی چراغ علی نے اپنی کتاب "Proposed political Legal and Social Reforms under Muslim Rule"

میں (جس کا اُردو ترجمہ "اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام" کے نام سے مولوی عبدالحق بی اے (سیکر) نے کیا تھا) غلامی کے مسئلہ پر بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور اُس میں سر سید کی تقلید میں یہی ثابت کرنا چاہا ہے کہ اسلام میں غلامی کا کہیں وجود ہی نہیں ہے۔ فاضل مصنف نے اس میں اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے جو دلائل قائم کیے ہیں کوئی منکرِ رقیت ان سے زیادہ قوی دلائل قائم نہیں کر سکتا۔ اس لیے صرف انہی پر ایک نظر ڈال لینا اصل مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

پہلی دلیل مولوی صاحب نے سب سے پہلے قرآن مجید کی آیت فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً سے استدلال کیا ہے۔ لیکن ہم اس پر کتاب کے آغاز میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس آیت کے علاوہ جتنی آیات نقل کی گئی ہیں اُن سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ غلاموں کے ساتھ ملاطفت اور نرمی کا برتاؤ کرو۔ اُن کو آزاد کراؤ۔ انہیں

کفارہائے ظہار و قتل و خطاء وغیرہ میں آزاد کرو، وغیرہ وغیرہ لیکن یہ کسی آیت سے نہیں معلوم ہوتا کہ استرقاق کو قطعاً ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔

دوسری دلیل | آیات کے بعد احادیث کا نمبر ہے۔ موصوف کو احادیث کے ساتھ جو "اعتقاد" ہے اُس کو کس صفائی سے بیان کرتے ہیں

میں ۔۔۔ ہی احادیث نقل کرتا ہوں کیونکہ مجھے اس کی صحت پر زیادہ اعتقاد نہیں اس لئے کہ وہ عموماً غیر مستند، بے ثبوت اور یک طرفہ ہوتی ہیں۔

اس "اعتقاد" کے باوجود آپ نے احادیث کو ثبوت میں پیش کرنے کی تکلیف کیوں گوارا کی؟ اس کی بابت خود ہی کہتے ہیں:۔

"لیکن ان لوگوں کی دلچسپی کے لیے جو حدیث کے بہت شائق ہیں ایسی احادیث کی تلاش کرنے کا کام بھی میں نے اپنے ذمہ لیا جو غلامی کو ناجائز قرار دینے میں قرآن کی ہم زبان ہیں"

مولوی صاحب نے احادیث کو یک طرفہ کہا ہے لیکن وہ خود اپنی بات کی پچ کر رہے ہیں اور کہتے ہیں۔

"اس کے علاوہ وہ حدیثیں رد کر دینی چاہئیں جو غلامی یا اُس کی متعلقہ خرابیوں کو تسلیم کرتی ہیں"

بہرحال اب جبکہ اُن احادیث سے استدلال کیا گیا ہے۔ اُن پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے، آپ نے سب سے پہلے وہ حدیث نقل کی ہے جس میں فرمایا گیا ہے "اگر عربوں کا غلام بنانا جائز ہوتا تو آج بہت سے عرب اسیر ہوتے" آپ اس سے استدلال کرتے ہیں "کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم غلامی کو ناجائز سمجھتے تھے"

تعجب ہے حدیث میں صاف طور پر عربوں کو غلام بنانے کا ذکر ہے اور مولوی صاحب اس سے مطلق غلام بنانے کے عدم جواز پر استدلال کر رہے ہیں۔ "اگر عربوں کا غلام بنانا جائز ہوتا" ان لفظوں سے خود یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کا تو نہیں البتہ غیر عرب کا غلام بنانا جائز ہے۔ رہا عرب کا غلام بنانا تو اس میں شبہ نہیں کہ اس کو خود حضرت عمرؓ نے ناجائز قرار دیا تھا، اور اسی بنا پر فقہاء اسلام کے ایک طبقہ کے نزدیک یہ ناجائز ہے بھی۔

اس حدیث کے بعد اُن چند احادیث کو نقل کیا ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسیران حرب کو غلام نہ بنانے اور آزاد کر دینے کا ذکر ہے۔ ان احادیث سے بھی مولوی صاحب کا مدعا ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان احادیث کے بالمقابل ایسی بعض حدیثیں بھی ہیں جن میں اسیران جنگ کو مجاہدین اسلام پر تقسیم کر دینے کا ذکر ہے، اور ہم یہ پہلے بتا ہی چکے ہیں کہ اس میں شک نہیں اکثر مواقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیران جنگ کو آزاد کر دیا ہے لیکن اس سے بھی انکار مشکل ہے کہ آپ نے خاص خاص حالات میں استرقاق کو جائز رکھا ہے۔

اس کے بعد زمانہ محاصرہ طائف کا وہ اعلان درج کیا گیا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "اگر شہر سے کوئی غلام ہمارے پاس آئیگا تو وہ آزاد کر دیا جائیگا۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں:۔

"اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غلامی کو جائز نہیں سمجھتے تھے ورنہ وہ دوسرے لوگوں کے غلاموں کو آزاد کرنے میں اپنے آپ کو کس طرح مجاز خیال کرتے"۔

غور کیجیے تو یہ استدلال بھی نہایت رکیک وضعیف معلوم ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ آپ کا یہ اعلان ان غلاموں کی تالیف قلب کے لیے تھا۔ اس کے علاوہ فقہ اسلام کی رو سے ایک غلام اگر دارالحرب سے بھاگ کر دارالاسلام میں آجائے اور اسلام قبول کرلے تو وہ آزاد ہوجاتا ہے مولوی صاحب نے اس موقع پر بڑی تلبیس سے کام لیا ہے، حدیث طائف سے استدلال کرنے کے بعد لکھتے ہیں "از روئے قانون حرب وفقہ اسلام ایک مفرور غلام یا ایسا غلام جو اسلام قبول کرے آزادی کا حق نہیں رکھتا[1]" حالانکہ یہاں سوال یہ نہیں ہے کہ محض اسلام قبول کرلینے سے یا دارالحرب سے بھاگ آنے پر کوئی غلام آزاد ہوجاتا ہے یا نہیں، بلکہ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی غلام اپنے مولا کی مرضی کے خلاف دارالحرب سے بھاگ آئے، اور مسلمان ہوجائے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محاصرۂ طائف کے اعلان کے بعد بعض غلاموں نے کیا، تو وہ آزاد ہوجاتے ہیں یا نہیں؟ تو اس کے متعلق فقہ اسلام کا مسئلہ ہے کہ وہ غلام آزاد ہوجائینگے۔ سعیدیات میں جو فقہ کی مستند کتاب ہے لکھا ہے۔

ولو کان العبد مملوکاً لحربی فخرج الی دارالاسلام مسلماً کان حرًا	اگر غلام کسی حربی کا مملوک ہو اور مسلمان ہوکر دارالاسلام میں چلا آئے تو وہ آزاد ہوجائیگا۔

پھر اس کے آگے ہے:۔

ولا استرقاق علی المسلم ابتداءً[2]	اور مسلمان پر ابتداءً استرقاق نہیں ہے۔

اور اس حکم کے لیے استدلال اسی محاصرۂ طائف کے اعلان اور صلح حدیبیہ کے واقعہ

---

[1] اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام حصہ اول ص ۸۰ [2] سعیدیات ص ۱۵۸ مطبوعہ مطبع حسینیہ مصر۔

سے کیا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو غلام بھاگ کر چلے آئے تھے اور آپ نے اُن کی آزادی کو تسلیم کر لیا تھا۔

علامہ شامی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے[1] کہ اگر کوئی غلام دارالحرب سے اپنے مولیٰ کی مرضی کے خلاف بھاگ کر دارالاسلام میں آجائے، تو وہ سب کے نزدیک آزاد ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

لَا يُعْلَمُ فِيهِ خِلَافٌ بَيْنَ اَهْلِ الْعِلْمِ — اس مسئلہ میں اہل علم مختلف نہیں ہیں

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ مولوی صاحب کو فقہ اسلام کی اس تصریح کی خبر نہیں تھی لیکن یہ صحیح نہیں ہے، اُنھوں نے اپنی کتاب کے فقرہ ۱۲۶ اور ۱۲۷ کے ماتحت خود فقہاء کے ان اقوال کو شامی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ پس اصل بات یہ ہے کہ جہاں فقہاء کی یہ تصریح اُن کے مقصد کے خلاف تھی وہاں انھوں نے اس مسئلہ کے متعلق ایک مبہم سا سوال قائم کر کے اس سے انکار کر دیا اور جہاں یہ تصریحات اُن کے لیے مفید مطلب ہو سکتی تھیں وہاں اُنھوں نے اُن کا صاف لفظوں میں اقرار کر لیا اور اُن سے اپنے مدعا پر استدلال کیا۔

اس کے علاوہ بعض استدلالات تو صد درجہ مضحکہ انگیز ہیں۔ مثلاً آپ فقرہ ۱۲۸ میں بخاری کی ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیوی اُم سلمہؓ کے پاس تشریف لائے۔ اُس وقت ایک خواجہ سرا اُم سلمہؓ کے قریب بیٹھا ہوا اُن کے بھائی سے یہ کہہ رہا تھا "اگر طائف کل فتح ہو گیا تو بنتِ غیلان کو (میں بتاؤں گا اُسے) تم (اپنی لونڈی بنانے کے لیے) لے لینا"

---

[1] شامی ج ۳ ص ۳۴۱۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُن کر فرمایا کہ "ایسے آدمی تمہارے پاس نہ آیا کریں" اس نقل کے بعد لکھتے ہیں:-

"اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غلامی یا غلام لڑکیوں کا رکھنا کیسا ناگوار تھا۔"

یہ استدلال نہایت غلط ہے۔ کیونکہ حدیث کے الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مخنث تھا۔ ہیت اس کا نام تھا، خواجہ سرا سمجھا جاتا تھا اور اس بنا پر اُس کو اندرونِ خانہ آنے کی اجازت تھی لیکن جب اُس نے حضرتِ ام سلمہؓ کی موجودگی میں بنت غیلان کے حسن وجمال کی تعریف کی جو بلاشبہ اخلاقی اعتبار سے ایک مذموم فعل تھا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ناگواری ہوئی اور قدرتی طور پر ہونی چاہیے تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ آپؐ نے اُس کو گھر میں آنے سے منع کر دیا پس اس حدیث سے استدلال حجاب پر تو ہو سکتا ہے، غلامی کے عدم جواز پر کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں۔ لَا یَدْخُلَنَّ هٰؤُلَاءِ عَلَیْکُنَّ (ہیت جیسے لوگ (جو مخنث ہونے کے باوجود عورتوں کے ساتھ دلچسپی رکھتے ہیں) تم ازواج مطہرات کے پاس ہرگز نہ آیا کریں) اس حدیث میں غلامی پر ناگواری کی طرف تو کہیں اشارہ بھی نہیں ہے۔

پھر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز استدلال وہ ہے جو آپ فقرہ ۱۲۹ میں درج کرتے ہیں آپ فرماتے ہیں "بخاری نے ابو سعید خدری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک روز وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک شخص آیا اور اُس نے لونڈیوں کے متعلق اپنی عادت کو بیان کیا، پیغمبر خدا نے (تعجب سے) فرمایا کہ تم ایسا کرتے ہو؟ نہیں تم پر لازم ہے کہ ایسا نہ کرو۔ کیونکہ جس جان کے لیے خدا نے یہ قرار دیا ہے کہ وہ باہر آئے تو وہ ضرور باہر آ کر رہیگی۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد مولوی چراغ علی صاحب لکھتے ہیں۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر صاف طور سے تسری اور تجارت غلامی کی مذمت فرمائی ہے۔

آپ کہینگے دلیل کو دعوے سے تعلق کیا ہے؟ تو لیجیے اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں

"(۱) جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث مسئلہ عزل کے متعلق ہے، تو یہ الفاظ حدیث کے صریح خلاف ہیں، کیونکہ "او انکم تفعلون ذلك اور لا تفعلوا سے ظاہر ہے کہ جس فعل کی سائل نے بالفعل کرنے کی خبر دی تھی اسی کو منع کیا گیا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ ہم لونڈیوں کے ساتھ سوتے ہیں۔ یہ نہیں کہا تھا کہ ہم عزل بھی کرتے ہیں۔ (۲) اگر "لا" کے بعد لفظ "حرج" مقدر تسلیم کیا جائے تب بھی ہمارے لیے مفید ہے جس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس کا کرنا گناہ ہے۔ (۳) جو لوگ "لا" کو زائد مانتے ہیں یہ صریح تحلیف ہے اس لیے کہ ایک لفظ موجود ہے وہ فرض کر لیتے ہیں کہ نہیں ہے۔ انتہی کلامہ[1]

اس حدیث میں بحث طلب یہ بات ہے کہ یہ عزل سے متعلق ہے یا غلامی سے۔ مولوی صاحب بڑے زور سے فرماتے ہیں کہ اس کو عزل سے تعلق ماننا "الفاظ حدیث کے صریح خلاف ہے"، حالانکہ یہ صریح خلاف نہیں، بلکہ الفاظ کے عین مطابق ہے۔ سائل کہتا ہے۔

انا نصیب سبیا فکیف ترٰی فی العزل۔	ہم کو باندیاں ملتی ہیں تو فرمائیے آپ کا عزل کے متعلق کیا حکم ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ باندیوں کے رکھنے کے متعلق سائل کو کوئی تردد ہی نہیں ہے

[1] حاشیہ ص ۵۳ و ۵۴۔ اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام۔

بلکہ اُس کو یقین ہے کہ یہ تو جائز ہے ہی۔ اب اُس کا سوال صرف عزل کے متعلق رہ جاتا ہے کہ یہ بھی جائز ہے یا نہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب میں ارشاد فرمانا:۔

فانھا لیست نسمۃ کتبھا اللہ — اللہ نے جس کسی نفس کے لیے پیدا ہونا مقدر

ان تخرج الا ھی خارجۃ — کر دیا ہے وہ تو پیدا ہوگا ہی۔

اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ سائل کا سوال عزل سے ہی متعلق تھا ورنہ پھر سوال و جواب میں مطابقت باقی نہیں رہتی۔ مولوی صاحب نے "لا" کے زائد ہونے نہ ہونے کی بحث خواہ مخواہ پیدا کی۔ کیونکہ اصل مسئلہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ عزل کے جواز و عدم جواز سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر یہ کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ آپ نُصِیْبُ سبیًا کا ترجمہ "باندیوں کے ساتھ سوتے ہیں" کرتے ہیں، حالانکہ عربی کا ایک مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے کہ "نُصِیْبُ" "اِصَابَۃٌ" سے مشتق ہے اور اُس کے معنی "پانا" ہیں، سونے کے معنی تو عربی لغت میں کہیں بھی نہیں آتے۔ اس کے علاوہ ایک یہ بات بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ سائل نے "انا نُصِیْبُ سبیًا" کہہ کر تو ایک واقعہ کی خبر دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سُن کر مخبر کو صادق یا کاذب تو کہہ سکتے تھے اُس پر کوئی حکم کس طرح لگا سکتے تھے۔ پس لامحالہ آپ کے جواب کا تعلق فکیف تریٰ فی العزل یعنی سوال عن العزل سے ہوگا، نہ کہ انا نُصیبُ سبیًا سے۔

اس کے بعد آپ نے وہ حدیث درج کی ہے جس میں ہے کہ

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنگ میں ایک عورت کو حاملہ دیکھا۔ آپ نے اُس کے

ساتھی کی طرف اشارہ کرکے ان لوگوں سے جو پاس کھڑے تھے پوچھا کہ "کیا اس شخص نے اس عورت کو اپنی لونڈی بنا کر یعنی سریہ کے طور پر رکھا تھا؟" لوگوں نے جواب دیا "ہاں" پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں نے اس پر ایسی لعنت بھیجی ہے جو اس کے ساتھ قبر تک جائیگی الخ

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"یہ سب سے زیادہ صاف اور صریح اور سب سے زیادہ سخت مذمت غلامی اور تسری کی ہے"۔

سخت حیرت اور تعجب کا مقام ہے کہ لوگوں کو کس طرح دیدہ و دانستہ اس قسم کی غلط بیانیوں کی جسارت ہو جاتی ہے۔

اِنْ کُنْتَ لَاتَدْرِی فَتِلْكَ مُصِیْبَۃٌ وَاِنْ کُنْتَ تَدْرِی فَالْمُصِیْبَۃُ اَعْظَمُ[1]

ہم اس حدیث کو "استبراء" کے حکم کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔ الفاظ سے بلاشک و شبہ کے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں غلامی کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ اس پر آیا کہ اُس شخص نے اپنی باندی سے استبراء کے بغیر (بحالت حمل) مجامعت کر لی تھی۔ چنانچہ حدیث میں لَعَلَّ صاحبہا اَلَمَّ بِہا کے الفاظ اس مطلب کو واضح طور پر ظاہر کر رہے ہیں۔ پھر آپ کا آخر میں یہ فرمانا:۔

"وہ کیونکر ایسے شخص کو اپنا وارث بنائیگا جو درحقیقت اُس کا وارث نہیں ہے (اگر وہ پیدا ہونے والا بچہ اُس کا نہیں ہوا) اور وہ کیونکر اُس سے خدمت لیگا (بحیثیت غلام کے) جو دراصل اُس کا

[1] اگر تو نہیں جانتا تو یہ ایک ہی مصیبت ہے اور اگر جانتا ہے تو مصیبت بہت ہی بڑی ہے۔

غلام نہیں ہے اگر وہ بچہ خود اس کا ہو)

اس بات کی قابل انکار دلیل ہے کہ آپ کا غضب اس پر نہیں تھا کہ اس شخص نے باندی کو کیوں رکھا بلکہ اس بات پر مبنی تھا کہ اس نے استبراء کے بغیر ہمبستری کیوں کی؟

اس کے بعد مولوی چراغ علی نے ان حدیثوں کو درج کیا ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام کے ساتھ بدسلوکی کی شکایت کو سن کر یا اس کو پٹتا ہوا دیکھ کر حکم دیا تھا کہ وہ آزاد کر دیا جائے۔ ان حدیثوں کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غلامی کو جائز سمجھتے تو کبھی دوسروں کے غلاموں کو آزاد نہ کرتے ورنہ اس سے یہ معنی ہوتے کہ آپ دوسروں کے املاک کو تلف کرتے تھے۔"

یہ ایک صریح مغالطہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام مسلمانوں پر سیادت روحانی و جسمانی حاصل تھی اور اس بنا پر یقیناً آپ کو یہ حق تھا کہ کسی مسلمان کے املاک کے متعلق کوئی حکم بیان فرماتے۔ پھر اس بات کو نظرانداز نہ کرنا چاہیے کہ آپ کی یہ ناراضگی اور غلام کو آزاد کرنے کا حکم آقا کے فعل ضرب پر مبنی تھا نہ اس پر کہ اس شخص نے غلام کیوں رکھ چھوڑا تھا مولوی صاحب نے اس پر ریمارک کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"یہ فقہا کا صرف حیلہ ہے، یہ وہ کہتے ہیں کہ جب غلام سے ظالمانہ سلوک کیا جائے تو وہ آزاد کر دیا جائے"

حالانکہ ہر صاحب نظر جان سکتا ہے یہ فقہا کا "حیلہ" نہیں بلکہ حدیث کا اصل مطلب ہے۔ پھر کس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ آپ اس فقرہ کے بعد تحریر کرتے ہیں:۔

"یہ قید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عام اصول اور عمل اور تعلیم کے منشاء کے خلاف ہے"

منشاء کے خلاف کیوں ہے؟ سنیے، خود ارشاد فرماتے ہیں:-

"آپ نے تو یہاں تک تاکید فرمائی ہے کہ مالک اپنے غلام کے تھپیٹر مارے تو اُسے آزاد کردیا جائے"۔

اب" کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟" اِن تینوں فقروں میں باہمی ربط کیا ہے؟

الحاصل مولوی صاحب نے غلامی کے عدم جواز پر جتنے دلائل قائم کئے ہیں وہ سب اسی طرح نہایت لغو اور مضحکہ انگیز ہیں۔ ہم نے اس تنقید میں صرف اُنہی دلائل سے بحث کی ہے جو مولوی صاحب کے خیال کے مطابق سب سے زیادہ قابل توجہ اور قوی ہیں۔ بس انہی پر اور دلائل کو قیاس کر لیجیے۔ اگر ہم فرداً فرداً ہر ایک پر کلام کرتے تو بہت طوالت ہو جاتی۔

خلاصۂ بحث

خاتمۂ کلام پر ہم پھر ایک مرتبہ یہ ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ تمام دنیا میں صرف اسلام کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ اُس نے غلامی کے رواجِ بد کو ختم کرنا چاہا، اور اُس نے اُس زمانہ میں غلاموں کی حالتِ زار اور اُن کے حقوق کی طرف قوموں کو متوجہ کیا جبکہ حضرت عیسیٰ کے حواریین یہ اعلان کر رہے تھے :-

"جتنے غلام جوئے کے نیچے ہیں وہ اپنے اپنے مالکوں کو کمالِ عزت کے لائق جانیں تاکہ خدا کا نام اور تعلیم بدنام نہ ہو، اور جن کے مالک ایماندار ہیں تو وہ اپنے آقا کو بھائی ہونے کی وجہ سے حقیر نہ جانیں، بلکہ اس لیے زیادہ تر ان کی خدمت کریں کہ فائدہ اٹھانے والے ایماندار اور عزیز ہیں۔ ان باتوں کی تعلیم دیں اور نصیحت کریں[1]۔

یا وہ کہہ رہے تھے۔

"اے غلامو! جو جسم کی رو سے تمہارے مالک ہیں سب باتوں میں ان کا حکم مانو"[2]

لیکن وہ اقوام عالم اور خود عرب کے عام حالات کے پیش نظر اس رواج کو یک قلم ختم نہیں کر سکتا تھا۔ ورنہ اس سے عرب کی معاشرتی اور اقتصادی حالت (شمالی امریکہ کی طرح) بیحد ابتر اور پیچیدہ ہو جاتی۔ اس لیے اُس نے اسی سلسلہ میں اصلاح کی تدریجی حکمت عملی سے کام لیا جو اسلام

---

[1] تموتھی پہلا خط باب ۶ درس ۱و۲ [2] کلوسیون باب ۳۰ درس ۲۲۔

کے دینِ کامل ہونے کی بیّن دلیل ہے۔ اس اصلاح کے اہم اجزا حسب ذیل ہیں:۔

(۱) غلامی کی تمام صورتوں کو مٹا کر صرف اسیرانِ حرب کو غلام بنانے کی صورت کو کو باقی رکھا۔

(۲) قرآن مجید نے صراحۃً و کنایۃً کسی طرح بھی اسیرانِ جنگ کو غلام بنانے کا ذکر نہیں کیا، بلکہ اس سے سکوت کیا۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوات کے قیدیوں کے ساتھ زیادہ تر منّ و فِدا کا ہی معاملہ کیا۔ کسی کسی جنگ میں بعض قیدیوں کو غلام بنانے کا واقعہ ضرور پیش آیا۔

(۴) قرآن مجید میں غلاموں اور باندیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور اُن کو آزاد کرانے کے لیے روپیہ خرچ کرنے کا حکم تو متعدد مواقع پر آیا ہے لیکن عیسوی تعلیمات کی طرح غلاموں کے لیے یہ حکم کہیں نہیں دیا گیا ہے کہ وہ اپنے آقاؤں کی خدمت کریں۔ بلکہ اس سے سکوت اختیار کیا گیا ہے اور عام معاشرتی آداب کے بیان پر ہی اکتفا کرلی گئی ہے۔

(۵) غلاموں کے متعلق جو خراب ذہنیتیں پہلے سے قائم تھیں۔ اُن میں زبردست اصلاح کی، اور اُن کو بھائی کہا۔

(۶) غلاموں کے حقوق انسانی کی طرف بڑے زور شور سے توجہ دلائی۔

(۷) غلاموں کے آزاد کرنے کو بے انتہا ثواب کا کام قرار دیا۔

(۸) غلاموں کے آزاد ہونے کی متعدد اضطراری صورتیں بتائیں

(۹) متعدد گناہوں یہاں تک کہ بعض معمولی معمولی گناہوں کے کفارہ میں بھی غلاموں

کو آزاد کرنے کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا۔

(۱۰) خود غلاموں کو حق دیا کہ اگر وہ مکاتبت وغیرہ کسی ذریعہ سے آزادی حاصل کرنا چاہیں تو ان کے آقا ان کی مدد کریں اور ان پر سختی نہ کریں بلکہ بخشش زیادہ ہو تو بہم پہنچائیں۔

(۱۱) متعدد جزئیات ایسی ارشاد فرمائیں جن کی رو سے غلام خود بخود آزاد ہو جاتا ہے۔

(۱۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام نے اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ غلاموں کے ساتھ شفقت و ہمدردی کا معاملہ اور مساویانہ برتاؤ کرنا چاہیے۔ حقارت آمیز و ذلت انگیز طریق معاشرت سے احتراز ضروری ہے۔

(۱۳) قرآن مجید کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی استرقاق کی تحسین نہیں کی بلکہ سکوت اختیار فرمایا اور رواج پہلے سے قائم تھا اس کی نسبت احکام ضرور بتائے

(۱۴) غلاموں کا سوشل مرتبہ ایام قدیم کی نسبت کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع کر دیا۔

ان اصلاحات کو معلوم کرنے کے بعد ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اسلام نے اگرچہ رواج غلامی کا یک قلم انسداد نہیں کیا لیکن اس کا اندرونی منشاء اور دلی خواہش کیا تھی؟ پس اگر دنیا کی تمام قومیں متفق ہو کر غلامی کے انسداد کا کوئی قانون بنانا چاہیں تو اسلام سب سے پہلے پوری صاف باطنی کے ساتھ اس تجویز کا خیر مقدم کریگا۔ اور اس تجویز کو عملی شکل میں لانے کے لیے تمام ادیان و مذاہب سے زیادہ سرگرم عمل اور مصروف جد و جہد نظر آئیگا کیونکہ یہ اس کی اسپرٹ کے عین مطابق ہے۔

آخر میں ہم اس حصہ کا خاتمہ عہد حاضر کے نامور مفکر اسلام علامہ سید رشید رضا المصری ؒ

کہ اُس جملہ پر کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے ایک مرتبہ اسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اپنے رسالہ المنار میں لکھا تھا۔

قارئین جانتے ہیں کہ مغربی قوموں کے نزدیک غلامی کا مسئلہ ان مسائل میں سب سے زیادہ اہم ہے جو اُن کے خیال میں اسلام کے لیے موجب طعن ہیں۔ یہ لوگ فخر کرتے ہیں کہ ان کی مدنیت اسلام سے زیادہ ترقی یافتہ ہے کیونکہ اسلام نے انسانوں کو غلام بنانے کا حکم دیا ہے اور یہ اس کے برخلاف انسانی محبت کے جذبہ سے متاثر ہو کر غلاموں کو آزاد کرتے ہیں، حالانکہ اُن کی مذہبی کتاب جس کی یہ اس قدر اشاعت کرتے ہیں اُس میں غلاموں کے لیے ایسے سخت احکام ہیں جن کی نظیر اسلام میں کہیں نہیں مل سکتی۔ اور یہاں اسلام نے نہ تو غلام بنانے کا حکم دیا ہے نہ اس کو فرض قرار دیا ہے اور نہ سُنت بلکہ وہ ایک رواج تھا جو تمام قوموں میں پایا جاتا تھا۔ اس لیے اس کے متعلق اسلام نے ایسے حکمت آمیز احکام وضع کیے جو اس رواج کو محو کر دیں۔[1]

اُن "حکمت آمیز" احکام کا فوری اثر کیا ہوا؟ اس کے متعلق کسی مسلمان کی نہیں متعدد یورپین اہل قلم کی شہادتیں آپ پڑھ چکے ہیں، اب ختم کتاب پر ایک اور فاضل یورپین کی شہادت سُنتے جائیے کہ الفضل ما شهدت به الاعداء!

چیمبرس جرنل میں ایک دفعہ ایک طویل مضمون بعنوان "غلامی کا نمایاں پہلو قابل عبرت حالت، اور مسلمانوں کا ہمدردانہ سلوک" شائع ہوا تھا جس میں فاضل مضمون نگار نے لکھا تھا:

---

[1] الاسلام روح المدنیۃ ص ۱۳۹، مطبوعہ مصر۔

"یہ واقعہ ہے کہ مسلمان غلام کی حالت اکثر اوقات قدیم زمانہ کے آئین کے نواب و بادشاہ کا مقابلہ کرتی ہے۔ وہ بعض اوقات اپنے مالک کا معتبر و معتمد ملازم ہے، اور اس کی ملازمت میں ایک اعلیٰ ذمہ داری کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے اور دونوں کا عہد و پیمان اُن کو ایک مشترک دلچسپی کی طرف لے آتا ہے۔ یعنی ایک ہو جاتے ہیں۔ یہ اُن کا فرض ہے کہ جب تک اس سے آرام حاصل کریں وہ خود غلام کی آسائش پورے طور پر بہم پہنچائے۔

(ماخوذ از رسالہ حقیقتِ اسلام مارچ ۱۹۳۲ء)

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

ختم شد

(کتبہ عبدالقیوم الخطاط)